تاریخِ عالم کی پہلی وحشت ناک، دردناک
خون آشام اور لرزہ خیز جنگ کی عبرت انگیز داستان

جنگِ عظیم اوّل

1914 تا 1918

سید محمد فضل اللہ بخاری

جنگِ عظیم اوّل

1914ء تا 1918ء

تاریخِ عالم کی پہلی وحشت ناک، دردناک
خون آشام اور لرزہ خیز جنگ کی
عبرت انگیز داستان

سیّد محمد فضل اللہ بخاری

دارُالشعور

37- مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور

سلسلہ: تاریخ عالم

- کتاب ⇦ جنگ عظیم اوّل
- مصنف ⇦ سید فضل اللہ بخاری
- اشاعت ⇦ 2010ء
- مطبع ⇦ حاجی حنیف اینڈ سنز، لاہور
- برائے

دارالشعور 37- مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور

- قیمت ⇦ 400 روپے

E-mail: m_d7868@yahoo.com
Ph: 042-37239138,8460196

انتساب

امنِ عالم کے لیے سرگرداں اُن انسانوں کے نام جو شکلِ انسانی کے ساتھ ساتھ انسانیت کے عظیم مرتبہ پر بھی فائز ہیں۔

فہرست

حصہ اوّل

جنگ عظیم اوّل سے قبل شریک ملکوں کے حالات

حصہ دوم

احوالِ جنگ

حصہ سوم

اختتامِ جنگ

حصہ چہارم

اثراتِ جنگ

حصہ پنجم

نئے عالمی اُفق

اظہارِ تشکر

قومی زبان میں جنگِ عظیم اوّل پر کتابی شکل میں کوئی تحریر کم از کم ہماری نظر سے نہیں گزری۔ اِس لیے اِس موضوع پر ایک عرصے سے کسی مستند اور جامع کتاب کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ جنگِ عظیم دوئم کے حالات و واقعات پر لوئیس ایل۔ سنائیڈر کی تصنیف کا ترجمہ پہلے ہی دارالشعور شائع کر چکا ہے۔

قارئین کا مسلسل اصرار تھا کہ جنگِ عظیم اوّل پر بھی اسی نوعیت واہلیت کی کتاب مارکیٹ میں پیش کی جائے۔ اس تشنگی کی تسکین کے لیے دارالشعور کے چیئرمین محترم محمد عباس شاد نے قومی زبان میں ایک جامع اور مستند کتاب نظرِ قارئین کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی طور پر جنگِ عظیم اول پر کسی مناسب انگریزی کتاب کی تلاش کی گئی۔ مگر ایسی کوئی کتاب نہ ملی جو شریکِ جنگ ممالک کی متعصب فکروسوچ سے مبرا اور برصغیر پاک وہند کے قارئین کی دلچسپی اور فکری تناظر کے سانچے کے مطابق ہو۔

لہٰذا محترم عباس شاد صاحب نے اِس کٹھن کام کی ذمہ داری مصنف کو سونپ دی۔ ڈرتے ڈرتے قلم اُٹھایا۔ اپنی علمی کم مائیگی اور طفولیت ہر لحظہ روانیٔ قلم کی راہ میں رکاوٹ بنی رہی۔ مگر عباس شاد صاحب کی مسلسل حوصلہ افزائی سے ہی یہ کام ممکن ہوا۔ اِس لیے میں اُن کا بے حد مشکور ہوں۔ اِس موقعہ پر اگر طاہر مقصود صاحب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو یہ سراسر ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے نہ صرف اِس کتاب کی بنیاد سازی کی بلکہ اِس کتاب میں شامل نقشوں اور تصویروں کی ایڈجسٹمنٹ بھی کی۔

میں اپنی اہلیہ کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے میری شبانہ روز مصروفیات سے سمجھوتہ کیا، میری ہمت افزائی کی اور مجھے ہر ممکن سکون اور سہولت فراہم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ

کیا۔ جس کے باعث ہی میں اِس کٹھن کام کی تکمیل کرنے کے قابل ہو سکا۔

کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب قارئین کے لیے ہر طرح سے ایک مکمل تاریخی دستاویز، حالات وواقعات پر بے لاگ تبصرہ اور فوری حوالے کا کام دے۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے اشاریہ، کتابیات وحوالہ جات کے ساتھ ساتھ نقشوں اور جدولوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ہم لوگ اِس کوشش میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں اِس کا فیصلہ بہر حال قارئین کو ہی کرنا ہے۔ بہتری کی گنجائش ہر کام میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اِس کاوش کو مزید بہتر بنانے کے لیے آپ کی رائے ہمارے لیے گراں قدر سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنف

پیش لفظ

تاریخ عالم کے صفحات ہزار ہا جنگوں کی المناک داستانوں سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کے آغاز میں ایسی عظیم جنگ روبہ عمل آئی کہ روئے زمین پر بربریت وخون آشامی کی الم ناک داستانیں رقم ہوئیں۔ قبل ازیں انسانی ادراک وتخیل اس قدر قتل و غارت گری، خونریزی، بے رحمی اور درندگی سے آشنا نہ تھا۔ چشمِ متحیر نے انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی تباہی کے ایسے مناظر دیکھے جن کے وقوع پذیر ہونے کے بعد انسان درندگی اور شیطانیت کی انتہا پر پہنچ گیا۔ سرمایہ دار دنیا کے علم برداروں کے مکروہ چہرے عیاں ہو گئے۔

ہرس ولالچ، ملک گیری، اقتدار، بالادستی، معاشی دوڑ، تعصبات، فکری تاریکی اور باہمی رقابتوں سے مرصع سفید چمڑی کے خوبصورت لبادے میں ملفوف سیاہ باطن اہلِ یورپ کے اصحابِ دانش وعقل کے پسِ پردہ پیدا کردہ محرکات کے نتیجے میں 1914ء سے 1918ء تک انسانی خون کی ارزانی کا وہ نمونہ پیش کیا گیا کہ جنگلی حیات کی تاریخ میں بھی اِس کی نظیر نہیں ملتی۔

انسانی اقدار پامال کی گئیں۔ درندگی اور شیطانیت نے انسانی شکل کا لبادہ اوڑھ کر بے بس ولاچار انسانیت کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ اِس پر مستزاد یہ کہ انسانی خون سے لتھڑے ہوئے ہتھیار لہراتے ہوئے یہی لوگ عالمی امن وامان کے قیام اور انسانیت کی فلاح کے نعرے لگاتے نہیں جھکتے تھے۔

پوری دنیا میں اپنی سیاسی، معاشی اور نظریاتی چالبازیوں اور منافقت کے ذریعے بساطِ اقتدار پھیلانے والوں کو اپنی طاقت اور قوت پر بہت زعم تھا۔ وہ اپنی بے تحاشا ترقی، صنعتی پیداواری خصائل، دنیا بھر کے معدنی ذخائر اور وسیع وعریض زرعی اراضی کے حصول کے ساتھ ساتھ انسانی بیگار کی ایک بہت بڑی کھیپ پانے کے لیے علاقائی اور سرحدی توسیع کی حرص ولالچ کا شکار ہو چکے تھے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یورپی ممالک انیسویں صدی کے آخر تک اقوامِ عالم پر اپنی فوجی، اقتصادی اور سیاسی بالادستی قائم کر چکے تھے۔ ابتدائی طور پر تجارت کا پُرفریب لبادہ اوڑھ کر افریقہ، ایشیاء، براعظم امریکہ اور آسٹریلیا میں گھسنے والے یورپی ممالک آہستہ آہستہ وہاں کی حکومتوں کے خلاف ساز باز، درباری جوڑ توڑ اور سازشوں کے جال بُن کر انہیں اندر سے کھوکھلا کر دینے کے بعد بچی کھچی قوت کو بزورِ شمشیر ختم کر چکے تھے۔ اور اپنے پنجۂ استعمار تلے روند چکے تھے۔

پھر دوسری طرف نصف سے زیادہ دنیا پر اقتدار قائم ہو جانے کے باعث اکثر ممالک اُن کی غلامی کے طوق گلوں میں پہننے پر مجبور ہو چکے تھے۔ یہ انسانی غلاموں کی کھیپ ان ممالک کے حکام کے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جبراً قربان گاہ میں دھکیل دیے جانے کے لیے بالکل موزوں و مناسب تھی۔

اب ان ممالک کے پاس وافر افرادی قوت، ہرے بھرے کھیت کھلیان، عمدہ باغات، معدنیات اور تیل جیسی بیش بہا نعمتوں کے انبار لگنے لگے تھے۔ حصولِ دولت اور براعظم میں بالادستی کی رسہ کشی کا آغاز انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اہلِ یورپ یہ سمجھ چکے تھے کہ آنے والے دور میں جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو گی وہی انسانوں کی دُنیا پر حکمرانی کرے گا۔ اور ترقی کا زینہ طے کرنے والی قومیں ہی مستحکم و مضبوط ہوں گی۔

اسی بنیاد اور مفروضے پر اُٹھایا جانے والا طوفانِ درندگی ہی زیرِ نظر کتاب کا موضوع ہے۔ جس میں کوشش کی گئی ہے کہ جنگِ عظیم سے قبل شریکِ جنگ ممالک، یورپ اور باقی دنیا کے حالات و معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے جنگ کے اسباب و علل، احوال، نتائج اور اثرات پر سیر حاصل معلومات یکجا کرتے ہوئے موجودہ دور اور حالات کے تناظر میں بے لاگ اور جامع تبصرہ بھی قارئین کے لیے پیش کیا جائے۔ تاکہ کتاب نہ صرف تاریخ کی ایک اہم کڑی کے بیان پر ہی محیط ہو بلکہ یہ مستقبل کے لیے ایک آئینے اور مشعل کا کام بھی دے سکے۔

بیسویں صدی اپنی بساط لپیٹے سینۂ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ اب ہم اکیسویں صدی کا آغاز کر چکے ہیں۔ جنگِ عظیم اوّل کو ایک صدی ہونے کو ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم

اپنے گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی قومی جہات اور رخ کا تعین کریں۔ اور اپنے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالوں کے جواب تلاش کریں کہ:

حالات وواقعات، کس ڈگر پر رواں دواں ہیں؟

کیا آج کا انسان بیسویں صدی کے آغاز کے انسان سے زیادہ محفوظ ہے؟

کیا دنیا ایک بار پھر اسی المناک اور وحشت ناک انجام کی طرف نہیں بڑھ رہی؟

اس طرح کے اور بے شمار خدشات انسانیت کی بقا پر سوالیہ نشان بنے تسلی بخش جواب کے متلاشی ہیں۔

بظاہر میدانِ کارزار تو بدل چکا ہے مگر بربریّت کا وہی پرانا کھیل اپنے جوہر دکھانے کے لیے ایک بار پھر زخمی اور گھائل انسانیت پر ایک اور...... اور شاید آخری، کاری ضرب لگانے کے لیے حالات کا تعین کر رہا ہے۔

مارچ 2008ء　　　　سیّد محمد فضل اللہ بخاری

لاہور

حصہ اوّل

جنگِ عظیم اوّل
سے قبل
شریک ملکوں کے حالات

یورپ 1914ء میں

1
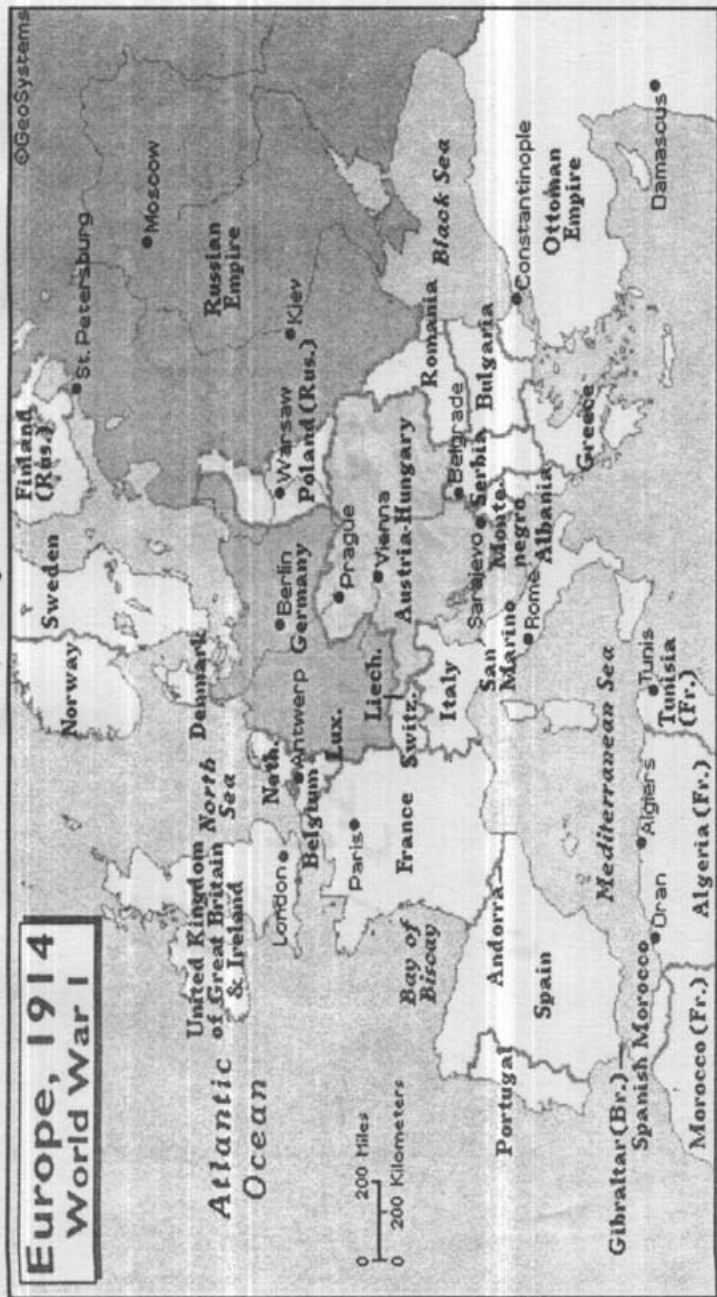
اتحادی ملکوں کا احوال

تاریخِ عالم کا وسیع سینہ یوں تو ہزار ہا جنگوں کی المناک داستانوں سے اٹا پڑا ہے۔ مگر بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ایسی عظیم جنگیں روبہ عمل ٹھہریں کہ روئے زمین پر بربریت وخون آشامی کی الم ناک داستانوں نے جنم لیا۔ قبل ازیں انسانی ادراک اس قدر قتل وغارت گری سے آشنا نہ تھا۔ چشمِ متحیر نے انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کی تباہی کے ایسے مناظر دیکھے جن کے وقوع پذیر ہونے کے بعد انسان درندگی کی معراج پر پہنچ گیا۔ تمدنی دنیا کے علم برداروں کے باطن روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ ہرس ولالچ، ملک گیری، اقتدار، بالادستی، معاشی دوڑ، قومی تعصبات اور باہمی رکابتوں سے مرسع سفید چمڑی میں ملفوف اہلِ یورپ کے اصحابِ دانش وعقل کے پسِ پردہ پیدا کردہ محرکات کے نتیجہ میں 1914ء تا 1918ء تک انسانی خون کی ارزانی کا وہ نمونہ پیش کیا گیا کہ جنگلی حیات کی تاریخ میں بھی اِس کی نظیر نہیں ملتی۔

یورپی ممالک انیسویں صدی کے آخر تک اقوامِ عالم پر اپنی فوجی، اقتصادی اور سیاسی بالادستی قائم کر چکے تھے۔ ابتدائی طور پر تجارت کا حسین لبادہ اوڑھ کر افریقہ، ایشیاء، اور آسٹریلیا میں گھسنے والے یورپی ممالک آہستہ آہستہ وہاں کی حکومتوں کے خلاف سازباز، درباری جوڑ توڑ اور

سازشوں کے جال بُن کر انہیں اندر سے کھوکھلا کردینے کے بعد بچی کھچی قوت کو بزورِ شمشیر ختم کر چکے تھے۔اور اپنے پنجہِ استعمار تلے روند چکے تھے۔ اب ان ممالک کے پاس وافر افرادی قوت، ہر بھرے کھیت کھلیان، عمدہ باغات، معدنیات اور تیل جیسی بیش بہا نعمتوں کے انبار لگنے لگے تھے۔ حصولِ دولت اور براعظم میں بالادستی کی رسہ کشی کا آغاز انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اہلِ یورپ یہ سمجھ چکے تھے کہ آنے والے دور میں جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوگی وہی انسانوں کی دُنیا پر حکمرانی کرے گا۔اور ترقی کا زینہ طے کرنے والی قومیں ہی مستحکم و مضبوط ہوں گی۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ سلسبری نے ''زندہ طاقتوں'' اور ''مردہ طاقتوں'' کے وجود کا اعلان 1898ء میں ہی کر دیا تھا۔

بیسویں صدی کا آغاز عالمی طاقتوں کے توازن میں تبدیلی کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ عالمی طاقتیں کسی کمزور ملک کو اپنے روبرو عظمت و جلال سے کھڑا ہوتا نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ جبکہ انیسویں صدی کے آغاز میں کمزور قوتیں صدی بھر کی کاوشوں کے بعد اب سر اُٹھا کر بڑی طاقتوں کی طرح اقوامِ عالم میں اپنی بالادستی منوانے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ تاریخِ عالم ایک نئے موڑ پر کھڑی تھی جہاں گزشتہ صدی کے طاقتور ممالک یہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے کہ وہ ''زندہ طاقتوں'' میں سے ہیں۔ اس طرح صدی کا آغاز ہی خطرات و خدشات کے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف جرمن اسے ''جرمنی کی صدی'' قرار دے چکے تھے تو دوسری طرف اٹلی اور ترکی کی عظیم الشان سلطنتیں روبہ زوال تھیں۔ برطانیہ نوآبادیاتی نظام اور معیشت میں جہاں دنیا بھر میں سب سے مقدم سمجھا جاتا تھا وہیں براعظم یورپ میں اپنی اقتصادی بالادستی قائم رکھنے میں بُری طرح ناکام ہو چکا تھا۔

فرانس اور روس اپنے پڑوس میں ابھرتی ہوئی قوت جرمنی سے سخت خائف تھے اور بسمارک کی کامیاب سفارت کاری سے زچ ہو چکے تھے۔ برطانیہ یورپ میں اپنا اثر رسوخ گنوانے کے بعد دیگر دنیا میں بہر حال ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا جہاں اُس کی عظیم بحریہ کو جرمنی کی بڑھتی ہوئی عظیم تر بحریہ سے شدید خطرات کا اندیشہ تھا۔

ان حالات میں یورپی ممالک ایک دوسرے کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتے ہوئے سیاسی، اقتصادی اور فوجی پالیسیاں ترتیب دے رہے تھے۔ اور ہر ملک ایک احساسِ عدمِ

تحفظ کا شکار تھا۔ دوسرے ملک کے اقدامات کو شکوک بھری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کا توڑ تلاش کیا جاتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں کسی قسم کوئی بھی چنگاری ایک بہت بڑے الاؤ کو بھڑکانے کا کام کرسکتی تھی۔ اِن حالات کی تفصیل ہم اگلے ابواب میں زیرِ بحث لائیں گے فی الحال ہم جنگِ عظیم اوّل سے قبل شریک ممالک کے جملہ احوال پر ایک نظر ڈالیں گے تاکہ ہم جنگِ عظیم اوّل سے قبل کے حالات سے مکمل طور پر آگاہی حاصل کرسکیں۔

برطانیہ

بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ دنیا کے نقشے پر اس وقت تک کی سب سے بڑی سلطنت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ جس کی وسعت کے اعداد و شمار حیران کُن ہیں۔ یہ سلطنت 1,14,00,000 مربع میل (ایک کروڑ چودہ لاکھ مربع میل) وسیع تھی جس میں 410 ملین لوگ آباد تھے۔ اِس قدر عظیم سلطنت کی بنیادیں استوار کرنے میں گزشتہ ڈیڑھ صدی کی جملہ کوششیں صرف کی گئی تھیں۔ باوجودیکہ برطانیہ کی متعدد جنگیں فرانس و دیگر یورپی ممالک سے ہوتی رہی تھیں مگر انیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک برطانیہ اپنی برتری منوا چکا تھا۔

1750ء سے 1900ء تک برطانوی افواج و بحریہ انڈیا، افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا اور ہانگ کانگ جیسے علاقوں پر بلا شرکتِ غیرے اپنا مکمل تسلط جمائے ہوئے تھیں۔ اِس وسیع و عریض سلطنت کے تمام وسائل برطانوی سامراج کے زیرِ تصرف تھے۔ اور اِس مقام تک پہنچنے کے لیے برطانیہ نے زندہ اور بیدار مغز قوموں کی طرح ہر شعبہ میں مثبت پیش قدمی کی تھی۔ اور پالیسی ساز ادارے دوررس حکمتِ عملی وضع کر رہے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر عالمی قوت بن کر اُبھرنا تھا۔ اور وہ اِس مقصد میں کامیاب رہے تھے۔

اُس کی عظیم الشان بحریہ دو (2) بڑے بڑے بحری بیڑوں پر مشتمل تھی جو نوآبادیوں سے مسلسل افواج و اجناس کی نقل مکانی کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے بحری راستوں پر دسترس رکھتی تھی۔ اِس طرح تمام بحری تجارت پر اس کا کنٹرول تھا۔ یہ کنٹرول برطانیہ کی ضرورت بھی تھا کیوں

کہ اِس عظیم سلطنت کی عظیم تجارت بین البرا عظمی تھی۔ اِس کنٹرول کے قیام و دوام کے لیے ہر سال نئے اور جدید بحری جہاز بحریہ میں شامل کیے جاتے تھے۔

اِس کی سفارت کاری انتہائی دانش مندانہ، دُور رس اور نتیجہ خیز تھی۔ برطانیہ نے اتحادی سفارت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی تھی۔ یورپ کے اکثر ممالک جو نو آبادیاتی توسیع کا عزم رکھتے تھے، اُن کے لیے بھی برطانیہ کی طرف سے خیر سگالی پر مبنی سفارت کاری کی گئی۔ جس کی وجہ سے برطانیہ یورپ کے اکثر ممالک کی نظر میں غیر متنازعہ ملک کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ جن ممالک کو برطانیہ سے شکایت تھی تو وہ بھی اِس کی فوجی، اقتصادی اور سیاسی قوت سے مرعوب ہونے کے باعث کوئی سخت مخالفانہ قدم اُٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

برطانیہ کی مضبوط اقتصادی حالت پوری دنیا کی توجہ کا مرکز تھی۔ برطانیہ دنیا بھر کے لیے ایک عظیم سرمایہ کار، سوداگر، بیمہ کنندہ اور بینکار کی حیثیت سے معتمد ملک تھا۔ عالمی تجارت میں امتیازی حیثیت کی بڑی وجہ اِس کی اقتصادی اصلاحات، پوری دنیا میں قائم بحری اڈے، مواصلات کا اعلیٰ نظام، فولاد سازی اور صنعت کاری تھا۔

اِس مختصر تعارف کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنگِ عظیم اوّل سے قبل جزائرِ برطانیہ کی جملہ صورتِ حال کا جائزہ لیں:۔

سیاسی و معاشرتی حالات

1914ء میں برطانیہ شہنشاہ جارج پنجم کی قیادت میں دستوری شہنشاہیت کے راستے پر رواں دواں تھا۔ اس وقت آٹھ (8) ملین مرد ووٹرز کے ووٹ درج شدہ تھے جو ایوانِ زیریں کے ممبران کا انتخاب کرتے تھے۔ ایوانِ زیریں کے ممبران میں سے اکثریتی پارٹی حکومت تشکیل دیتی تھی۔ جبکہ اِس پر ایوانِ بالا نگرانی کے فرائض انجام دیتا تھا جس کے ارکان معزز شرفاء ہوتے تھے۔ تشکیلِ حکومت میں ایوانِ بالا کے اراکین کے ووٹ کی اس قدر اہمیت نہ تھی کہ وہ تشکیلِ حکومت میں کوئی اہم کردار ادا کرتے۔

برطانیہ میں اس وقت افسر شاہی کا نظام چل رہا تھا۔ 1906ء سے لیبرل (آزاد خیال) پارٹی برسرِ اقتدار تھی جس کے وزیرِ اعظم ہربرٹ ایسکوئتھ، سیکریٹری خارجہ سر ایڈورڈ

گرے اور وزیرِ خزانہ ڈیوڈ لائڈ جارج تھے۔ جبکہ ایوانِ زیریں میں حزبِ مخالف ممبران کی قیادت لیبر (مزدور) پارٹی کے رمسی میکڈونلڈ اور کنزرویٹو (اعتدال پسند) پارٹی کے اینڈریو بونر لاء کر رہے تھے۔ قومی سلامتی کے معاملات ایوانِ زیریں میں بحث وتمحیث کے بعد طے پاتے اور منظوری کے لیے پہلے ایوانِ بالا میں اور آخر میں شہنشاہ کو پیش کیے جاتے تھے۔

برطانیہ کے شہری ایک آزاد اور خود مختار معاشرے میں آسودہ حالی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ سفید فام ہونے کا نسلی تفاخر درجہ اعتدال سے بڑھ رہا تھا۔ جبکہ پوری دنیا کے بہت بڑے علاقے پر فاتح کی حیثیت سے حکومت کے احساس نے قومی نخوت میں بھرپور اضافہ کر دیا تھا۔ عوام کسی طور بھی صفِ اوّل کی عالمی قوت کے منصب سے تنزلی برداشت نہ کرتے تھے۔ اور نہ ہی کسی بھی یورپی ملک کی معاشی وسیاسی بالادستی پسند کرتے تھے۔ وہ گزشتہ صدی سے ایک پختہ کار ریاست میں حکمرانوں کے سے انداز سے رہ رہے تھے اور اِس نظام کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن عالمی منظرنامہ اُن کی توقعات سے کسی قدر مختلف رُخ دکھا رہا تھا۔

اِن سب باتوں کے باوجود مجموعی طور پر برطانوی معاشرہ ترقی یافتہ، فعال، متحرک، جدت پسند اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھا۔ بحری وبری فوجی ملازمت، دیگر سرکاری ملازمتیں، سرمایہ کاری، سوداگری، بینکاری، بیمہ کاری، فولاد سازی اور صنعت وحرفت وغیرہ مرغوب پیشے تھے۔

معاشی واقتصادی حالت

انیسویں صدی کے ربع آخر میں یورپ اور خصوصاً برطانیہ کی معاشی واقتصادی حالت حیران کن حد تک بہترین تھی۔ صنعتی انقلاب نے اہلِ یورپ کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی شاہراہ کی طرف پوری رفتار سے گامزن کر دیا تھا۔ اِس کی سرعت سے ترقی کے سفر کی مثال اِس سے دی جاسکتی ہے کہ 1879ء میں فولاد سازی کا تجربہ کیا گیا تو پانچ سال کے قلیل عرصہ میں فولاد سازی کے 85 کارخانے پیداواری مراحل سے گزر رہے تھے۔ مواصلات کے نظام میں ششدر کر دینے والی تیزی سے مہینوں میں پہنچنے والے پیغامات ٹیلی گرام کے ذریعے اب منٹوں میں پہنچ رہے تھے۔ بین البحرِ اعظمی سفر اب پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اور برق رفتاری سے بذریعہ سٹیمرز طے کیے جانے لگے تھے۔ مصنوعات میں آئے روز جدت واضافہ ہو رہا تھا۔

جدول نمبر 1

1914ء میں برطانیہ کی مجموعی معاشرتی و معاشی صورت حال

کُل آبادی	شہری آبادی	توانائی کا استعمال	صنعت سازی (شرح)	صنعتی صلاحیت	فولاد سازی	عالمی پیداواری تناسب	مجموعی آمدن	فی کس آمدن	کوئلے کی پیداوار
410 ملین	34.6 فیصد	195 ملین میٹرک ٹن	115 فی کس	127.5	7.7 ملین	13.6 فیصد	11 بلین ڈالر	244 ڈالر	292 ملین ٹن

جدول نمبر 2

1914ء میں برطانیہ کی مجموعی فوجی صورتِ حال

باقاعدہ فوج	مہماتی فوج	بحری فوج	نوآبادیاتی دستے	بحری بیڑے	لڑاکا طیارے
2,47,432	1,20,000	2,84,568	4,43,000	2	110

برطانیہ کی تجارت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔اور یہ ملک ہر طرف ایک عظیم سوداگر، صنعت کار اور بینکار ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔1913ء میں برطانوی مجموعی آبادی میں سے 34.6 فیصد آبادی شہری علاقوں میں رہائش پذیر تھی جہاں اُس وقت تک کی تمام جملہ ضروریات وسہولیات مہیا تھیں۔باقی آبادی بھی دیگر دنیا کے اوسط شہروں کی سی سہولیات سے استفادہ کر رہی تھی۔کسی ملک کی صنعتی ترقی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صرف شدہ توانائی کا جائزہ بھی لیا جائے۔توانائی کے موجود ذرائع مثلاً کوئلہ، بھاپ، پانی، پٹرولیم اور قدرتی گیس وغیرہ سے پیدا شدہ بجلی، تکنیکی صلاحیت، توانائی پیدا کرنے کی سکت اور اقتصادی ومعاشی ترقی کی شرح معلوم کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔جنگ سے ایک سال قبل یعنی 1913ء میں برطانیہ میں 195 ملین میٹرک ٹن توانائی استعمال کی جاتی تھی جو اُس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعد سب سے بڑی مقدار تھی۔

خام لوہا اور فولاد کی صنعت فوجی صلاحیت میں اضافے کا سبب ہونے کے باعث بڑی اہمیت رکھتی تھی۔اسی سال برطانیہ میں فولاد سازی کی شرح 7.7 ملین تھی۔دوسری طرف صنعت سازی معاشی ترقی وفوقیت کی ضامن ہوتی ہے۔جس کی فی کس شرح 115 تھی۔جبکہ مجموعی صنعتی صلاحیت بلحاظِ آبادی 127.2 فیصد تھی۔اسی طرح برطانیہ عالمی صنعتی پیداوار کا 13.6 فیصد حصہ فراہم کرنے کا ذمہ دار تھا۔(تفصیل کے لیے دیکھیے جدول نمبر 1)

جنگِ عظیم کے آغاز پر برطانیہ کی مجموعی قومی آمدن 11 بلین ڈالر تھی۔فی کس آمدنی 244 ڈالر تھی۔برطانیہ میں کوئلے کی پیداوار 292 ملین ٹن تھی۔یہ اعداد وشمار دنیا بھر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھے۔

جغرافیائی وفوجی صورتِ حال

جزائر برطانیہ جغرافیائی لحاظ سے برِّ اعظم یورپ کے شمال مغرب میں بحرِ اوقیانوس میں واقع ہونے کے باعث مضبوط دفاعی اہمیت کا حامل ہے اِس کے چاروں طرف سمندر ہے۔1914ء میں جنوب مشرقی طرف بیلجیم قریب ترین ملک، مشرق میں ہالینڈ اور جنوب میں فرانس واقع تھے۔اِس طرح جزائرِ برطانیہ کو کسی طرف سے بھی بری حملے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جبکہ بحری حملے کی روک تھام اور منہ توڑ جواب دینے کے لیے برطانیہ کی عظیم بحریہ بحرِ اوقیانوس کی عظیم قوت تسلیم کی جاتی تھی۔

اگست 1914ء میں برطانیہ کی باقاعدہ بری فوج کی تعداد 2,47,432 تھی جس میں سے 1,20,000 برطانوی مہماتی فوج (British Expeditionary Army) کے جوان برطانیہ میں موجود تھے۔ جبکہ باقی ماندہ فوج برطانوی نوآبادیات ماسوائے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا، کے جملہ انتظام و انصرام کے سلسلہ میں مصروف تھیں۔ بری و بحری فوج مجموعی طور پر 5,32,000 جبکہ نوآبادیاتی دستوں کو ملا کر کل 9,75,000 تھی۔ (جدول نمبر 2 میں تفصیلی اعداد و شمار درج ہیں)۔
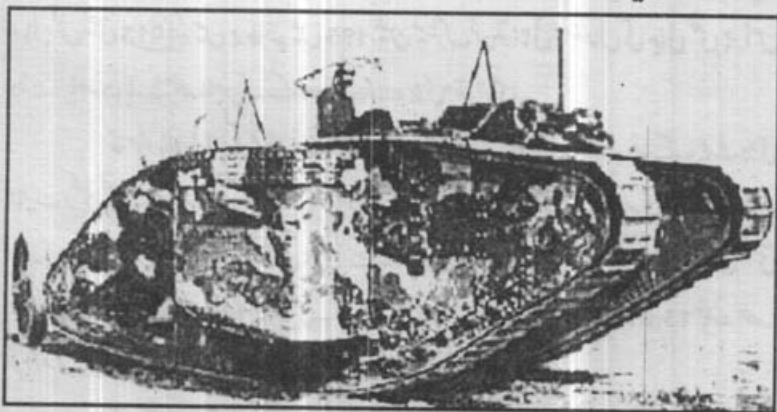
(تصویر برٹش ٹینک مارک 1)

مئی 1912ء میں شاہی ہوائی پلٹن (Royal Flying Corp) کا قیام عمل میں آیا۔ اور 1914ء برطانیہ کی فضائیہ کے پاس 110 طیارے جن میں BE-2، Farman MF-7، Avro504، Vickers FB7، Bristol Scout، F.E.2 شامل ہیں جبکہ 6 ایئر شپ بھی موجود تھے۔

برطانیہ کی عظیم شاہی بحریہ جو قومی دفاع کی درحقیقت ذمہ دار تھی اُس وقت 18 جدید جنگی بحری جہاز (Dreadnoughts)، 29 جنگی بحری جہاز، 10 تیز بحری جنگی جہاز (Battle Cruisers)، 20 ٹاؤن کروزرز، 15 سکاؤٹ کروزرز، 200 ڈیسٹرائرز اور 150 کروزرز پر مشتمل تھی۔
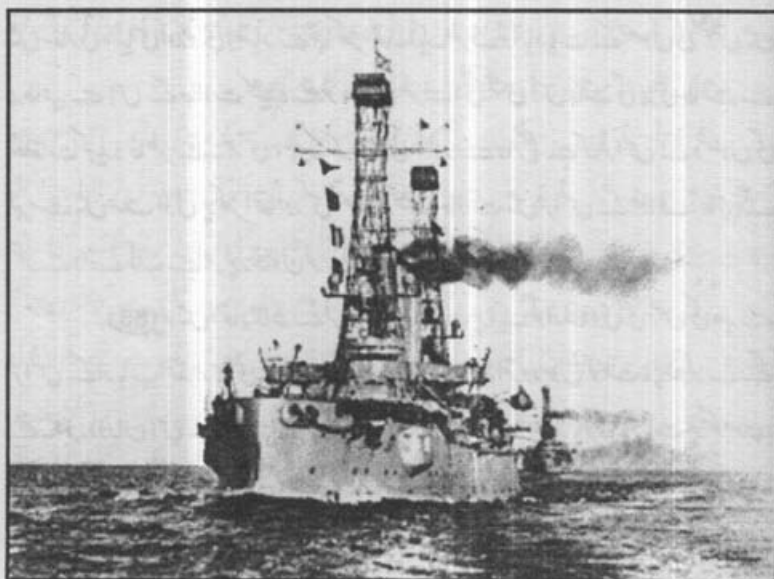
(تصویر Dreadnought)

اِس طرح برطانیہ کو جغرافیائی اور فوجی دونوں اعتبار سے تو فّق حاصل تھا۔ باقاعدہ آرمی اس کی نوآبادیات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ نئے نئے علاقوں کو فتح کرنے اور اپنا کنٹرول قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، عظیم الشان بحریہ اس ملک کی ہر طرف سے حفاظت اور سمندروں میں اثرورسوخ قائم و برقرار رکھنے کے لیے چاک و چوبند تھی اور نئی مگر جاندار اور جدید فضائیہ کسی حملہ آور کے رسد و کمک کے راستوں کو تباہ و برباد کرنے کے ساتھ ساتھ دشمن کی فوج پر اعصاب شکن حملے کرنے عزائم رکھتی تھی۔

فرانس

تیسری جمہوریہ فرانس 1871ء میں پروشیاء سے شکست کے بعد قائم ہوئی۔ آٹو وان بسمارک جو متحدہ جرمنی (پروشیاء و جرمن اتحاد) کا قائد تھا فرانس سے بیشتر علاقے جن میں خصوصاً السا س اور لورین شامل ہیں لے چکا تھا۔ 1880ء کے عشرے میں فرانس یورپی ممالک

میں سفارتی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے تنہا کھڑا تھا۔ ایک طرف نو آبادیات کے حصول کی کشمکش میں برطانیہ سے اِس کے حالات کشیدہ تھے تو دوسری طرف اٹلی جیسی اُس وقت کی بڑی طاقت سے تعلقات کبیدہ خاطر تھے۔ جرمنی، جیسا کہ ابتدائی سطور سے واضح ہے کہ فرانس کے دشمنوں کی فہرست میں صفِ اوّل پر کھڑا تھا اور کسی قسم کے کشیدہ حالات میں فرانس کے خلاف آغازِ جنگ کرنے والے ملک سے بھرپور تعاون کرنے سے دریغ نہیں کرنے والا تھا۔

1881ء میں اتحادِ ثلاثہ نے فرانس کی سالمیت پر ایک تلوار لٹکا دی تھی جس کی وجہ سے فرانس کے اربابِ اقتدار جرمنی کے یورپ میں بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو سخت ناپسند کرنے لگے تھے۔ اسی دوران اِس سے بھی بڑا مسئلہ فرانس کو درپیش تھا اور وہ سمندر پار نو آبادیات پر حکومت و دسترس قائم کرنے اور انہیں برقرار رکھنے سے متعلق تھا۔ 1882ء میں برطانیہ نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ جواباً فرانس نے اگلے سالوں میں اپنی بحری قوت کے اضافہ پر بھرپور توجہ دی اور برطانیہ کے مواصلاتی نظام میں شدید رخنہ اندازی کرتے ہوئے سخت نقصان پہنچائے۔ اسی عشرے میں افریقی نو آبادیات کے جھگڑے اپنے زوروں پر رہے اور فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے حریف بنے رہے۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے میں بھی فرانس کی بھرپور توجہ نو آبادیاتی توسیع پر مرکوز تھی اور اِس مقصد کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ برطانیہ تھا۔ اِس طرح فرانسیسی پالیسی سازوں کی نظر میں سب سے بڑا دشمن ملک برطانیہ ہی تھا۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ فرانس برطانیہ کے بعد یورپ کا سب سے زیادہ سمندر پار کے نو آبادیاتی علاقوں کا مالک تھا۔ ان علاقوں میں اُس نے بحری اڈے قائم کر رکھے تھے اور ایک بڑی فوج بھی تیار کر لی تھی۔ اسی صدی کے اختتام پر کہ جب جرمنی عالمی بحری قوتوں میں چھٹے نمبر سے دوسرے نمبر پر آ گیا تھا اور فرانس کو اپنے اردگرد جرمنی اور اِس کے اتحادیوں کا جال صاف دِکھائی دینے لگا تو حکمتِ عملی مرتب کرنے والے ارباب کو نو آبادیاتی جھگڑے ختم کر کے فرانس کی سالمیت کے لیے ابھرتے ہوئے جرمن خطرے کو محسوس کرتے ہی بنی۔

1880ء کے عشرے کی فرانس کی مشکلات اور 1900ء کے بعد فرانس کی صورتِ حال میں بہت تبدیلی آ چکی تھی۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں فرانس نے جرمنی اور اتحادِ ثلاثہ کے

خطرے کو محسوس کرتے ہوئے برطانیہ اور روس کی طرف تعاون اور یکجہتی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ آخر الذکر دونوں ممالک بھی جرمنی کی ابھرتی ہوئی قوت سے سخت خائف تھے۔

فرانس کے اندرونی معاملات بھی اس کے کھوکھلا ہونے کے عکاس تھے۔ اِس حکومت کی وزاتوں کی مدت قلیل ہوتی تھی۔ اِس طرح تھوڑے عرصہ میں حکومتی وزراء کی ترجیحات اکثر اوقات نئے آنے والوں سے مختلف رہتیں اور اِس طرح پہلی حکمتِ عملی کو چھوڑ کر نئی حکمتِ عملی طے کرنے کے مراحل شروع ہو جاتے۔ نوآبادیاتی جھکاؤ رکھنے والی حکمتِ عملی سے شہنشاہیت کو سہارا مل رہا تھا۔ سول اور فوجی آفیسروں میں شدید اختلافات دیکھنے میں آ رہے تھے۔ فوج کی سیاست میں مداخلت نے فوجی نظام مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اِس پر مزید یہ کہ فرانسیسی حکومت کی بحریہ پر خطیر رقم مختص اور خرچ کرنے کی حد تک تو توجہ تھی مگر کوئی واضح اور مکمل حکمتِ عملی وضع نہ کی گئی تھی۔ اِس طرح فرانس کی بحریہ بھانت بھانت کے غیر معیاری بحری جہازوں کا مجموعہ بنی ہوئی تھی۔

فرانس بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہونے کے باعث اپنی تمام زرعی ضروریات خود پوری کرتا تھا۔ اسی لیے فرانس نے صنعتی انقلاب کا چنداں اثر نہ لیا تھا۔ صنعت و حرفت میں فرانس اپنے مدِ مقابل ممالک سے پیچھے تھا۔ صرف گردشی سرمایہ کی بنیاد پر ملکی اقتصادیات چل رہی تھیں۔ اِس طرح فرانس کی معاشی صورتِ حال بھی دِن بدن ابتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اندرون و بیرونِ یورپ سرمایہ کاری میں اگر فرانس یورپ میں برطانیہ کے بعد دوسرے نمبر پر تھا تو اِس کے منافع کے مصارف اور وصولی کا کوئی بھی ثبوت نہیں ملتا۔ فولاد سازی، کیمیائی صنعت اور کوئلے کی پیداوار انتہائی کم اور ناقص تھی۔ پھر اِن سے تیار شدہ اشیاء کی قیمت بھی نسبتاً زیادہ ہونے کے باعث عالمی منڈی میں کوئی خاص پذیرائی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اِس طرح ان اشیاء کی فروخت کے لیے مقامی منڈی سے ہی رجوع کیا جاتا۔

1890ء سے 1914ء تک فرانس کی افرادی قوت میں بھی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا تھا۔ جہاں جرمنی کی آبادی میں 8 ملین اضافہ ہوا وہاں فرانس کی آبادی صرف ایک (1) ملین ہی بڑھ سکی۔ تاہم فرانس اپنی آبادی کے 80 فیصد تنومند اور نوجوانوں کو جبراً فوج میں بھرتی کر کے ایک مضبوط فوج تیار کر چکا تھا۔

اب ہم 1913-14ء میں فرانس کی حالتِ زار کا جائزہ لیں گے۔

سیاسی و معاشرتی حالات

1914ء میں فرانس میں صدارتی پارلیمانی نظام رائج تھا۔ اِس نظام کے تحت ایک مجلسِ عاملہ کے ممبران چنے جاتے تھے جبکہ ایک سینٹ تھا جس کے ارکان کا چناؤ بالواسطہ طور پر مجلسِ عاملہ کرتی تھی۔ ملک کے صدر ریمونڈ پوئنکیئر تھے جبکہ وزیرِ اعظم کے عہدہ پر رین ویویانی براجمان تھے۔ حکومتی نظام مختلف وزارتوں کے تحت چلتا تھا تاہم فوجی آفیسران بھی حکومت میں اچھی خاصی مداخلت کرتے تھے۔

فرانس کے وزیرِ خارجہ ڈولکاسے نے سفارت کاری کا اعلیٰ مظاہرہ کیا اور 1914ء میں فرانس کی بین الاقوامی پوزیشن بہت بہتر ہوگئی تھی۔ اب فرانس کے روس کے ساتھ تعلقات قیصر کی ترجیحات کے برخلاف بہتر ہو رہے تھے۔ اور برطانیہ کے ساتھ نوآبادیات کا جھگڑا حل ہو چکا تھا۔ فرانس برطانیہ اور روس کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ خطے میں جرمنی کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ دیگر تمام ممالک کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسی طرح کی کاوشوں سے اٹلی اتحادِ ثلاثہ سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس کے خواب فرانس 1871 سے دیکھ رہا تھا کہ روس اور برطانیہ کو جرمنی کے مدِ مقابل کھڑا کر دیا جائے۔

فرانس کی کُل آبادی 39.7 ملین تھی جس میں سے 40 فیصد آبادی کا پیشہ زراعت تھا۔ کھیتی باڑی کا نظام باقاعدہ منظم اور مربوط نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کھیت اور اُن میں مختلف النوع کاشت، پرانے زرعی آلات فرانس کی قومی پیداوار میں متوقع ہدف حاصل کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

فرانس کی آبادی خوبصورت قصبوں میں خوشحالی سے رہائش پذیر تھی۔ سلک اور شراب کی پیداوار پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ فرانس کی معیشت کا اصل دارومدار بیرونِ ملک سرمایہ کاری پر تھا۔ یہی وہ عنصر تھا جس میں فرانس خود کفیل تھا۔ یورپ میں اور بیرونِ یورپ سرمایہ کاری سے دیگر ممالک جیسے اٹلی میں صنعتی ترقی ہو رہی تھی۔ اٹلی کو فرانس کی طرف سے قرضہ جات کی ادائیگی سے سفارتی تعلقات میں بہتری آئی اور اتحادِ ثلاثہ کمزور ہوتا گیا۔

معاشی و اقتصادی حالت

فرانس کی بیرونِ ملک، یورپ اور بیرونِ یورپ سرمایہ کاری ہی بنیادی طور پر فرانس کی اقتصادی اور معاشی ضروریات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ جنگِ عظیم والے سال یہ سرمایہ کاری 9 ملین ڈالر تھی۔ جس کا مقام برطانیہ کے بعد دوسرا تھا۔ فرانس روس کو قرضہ جات کی ادائیگی بھی کر رہا تھا جن کے عوض ریلوے اور دیگر محاصل کے حقوق اسے حاصل تھے۔ چین کو دیے جانے والے قرضے بھی ملکی معیشت کو فائدہ پہنچا رہے تھے۔ مگر اس سرمایہ کاری کے صحیح اعداد و شمار اور حساب فہمی کے مناسب طریقہ کار کی کمی کی وجہ سے یہ اپنی اصل صورت میں ملکی معیشت میں اضافے کی موجب نہ تھی۔

1914ء میں فرانس کی 14.8 فیصد آبادی شہروں میں رہائش پزیر تھی۔ جبکہ مجموعی قومی آمدن 6 بلین ڈالر تھی جو یورپی اعداد و شمار میں پانچویں نمبر پر اور 153 ڈالر فی کس آمدن تھی۔ کوئلے کی پیداوار 40 ملین ٹن تھی۔

فرانس میں توانائی کا استعمال 62.5 ملین میٹرک ٹن تھا۔ صنعت سازی کی فی کس سطح 59 تھی۔ اِس طرح عالمی صنعتی پیداوار میں 6.1 فیصد حصہ فرانس کا تھا۔ فولاد سازی 4.6 ملین تھی۔ 40 فیصد آبادی کا انحصار زراعت پر تھا۔

یہ اعداد و شمار اِس بات کا مظہر ہیں کہ فرانس صنعتی انقلاب سے افادہ حاصل نہیں کر رہا تھا۔ اِس کی صنعتی پیداوار امریکہ، برطانیہ اور جرمنی وغیرہ کی نسبت بہت کم تھی۔ سائنسی اور مشینی آلات کا استعمال بھی نہ ہونے کے باعث زرعی پیداوار ملکی دولت پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ کیمیائی صنعت کے قیام اور افزائش کی نام نہاد کوشش بھی ملکی صنعت میں خاطر خواہ اضافہ نہ کر سکی اور درآمدات کا زور رہا۔ چھوٹے چھوٹے کارخانے اور پرانا اور فرسودہ طریقہ کار صنعتی ترقی میں مانع تھا۔ تاہم موٹر کاروں کی پیداوار میں فرانس مشہور تھا۔ اندرونِ ملک ٹیلیگرام، ڈاک اور بحری سفر کے بہتر نظام وضع تھے۔ آبادی کے لحاظ سے فی کس آمدنی بھی مناسب تھی۔ (تفصیل کے لیے جدول نمبر 3)

جدول نمبر 3

1914ء میں فرانس کی مجموعی معاشرتی و معاشی صورت حال

کُل آبادی	شہری آبادی	توانائی کا استعمال	صنعت سازی (شرح)	فولاد سازی	زراعت پر انحصار	عالمی پیداواری تناسب	مجموعی آمدن	فی کس آمدن	کوئلے کی پیداوار	بیرونِ ملک سرمایہ کاری
39.7 ملین	14.8 فیصد	62.5 ملین میٹرک ٹن	59 فی کس	4.6 ملین ٹن	40% آبادی	6.1 فیصد	6 بلین ڈالر	153 ڈالر	40 ملین ٹن	9 ملین ڈالر

جدول نمبر 4

1914ء میں فرانس کی مجموعی فوجی صورت حال

کُل فوج	بری فوج	بحری فوج	نوآبادیاتی دستے	مزید بھرتی	لڑاکا طیارے
9,10,000	7,77,000	1,33,000	46,000	2.9 ملین	132

جغرافیائی و فوجی صورتِ حال

فرانس جغرافیائی لحاظ سے برِّ اعظم یورپ کے مغرب میں بحرِ اوقیانوس کے کنارے واقع تھا۔ اِس کے جنوب میں سپین (ہسپانیہ) اور بحیرہ روم تھے۔ مشرق میں اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی جبکہ شمال مشرق میں بیلجیم اور شمال میں بحرِ اوقیانوس کی پٹی کے پار جزائرِ برطانیہ واقع تھے۔

جنوری 1914ء میں فرانس کی کُل فوج کی تعداد 9,10,000 تھی جس میں سے 46,000 نوآبادیاتی دستے تھے۔ 7,77,000 بری فوج کے جوان 47 ڈویژنوں میں منقسم 21 علاقائی کور میں منظم تھی۔ اِس فوج کے ہمراہ سوار دستے اور توپ خانہ کے یونٹس بھی تھے۔ اس فوج کی اکثریت فرانس کے اندر مشرقی محاذ پر منصوبہ نمبر 17 کے تحت متعین کی گئی تھی۔ جرمنی کے حملے کے ڈر سے مزید 2.9 ملین افراد کو موسمِ گرما میں متحرک کیا گیا تھا تاکہ بھرپور جواب دیا جاسکے۔ (جدول نمبر 4 میں تفصیلی اعداد و شمار درج ہیں)۔

اکتوبر 1910ء میں فرانسیسی فوج کی ہوائی سروس (French Army Air Service) کا قیام عمل میں آیا۔ فرانس دنیا میں طیارہ سازی کے ابتدائی ڈیزائن کو متعارف کروانے والا ملک ہے۔ جہاں 1912ء کے وسط تک 5 اسکواڈرن ترتیب دیے جا چکے تھے۔ جن کے پاس 1914ء میں 132 طیارے تھے۔

فرانس حکومت نے بحریہ کے اخراجات کی رقم 1910ء تا 1914ء کے دوران دوگنا کردی تھی۔ اُس وقت 19 جنگی بحری جہاز، 115 تارپیڈو، 34 آبدوزیں، 86 ڈیسٹرائرز اور 32 کروزرز تھے۔ 1914ء کی گرمیوں میں حکومت نے 14 مزید جنگی بحری جہازوں کی تیاری کا حکم دیا تھا جو تکمیل کے مراحل تک نہ پہنچ سکے۔

مندرجہ بالا صورتِ حال سے یہ واضح ہے کہ فرانس اُس وقت کی دنیا کی ابھرتی ہوئی طاقت جرمنی اور بڑی طاقت برطانیہ کے مقابلے میں کہیں پیچھے تھا۔ فرانس تنہا جرمنی کا مقابلہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے فرانس، برطانیہ اور روس کو جرمنی کے اُبھرتے ہوئے خطرے سے خبردار کررہا تھا اور مدت سے جرمنی کے مدمقابل برطانیہ اور روس کو کھڑا کرنے کے تانے بانے بُن رہا تھا۔ 1914ء میں فرانسیسیوں کو آٹھ (8) سال قبل ہونے والے دوستی کے معاہدہ۔۔ جس میں

بعد میں روس کی شمولیت سے معاہدہ ثلاثہ کا روپ اختیار کیا۔ سے یہ یقین ہو چکا تھا کہ عنقریب لورین اور السا س کے علاقے ہتھیانے والے دشمن ملک جرمنی کے خلاف برطانیہ اور روس کو جنگ کے میدان میں لے آئے گا۔

امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ انیسویں صدی کے دوران ایک ابھرتی ہوئی طاقت کے طور پر دنیا کے نقشے پر رونق افروز ہو رہا تھا۔ اِس کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں:

وسیع و عریض ملک، بڑھتی ہوئی آبادی، شہری آبادی کا مناسب تناسب، وسط صدی میں مزید یورپی مہاجروں کی آمد اور آباد کاری، صنعتی ترقی، مشینوں کا استعمال، کسی بھی ہمسایہ ملک سے دشمنی کی عدم موجودگی، محفوظ جغرافیائی حیثیت، وسیع تجارت، صنعتی ترقی اور مناسب عسکری و بحری اخراجات جہاں ایک طرف مضبوط معیشت واقتصادی قوت کی تعمیر کر رہے تھے وہیں اندرونی معاملات میں درپیش عمومی مسائل کے حل میں بھی ممد و معاون تھے۔

اگرچہ انیسویں صدی کے چھٹے عشرے میں شروع ہونے والی خانہ جنگی نے ملکی معیشت اور امن وامان کی صورتِ حال کو تار تار کیا مگر یہی جنگیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مخفی قوتوں کو لڑاکا قوم میں تبدیل کرنے کا سبب بنیں۔ اِن جنگوں میں جدید اسلحہ استعمال کیا گیا۔ بحری تاریخ میں پہلی بار آہن پوش جہاز، چکردار بُرج توپ، سرنگیں، تیز رفتار حملہ کرنے والے تجارتی جہاز اور تارپیڈو استعمال کیے گئے۔

شمال (یونین) اور جنوب (متحدہ ریاستوں) کی اِس جنگ نے معاشی برتری، ریل، رسد و ترسیل اور مواصلات کے منظم نظام اور کامیاب سفارت کاری کے ذریعے دورانِ جنگ قرضوں کے حصول کی اہمیت کو دوچند کر دیا۔ اور اسی اصول پر چلتے ہوئے یونین نے اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا۔ یورپی قوتوں نے عموماً اِس جنگ سے علیحدگی کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ اِس طرح فریقین کا تمام تر انحصار ملکی پیداوار، ٹیکسوں کی وصولی، محفوظ سرمایہ، اعلیٰ قائدانہ صلاحیت، آبادی

کے تناسب اور شدید قسم کی جنگی حکمتِ عملی پر تھا۔ اِس جنگ میں یونین کے 3,60,000 افراد جبکہ متحدہ ریاستوں کے 2,58,000 افراد مارے گئے۔

اِن حالات کے باوجود شمالی علاقوں میں معاشی استحکام رہا۔ پیداوار میں دورانِ جنگ اضافہ دیکھا گیا۔ اور ٹیکسوں، قرضوں سے اقتصادی چکر میں کمی نہ آنے دی گئی۔ امریکہ اِس چار (4) سالہ خانہ جنگی سے قبل ہی اقتصادی عفریت کی صورت ابھر رہا تھا۔

انیسویں صدی کے آخری ربع میں امریکہ صنعتی، پیداواری، فوجی اور آبادی کے تناسب سے بڑی قوتوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1892ء میں یورپ کی بڑی طاقتوں نے امریکہ میں متعین اپنے سفارت کاروں کا عہدہ وزیر سے بڑھا کر سفیر کر دیا اور امریکہ کو صفِ اوّل کا ملک تسلیم کر لیا۔ تاہم یہ دور یورپ میں برلن کی مرکزی حیثیت اور بسمارک کی کامیاب سفارت کاری کا تھا۔ تاریخ عالم تیزی سے رخ بدل رہی تھی اور بڑی طاقتوں کے توازن میں تبدیلی رُونما ہو رہی تھی۔ ایک نئے عالمی نظام کی ترتیب و تزئین کا کام پوری تندہی سے جاری و ساری تھا۔ دانشور، سیاست دان، صحافی اور بین الاقوامی تجزیہ نگار عالمی افق کی منظر کشی کرنے میں مصروف تھے۔ اور اِس منظر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اہم ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ اِس پوزیشن میں تھا کہ اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو بھرپور انداز سے بروئے کار لاتے ہوئے ترقی کے مسلسل سفر میں حیرت انگیز طور پر پیش قدمی کر سکے۔ اِس دور میں امریکہ میں مواصلات کا نظام بہترین ہونے کے باعث شہروں اور ریاستوں کے مابین فاصلے بہت حد تک کم ہو چکے تھے۔ 1914ء میں 2,50,000 میل پر محیط ریلوے لائن، ٹیلی گرام کا منظم نظام، ضروری زرعی اجناس کی اندرونِ ملک سے فراہمی، اجناس و اشیاء کی سستے داموں دستیابی اور مشہور کمپنیوں کا قیام اِس بات کے غماز تھے کہ آمدہ دور بلا شبہ امریکیوں کا دور ہوگا۔

یہی وہ اہم تاریخی موڑ تھا کہ جس پر تاریخ کے طالب علم عالمی قیادت کو یورپ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں منتقل ہوتا دیکھ رہے تھے۔ امریکی ترقی کی تیز رفتاری کو دیکھتے ہوئے بڑے بڑے معاشی تجزیہ نگار 1925ء تک پورے یورپ سے زیادہ اقتصادی استحکام و ترقی کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ قدرت بھی امریکیوں پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ اسی دور میں ہونے والی پہلی

جنگِ عظیم نے بھی امریکیوں کی بالادستی کے قیام میں اہم کردار ادا کیا۔ اور 1925ء کا ہدف 1919ء میں ہی پورا ہو گیا۔ یورپ کی حالتِ زار جنگِ عظیم کے بعد انتہائی ناگفتہ بہ ہو چکی تھی اور دنیا چار صدیوں (4) پر محیط یورپ کی عالمی برتری و بالادستی کو سرنگوں ہوتا دیکھ رہی تھی۔

امریکی خارجہ پالیسی اُن دِنوں آزاد تجارت اور سرمایہ دارانہ نظام کی ترویج کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہو چکی تھی۔ اور پوری دنیا میں جہاں اُس وقت شہنشاہی نظام اور بادشاہتیں قائم تھیں امریکہ تنِ تنہا اپنے مسلک پر ڈٹا ہوا تھا اسی پالیسی کی وجہ سے امریکہ نے اپنی سفارت کاری میں نوآبادیاتی معاملات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ماسوائے چین اور فلپائن، دیگر غیر یورپی ممالک کے جملہ امور سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔

ہسپانیہ کے خِلاف جنگ نے بحری فوج کی حمایت کرنے والی قوتوں کو تقویت دی اور جنگی بیڑے کو مزید ترقی دینے کے مراحل طے ہونے لگے۔ 1914ء میں 139 ملین ڈالر کا بجٹ بحریہ کے لیے مختص شدہ تھا اور یہ عظیم الشان بحریہ اس وقت عالمی طور پر تیسرے درجے کی حامل تھی۔ ہسپانیہ کی جنگ نے فوجی ضروریات بھی اُجاگر کر دی تھیں اور مختصر امریکی فوج میں توسیع کا واضح رجحان پیدا کیا۔

اِس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنگِ عظیم کے آغاز پر امریکہ کی صورتِ حال کا سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے مختصر جائزہ لیں۔

سیاسی و معاشرتی حالات

1914ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدارتی پارلیمانی نظام رائج تھا۔ صدر ولسن مسندِ صدارت پر براجمان تھے۔

امریکہ انیسویں صدی کے ربع آخر سے ہی پوری دنیا میں آزادانہ تجارت اور سرمایہ دارانہ نظام کی ترویج کا علم بردار تھا۔ اور اِس مقصد کے حصول کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف تھا۔ بیرونی دنیا کے عمومی معاملات میں امریکہ مداخلت نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی امریکہ کو نوآبادیاتی نظام میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ تاہم اُس وقت کی بڑی طاقتوں کی رسم کے طور پر چین اور فلپائن کی نوآبادیات امریکہ کے لیے بھی پرکشش رہیں۔

امریکی معاشرہ شمال (یونین) اور جنوب (متحدہ ریاستوں) میں بٹا ہوا تھا۔ گوکہ اِن دونوں دھڑوں میں 1861ء تا 1865ء کی خانہ جنگی کے بعد صورتِ حال اتنی مخدوش نہ رہی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھار کوئی چنگاری سلگ اُٹھتی تھی۔

امریکی آبادی 1914ء میں 98 ملین تھی۔ جن میں سے 23.1 فیصد لوگ شہروں، میں رہائش پذیر تھے۔ جہاں زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ دیگر آبادی بھی خوش حالی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ زراعت، صنعتی پیداوار اور مزدوری اہم پیشے تھے۔ امریکہ میں زراعت وسطی یورپ کی طرح اگرچہ منظم نہ تھی مگر پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے دیگر ممالک کی نسبت کہیں بہتر تھی۔

معاشی واقتصادی حالت

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ظہور میں افق عالم پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک مضبوط معاشی، سیاسی اور فوجی مملکت کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ اِس کی صنعتی ترقی، زراعت، کوئلے کی پیداوار، فولاد سازی، نئے نئے مشینی آلات کی تیاری اور خصوصاً تیل کی بہت بڑی پیداوار ملک کے معاشی واقتصادی ترقی کی راہ پر مستقل گامزن ہونے کے عکاس تھے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک وسیع وعریض ملک تھا۔ جسے قدرت نے اُن تمام قدرتی وسائل سے مالا مال کیا تھا جو یورپ میں جملہ ممالک کو جزوی طور پر میسر تھے۔ امریکی آبادی ایک مناسب شرح سے بڑھ رہی تھی۔ اور خطے کے تمام موجود ذرائع بہت مناسب انداز سے زیرِ استعمال لاتے ہوئے مسلسل ترقی و بہتری کا عمل پوری تیز رفتاری سے جاری تھا۔ صنعت وحرفت، جہاز سازی، بڑے بڑے مشینی آلات کی تیاری جدت اور سائنس وٹیکنالوجی کی بھرپور افادیت اہلِ امریکہ کو حاصل ہو چکی تھی۔ امریکہ اُس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ موٹر کاریں بناتا تھا اور ان کا سب سے زیادہ استعمال بھی وہیں تھا۔ 1913ء میں توانائی کے استعمال میں امریکہ دنیا بھر صفِ اوّل پر کھڑا تھا۔ وہاں 541 ملین میٹرک ٹن توانائی استعمال کی جاتی تھی۔

امریکہ کے معدنی ذرائع بھی وافر تھے۔ اُس وقت تک دنیا میں سب سے زیادہ تیل کی پیداوار امریکہ میں ہوتی تھی۔ 1898ء میں پٹرول کی پیداوار 5,50,00,000 بیرل ہو چکی تھی

جبکہ 1865ء یہ صرف 30,00,000 بیرل تھی۔ فولاد سازی 1913ء میں 31.8 ملین ٹن اور کوئلے کی پیداوار 455 ملین ٹن تھی۔ فی کس صنعت سازی 126 تھی جبکہ صنعت سازی کی مجموعی صلاحیت 298.1 تھی۔ اِس طرح امریکہ عالمی صنعتی پیدوار کا 32 فیصد حصہ فراہم کرتا تھا اور یہ تناسب اس وقت سب سے زیادہ تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں جدول نمبر 5)

ملک میں ذرائع مواصلات انتہائی اعلیٰ تھے 1914ء میں ریلوے لائن 2,50,000 میل پھیلی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی کمپنیاں قائم تھیں جن میں انٹرنیشنل ہارویسٹر، ڈیوپونٹ، بیل لیبارٹریز اور سنگر وغیرہ شامل ہیں اِن کمپنیوں کو اندرونِ ملک وسیع منڈی اور مناسب منافع میسر تھا۔ اِس امر کے باوجود امریکہ کی مجموعی آمدنی کا صرف آٹھ (8) فیصد حصہ غیر ملکی تجارت سے حاصل ہوتا تھا۔ جو اِس بات کا غماز ہے کہ امریکی اقتصادی ترقی میں بیرونی تجارت کا کردار کم تھا۔

1914ء میں امریکہ کی مجموعی آمدن حیران کن حد تک بہت زیادہ تھی۔ 37 بلین ڈالر 98 ملین آبادی کی مجموعی آمدن تھی جبکہ دوسرے نمبر پر جرمنی 65 ملین آبادی سے صرف 12 بلین ڈالر آمدن حاصل کرتا تھا۔ اِس طرح امریکہ کی فی کس آمدن 377 ڈالر تھی۔ یہ اعداد و شمار امریکہ کی دیو قامت معاشی و اقتصادی صورتِ حال کے عکاس ہیں۔

جغرافیائی و فوجی صورتِ حال

امریکہ جنگِ عظیم کے میدانِ جنگ سے ہزاروں میل دور ہونے کے باعث جغرافیائی طور پر بالکل محفوظ تھا۔ امریکہ پر حملہ صرف بحریہ کے ذریعے ہی ہو سکتا تھا جبکہ مرکزی قوتوں کی بحری ناکہ بندی سختی سے کی جا چکی تھی۔

1914ء میں امریکہ کی بری و بحری فوج کی تعداد 1,64,000 تھی۔ جبکہ غیر تربیت یافتہ دستے بھی تھے جن کی تعداد 36,000 تھی۔ فوج کی کمی کی وجہ جغرافیائی تحفظ تھا۔ صرف اس قدر فوج ہی بھرتی کی گئی تھی جو خانہ جنگی کے ممکنہ خطرہ سے تحفظ دے سکے۔ چونکہ فوجی اخراجات ملکی معیشت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا امریکہ نے بلا ضرورت ایک بہت بڑی فوج کے اخراجات کرنے کی بجائے ملکی معیشت کے استحکام پر بھرپور توجہ دی تھی۔ (جدول نمبر 6 میں تفصیلی اعداد و شمار درج ہیں)۔

جدول نمبر 5

1914ء میں امریکہ کی مجموعی معاشرتی و معاشی صورت حال

کل آبادی	شہری آبادی	توانائی کا استعمال	صنعت سازی (شرح)	صنعتی صلاحیت	فولاد سازی	عالمی پیداواری تناسب	مجموعی آمدن	فی کس آمدن	کوئلے کی پیداوار
98 ملین	23.1 فیصد	541 ملین میٹرک ٹن	126 فی کس	298.1	31.8 ملین	32 فیصد	37 بلین ڈالر	377 ڈالر	45.5 ملین ٹن

جدول نمبر 6

1914ء میں امریکہ کی مجموعی فوجی صورت حال

کل فوج	رنگروٹ فوج	بحری بجٹ	جنگی جہازوں کا ٹن ماپ	1917ء میں طیارے	1917ء میں فضائی فوج
1,64,000	36,000	139 ملین ڈالر	9,85,000	55	1185

امریکی فضائیہ کا قیام گو کہ 1912ء سے ہی ہو گیا تھا مگر 1917ء میں میکسیکو کے خِلاف جنگ میں امریکی فضائیہ بُری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ جس کے باعث حکامِ بالا میں فضائی اخراجات میں اضافہ کرنے کا احساس بیدار ہو گیا تھا۔ 1917ء میں امریکی آرمی فضائی سروس میں 1185 فضائی فوج تھی جبکہ 55 طیارے تھے۔ کانگریس نے 640 ملین کی خطیر رقم مزید سینکڑوں فرانسیسی اور برطانوی ڈیزائن طیاروں کی تیاری کے لیے مختص کیے۔ یہی وجہ ہے کہ 1918ء میں امریکی فضائیہ محاذِ جنگ میں مرکزی قوتوں کو نقصان پہنچانے میں اہم کردار ادا کر سکی۔

امریکی بحریہ 1914ء میں دنیا کی تیسری بڑی بحریہ تھی۔ اُس وقت اِس پر 139 ملین ڈالر بجٹ مختص کیا گیا تھا جو کہ مجموعی ملکی اخراجات کا 19 فیصد تھا۔ یہ ساری رقم کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تو خرچ نہیں کی جاتی تھی۔ لاطینی امریکہ میں بحریہ کے جہاز "پولیس مین" کا کردار ادا کرتے تھے۔ اندرونِ ملک کئی ایک بحری اڈے تعمیر کیے گئے تھے۔ جبکہ رقم کا ایک کثیر حصہ نہر پانامہ کی تیاری میں بھی صرف ہو رہا تھا تاہم مجموعی طور پر امریکی بحریہ کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔ 1914ء میں امریکی بحری جہازوں کا ٹن ماپ 9,85,000 تھا۔
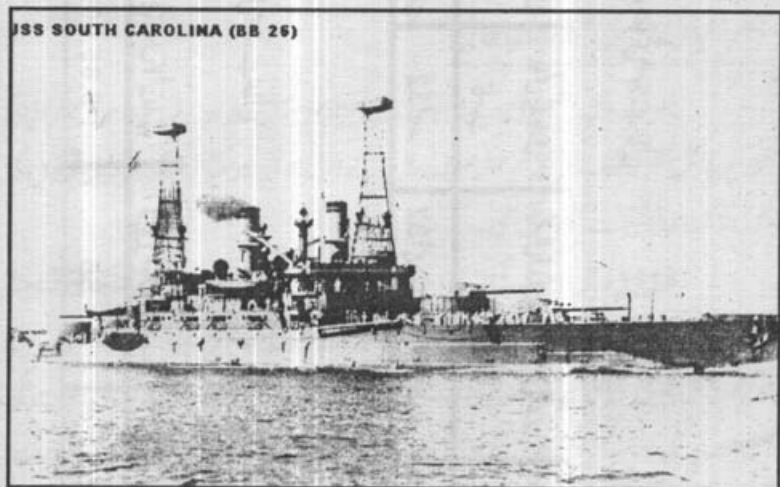
(تصویر USS South Carolina BB26)

روس

بیسویں صدی کے آغاز میں روس عالمی نقشے پر ایک بہتر بڑی سلطنت کے طور پر چھایا ہوا تھا۔ اِس کا طول و عرض، بہت زیادہ آبادی اور ایک بڑی فوج اِس کے بڑی طاقت ہونے کے تاثر کو مزید مستحکم کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ عالمی طاقتوں کے درمیان از خود آموجود ہوا تھا۔

یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بدولت فرانس روس کے سیلِ رواں کے جرمنی کو روند ڈالنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کو قرض پر قرض دیے جا رہا تھا۔ برطانیہ کے ایسے اشراف جو سینٹ پیٹرسبرگ سے ذہنی ہم آہنگی رکھتے تھے حکومت کو یہ باور کروا رہے تھے کہ روس ایک بہت بڑی قوت ہے جس سے دوستانہ تعلقات رکھنا ہی مناسب ہوگے۔

اِس ملک کی صحیح قوت کا اندازہ لگانا اہلِ مغرب کے لیے خاصا مشکل رہا ہے۔ اعداد و شمار اسے بہت بڑی قوت ظاہر کرتے رہے ہیں مگر یہ روسی اعداد و شمار اکثر اوقات میدانِ عمل میں ناکام رہنے کی وجہ سے عالمی مبصرین کی نظر میں مشکوک بن چکے تھے۔ جبکہ روسی افواج 1850ء سے جنگِ عظیم کے آغاز تک مختلف جنگوں میں بری طرح شکست سے دوچار ہو چکی تھیں۔ ملک اندرونی خلفشار کا شکار تھا۔ 175.1 ملین کی آبادی میں سے اکثریت انتہائی پسماندہ زندگی گزار رہے تھے۔ پھر روس سینکڑوں مختلف اقوام اور مقبوضہ ریاستوں و علاقوں پر مشتمل ہونے کے باعث فکری یکجہتی اور قومی جذبۂ حُب الوطنی سے محروم تھا۔

زار نیکولیس دوم روس کا مطلق العنان بادشاہ تھا 1905ء میں جاپان سے شکست کے بعد ملک کے سیاسی حالات بے قابو ہو گئے ایسی صورتِ حال میں زار کو عوامی نمائندگی حاصل کرتے ہی بنی۔ اِس طرح زار کے اختیارات میں کمی آئی اور ابتدائی طور پر روس کے معروف علاقوں کے نمائندوں کو پارلیمانی نظام کے تحت "ریاستی ڈوما" میں منتخب ہو کر اہم فیصلوں میں مشاورت کا موقع مل گیا۔

1860ء کے بعد سے روس میں صنعتی ترقی زوروں پر تھیں۔ تیل کی پیداوار پوری دنیا میں دوسرے نمبر پر تھی۔ بیرونی تجارت میں بھی آئے روز اضافہ ہو رہا تھا۔ اور 1914ء میں روس

چوتھی عالمی صنعتی طاقت بن چکا تھا۔ مگر صنعتی امور زیادہ تر غیر ملکیوں کے ہاتھ تھے۔ اور مقامی آبادی کی اکثریت ناتجربہ کار اور غیر ہنر مند تھی۔ قرضوں پر معاشی بنیاد ڈالی گئی تھی اور بیسویں صدی کے آغاز میں روس دنیا کا سب سے زیادہ غیر ملکی قرض لینے والا ملک بن چکا تھا۔

روس بنیادی طور پر ایک زرعی ملک تھا۔ 80 فیصد آبادی کھیتی باڑی سے گزر بسر کرتی تھی۔ جبکہ بقیہ آبادی کا عمومی رجحان دیہی حیات کی جانب زیادہ تھا۔ دور دراز پسماندہ علاقوں میں زراعت کے لیے پرانے اور فرسودہ طریقے استعمال ہونے کے باعث متوقع نتائج حاصل نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف تو زرعی پیداوار میں 2 فیصد سالانہ اضافہ ہوتا تھا جبکہ دوسری جانب 1.5 فیصد سالانہ آبادی بڑھنے کا تناسب تھا جس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زرعی پیداوار ناکافی تھی۔ ملک کی مجموعی صورتِ حال انتہائی پسماندہ تھی مگر اربابِ اختیار اِسے زبردستی دورِ جدید میں گھسیٹ رہے تھے تاکہ روس کو بڑی طاقت کا نہ صرف درجہ حاصل ہو بلکہ عرصہ دراز تک یہ برقرار بھی رہے جو ایسی مایوس کُن صورت میں ناممکن تھا۔

حکومتی ترجیحات میں طاقت اور غلبہ سب سے اہم تھے۔ اسی لیے 1913ء میں مسلح افواج کے لیے 970 ملین روبیل کا بجٹ مختص کیا گیا جبکہ تعلیم اور صحت کی مد میں صرف 154 ملین روبیل مخصوص تھے۔ ملک کی تقریباً 3 ملین آبادی کا پیشہ مزدوری تھا جبکہ یہ شرح کُل آبادی کا صرف 1.75 فیصد ہے۔ مزدوری کی اجرت اخراجات کی نسبت کم تھی۔ صحت اور تعلیم وغیرہ کی سہولیات کا فقدان تھا۔ گھروں کی حالت ابتر، نکاسی کا کوئی نظام موجود نہ تھا تلخیِ ایام کے باعث نچلے طبقے میں نشے کا استعمال بھی روز بروز بڑھ رہا تھا۔ شرح اموات پورے یورپ سے زیادہ تھی۔ کارخانوں میں بے جا سختی کی جاتی تھی۔

انہیں عوامل نے ملک کی 90 فیصد پسماندہ آبادی کے ذہنوں میں حکومت اور پورے نظام کے خِلاف ناراضگی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا 1912ء سے 1914ء تک ہڑتالوں، عوامی احتجاجوں اور گرفتاری و ہلاکتوں کا گراف حیرت انگیز طور پر بڑھ چکا تھا۔ روس کی ہر حکومت کے لیے کسانوں کا مسئلہ نہایت گھمبیر رہا تھا۔ 1908ء وزیرِ داخلہ استولی ین نے کسانوں کے کمیون توڑنا شروع کیے تو یہ آگ پھر سے پورے زور سے بھڑک اٹھی۔ اِس سرکشی کو دبانے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں بار فوج کو طلب کیا گیا۔ 1913ء سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے کے جرم

میں 1 لاکھ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اِن عوامل نے فوج کو بہت حد تک ناکارہ کر دیا تھا۔ فوج مسلسل اندرونی خلفشار کو دبانے کے لیے استعمال کی جارہی تھی۔

خود زار نکولیس دوم کے دربار میں خوشامدی، متلون مزاج شہزادے، غیر ذمہ دار ڈیوک اور ناپختہ کار جرنیل کثیر تعداد میں تھے۔ جبکہ ذہین اور لائق وزراء کی تعداد کم تھی جو آئے روز مزید کم ہوتی چلی جارہی تھی۔ طبقہِ امرا کو اپنے مفادات عزیز تھے۔ جبکہ زار کو ذہنی سکون اور عیاشی سے غرض تھی۔ اشیاءِ خوردنی پر بھاری ٹیکس عائد تھا جس کے بالواسطہ اثرات سماجی زندگی پر پڑ رہے تھے۔ یہی وہ حالات تے جو شورشوں کو جنم لے رہے تھے۔ ملک فرقہ وارانہ فسادات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ جمہور پسند قوتوں، بالشویک اور انتہا پسند طبقے کو ابھرنے کا موقع مل رہا تھا۔

اِس موقع پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنگِ عظیم اوّل کے آغاز پر روس کی صورتِ حال کا سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے مختصر جائزہ لیں:۔

سیاسی و معاشرتی حالات

جنگ کے آغاز پر روس میں پارلیمانی طرز کی بادشاہت قائم تھی۔ زار نکولیس دوم پورے طمطراق کے ساتھ مسند بادشاہت پر براجمان تھا۔ حکومتی معاملات میں مشاورت کے لیے ریاستی "ڈوم" (پارلیمنٹ) تشکیل دی گئی تھی۔ ملک کی کل آبادی 175.1 ملین تھی۔ جس میں سے 7 فیصد آبادی شہروں میں رہائش پذیر تھی۔ ملک کی 80 فیصد آبادی کا دارومدار زراعت پر تھا۔ ملک میں خواندگی کی شرح 30 فیصد تھی۔ پڑھے لکھے اور ہنر مند افراد کی شدید قلت تھی۔

بنیادی طور پر دیہی معاشرہ تھا۔ لوگوں میں ترقی کا رجحان بھی کم تھا۔ بہت بڑی اکثریت انتہائی کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ فصلوں پر قدرتی آفات کے اثر سے کسانوں میں بھوک افلاس اور فاقہ کشی کی نوبت آجاتی تھی۔ پھر کسانوں کی کل آبادی کے پانچویں حصہ کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔

روس ایک وسیع وعریض رقبہ پر پھیلا ہوا تھا اس ملک میں پولینڈ اور فن لینڈ بھی شامل تھے۔ جبکہ دیگر کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں صوبوں کی شکل میں شامل تھیں جہاں کئی اقوام کے باشندے رہتے تھے۔ اِس طرح روس میں قومی یکجہتی اور مربوط معاشرتی اقدار کی شدت سے کمی

کھلے بندوں ظاہر ہوتی تھی۔ ملکی آبادی کا ایک طبقہ جہاں قدیم بادشاہی نظام کی شدومد سے حمایت کرتا تھا وہیں درمیانے اور نچلے طبقہ کے اکثر لوگ نظام اور حکومت دونوں سے شدید نفرت کرنے لگے تھے۔

مجموعی طور پر ملک جنگ کے آغاز پر خانہ جنگیوں، اندرونی خلفشار، فرقہ واریت اور معاشرتی ناہمواریوں کا بُری طرح شکار تھا۔ ملک کی فوج اِن شورشوں کو دبانے میں مصروف تھی اور اِس طرح ایک طرف تو جملہ ذرائع، قومی آمدن، زرعی و صنعتی پیداوار پر بہت بُرا اثر پڑ رہا تھا جبکہ دوسری طرف فوج کے اندر بھی بددلی اور بے زاری کی کیفیت سر اُٹھا رہی تھی۔

معاشی واقتصادی حالت

بیسویں صدی کے آغاز میں روس کی معاشی واقتصادی حالت گزشتہ صدی کی نسبت بہتر ہو رہی تھی۔ مہیا شدہ اعداد و شمار کے مطابق اِس ملک میں صنعتی ترقی اپنے زوروں پر تھی۔ جنگ کے آغاز پر اِس کی فولادی صنعت فرانس اور آسٹریا۔ ہنگری سے بڑھ چکی تھی۔ سوت سازی بھی مذکورہ دونوں ممالک کی نسبت زائد ہو رہی تھی۔ اور اسی دور میں کیمیائی اور برقی صنعت کا بھی اچھا آغاز ہوا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بعد روس دنیا میں سب سے زیادہ تیل کی پیداوار کرنے والا ملک تھا۔ دوسری طرف توانائی کے دوسرے ذریعے یعنی کوئلے کی پیداوار میں بھی شدت سے اضافہ ہو رہا تھا اور 1914ء میں کوئلے کی پیداوار 36 ملین ٹن تھی۔ روس کی پارچہ بافی کی قدیم صنعت بھی روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔

روس میں تجارت کو مستحکم کرنے کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے۔ ریلوے لائن جو 1900ء میں صرف 31,000 میل بچھائی گئی تھی جو 1914ء میں بڑھ کر 46,000 میل پر محیط ہو گئی تھی۔ منفعت بخش تجارت کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا گیا۔ ریلوے بانڈز کا اجراء کیا گیا۔ اِس طرح غیر ملکیوں نے یہاں خوب سرمایہ کاری کی۔ جس کی بدولت نقد رقم، زروجواہر وغیرہ کی بہتات سے ملک کی معیشت کو جدید خطوط پر استوار کرنے میں مدد ملی۔ نظامِ محصول ترقی کرتا جا رہا تھا اور وڈکا (شراب کا نام) جیسی اشیاء پر ٹیکس ملکی معیشت کو استحکام بخش رہا تھا۔ (دیکھیے جدول نمبر 7)

جدول نمبر 7

1914ء میں روس کی مجموعی معاشرتی ومعاشی صورت حال

کُل آبادی	شہری آبادی	توانائی کا استعمال	صنعت سازی (شرح)	صنعتی صلاحیت	زراعت پر انحصار	عالمی پیداواری تناسب	مجموعی آمدن	فی کس آمدن	کوئلے کی پیداوار	فولادسازی	شرح خواندگی
175.1 ملین	7 فیصد	54 ملین میٹرک ٹن	20 فی کس	76.6	80% آبادی	8.2 فیصد	7 بلین ڈالر	41 ڈالر	36 ملین ٹن	4.8 ملین ٹن	30 فیصد

جدول نمبر 8

1914ء میں روس کی مجموعی فوجی صورت حال

کُل فوج	گھوسوار ڈویژن	گھوڑوں کی تعداد	جنگی جہازوں کا ٹن ماپ	طیارے	ریلوے لائن
59,71,000	50	10,00,000	6,69,000	355	46,000 میل

روس کی 80 فیصد آبادی زراعت پیشہ تھی۔ 1.76 فیصد مزدور تھے۔ 7 فیصد آبادی شہروں میں مقیم تھی۔ 1913ء میں صنعت سازی کی شرح 20 تھی جبکہ مجموعی صنعتی صلاحیت 76.6 تھی۔ روس عالمی صنعتی پیداوار کا 8.2 فیصد حصہ پیدا کرتا تھا۔ وہاں توانائی کے استعمال کی شرح 54 ملین میٹرک ٹن تھی۔ اور لوہے کی پیداوار 8.4 فیصد تھی۔

یہ اعداد و شمار روس جیسی عظیم الشان آبادی رکھنے والے ملک کے لیے یقیناً پریشان کن تھے 175.1 ملین کی آبادی والے ملک کی مجموعی قومی آمدنی صرف 7 بلین ڈالر تھی جبکہ فی کس آمدنی 41 ڈالر تھی جو اُس وقت کے ترقی یافتہ ممالک میں سب سے کم تھی۔ تاہم یہ صورتِ حال 25 برس قبل کی صورتِ حال سے بہت بہتر تھی۔

جغرافیائی و فوجی صورتِ حال

روس کے مغرب میں جرمنی، جنوب مغرب میں آسٹریا۔ ہنگری، جنوب میں رومانیہ، بحیرہ اسود اور ترکی واقع تھے۔ اِس جغرافیائی حیثیت سے روس تین جانب سے اپنے دشمنوں (جرمنی، آسٹریا۔ ہنگری اور ترکی) میں گھرا ہوا تھا۔ پوری انیسویں صدی اور مابعد روسی افواج یورپ بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں تھیں۔ مجموعی طور پر 59,71,000 پر مشتمل فوج بذاتِ خود دیو ہیکل ہونے کی حیثیت رکھتی تھی۔ تاہم ملک میں مواصلات اور آمدورفت کا ناقص نظام کسی قسم کی فوری پیش رفت یا نقل و حمل کی اجازت ہرگز نہیں دیتا تھا۔

روسی گھڑسوار فوج کے 50 ڈویژن تھے جن کے پاس 10,00,000 گھوڑے موجود تھے 1914ء میں دفاعی ضرورتوں کے لیے کثیر رقم خرچ کی جاتی تھی۔ تاہم یہ رقم فوجیوں کے کھانے پینے اور گھوڑوں کے چارے وغیرہ کے بندوبست میں ہی خرچ ہو جاتی تھی۔ زیادہ تر فوج اندرونِ ملک ہونے والی بیشتر خانہ جنگیوں اور شرانگیزیوں کو دبانے میں مصروفِ عمل تھی۔ (جدول 8 میں تفصیلی اعداد و شمار درج ہیں)۔

روسی فضائیہ کا قیام 1912ء میں عمل میں آیا۔ 1914ء میں 375 سے زائد جہاز و طیارے تھے۔ اِس طرح روسی فضائیہ اُس وقت کی سب سے بڑی فضائیہ تھی۔

روسی بحریہ 1914ء میں 4 جنگی بحری جہاز، 10 کروزرز، 21 ڈسٹرائرز، 11 آبدوزوں اور 50 تارپیڈو کشتیوں پر مشتمل تھی۔ روسی جنگی بحری جہازوں کا ٹن ماپ 6,69,000 تھا۔

سربیا

سربیا کی عوام ایک عرصے سے ایک مضبوط اور متحدہ سربیا اور یوگوسلاویہ کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس ملک کے اکثر اوقات پڑوسی ملک بلغاریہ کے ساتھ تنازعات ہوتے رہتے تھے دوسری طرف آسٹریا۔ ہنگری سے بھی تعلقات کشیدہ تھے۔ یہ ملک جغرافیائی لحاظ سے وسطِ یورپ سے جنوبی سمت میں واقع تھا۔ اِس کے شمال میں آسٹریا۔ ہنگری جنوب میں یونان مشرق میں بلغاریہ، شمال مشرق میں رومانیہ اور جنوب مغرب میں مونٹی نیگرو اور البانیہ تھے۔

1903ء میں معزول بادشاہ الیگزینڈر کے بیٹے پیٹر کریڈ جارڈ جیوک نے حکمران شاہی خاندان کا تختہ الٹ دیا۔ یہ ملک دیگر ہمسایہ ممالک سے علاقائی تنازعات میں سخت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ حکومت دیگر ممالک سے مخاصمت کے جذبے سے سرشار تھی اور عوام پر اِس کا خاصا اثر تھا۔ جنگ ہائے بلقان کے نتائج سربیا کے عوام اور حکومت کے لیے قابلِ قبول نہ تھے۔ پہلی جنگِ بلقان 1912ء میں ہوئی جس میں سربیا، بلغاریہ، یونان اور مانٹی نیگرو کا اتحاد تھا مگر جنگ کے بعد میکڈونیا پر بلغاریہ نے قبضہ جمالیا جو سربیا کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔

اسی تناظر میں دوسری جنگِ بلقان 13-1912ء میں لڑی گئی جس میں بلغاریہ سے میکڈونیا چھین کر یونان سربیا اور رومانیہ میں تقسیم کر دیا گیا۔ تاہم اِس تقسیم پر بلغاریہ سخت ناراض رہا۔ جنگِ عظیم اوّل کے آغاز کی وجہ بھی سربیا ہی تھا۔ جہاں آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری بادشاہت کے شہزادے اور ولی عہد آرک ڈیوک فرینز فرڈینینڈ اور اُس کی اہلیہ صوفیہ کو 28 جون 1914ء کو سراجیو کے مقام پر سربیائی قومیت پرست گیوریلو پرنسپ نامی شخص نے جس کا تعلق دہشت گرد تنظیم بلیک ہینڈ (Black Hand) سے تھا قتل کر دیا۔ آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا کو جنگ کا الٹی میٹم دیتے ہوئے اپنی شرائط پیش کیں۔ لیکن چونکہ گیوریلو پرنسپ کا تعلق حکومتی ذرائع سے ثابت ہو چکا تھا، سربیا کی حکومت نے الٹی میٹم کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اِس سلسلہ میں سربیا کو چونکہ روس کی آشیر باد حاصل تھی اور آخر الذکر اوّل الذکر کے آسٹریا۔ ہنگری سے جنگ کی صورت میں مدد دینے کا پابند تھا۔ اِس لیے سربیا نے جنگ کی دھمکی کی کوئی پرواہ نہ کی۔

سربیا کو الٹی میٹم کے ڈیڑھ ماہ بعد آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا پر حملہ کر دیا۔ سربیا کی اپنی فوجی صلاحیت اِس قدر نہ تھی کہ وہ آسٹریا۔ ہنگری جیسے بڑے ملک کی فوج کا مقابلہ کر سکتا۔ سربیا کی فوج کے اعداد و شمار 2,00,000 تھے۔ اِس میں باقاعدہ فوج کے علاوہ محفوظ دستے اور جز وقتی فوج بھی شامل ہے۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر سربیا نے دیگر ممالک سے مدد طلب کی۔ اِن مدد کرنے والے ممالک میں روس، مونٹی نیگرو، برطانیہ اور فرانس شامل تھے۔ اور ایک بھیانک اور لرزہ خیز جنگ کا آغاز ہو گیا۔

رومانیہ

1881ء سے رومانیہ پر شاہ کیرول اوّل حکومت کر رہا تھا۔ حکومت کا نظام ڈپیوٹیز چلاتے تھے جن کا چناؤ بذریعہ رائے دہندگی ہوتا تھا۔ ووٹرز تین اقسام میں تقسیم کیے گئے تھے۔ پہلی قسم کے ووٹر سرمایہ دار اور جاگیر دار لوگ تھے۔ دوسری قسم کے لوگ ٹیکس دہندگان، سرکاری ملازم، ریٹائرڈ ملازم اور تعلیم یافتہ حلقہ پر مشتمل تھے۔ جبکہ تیسری قسم کے رائے دہندگان بقیہ ٹیکس گزار لوگ تھے۔

رومانیہ میں موجود دیگر اقلیتوں کو بھی شہریت کا حق دیا گیا تھا۔ اِن اقلیتوں میں ترک اور تاتار کے علاوہ یہودی بھی شامل تھے۔ اول الذکر دونوں کی آبادی میں ہجرت کی وجہ سے بڑی تعداد میں کمی واقع ہوئی جبکہ یہودیوں نے بھرپور انداز سے اپنا تسلط قائم کر لیا۔

1910ء میں رومانیہ کی آبادی 6.92 ملین تھی۔ بیشتر زمین جاگیرداروں کی ملکیت تھی جو شہروں میں رہائش پذیر تھے اور مختلف یہودی دلالوں کے ذریعے خطیر ٹھیکوں پر زمینیں کسانوں کو دے رکھی تھیں۔ 1913ء میں رومانیہ میں 2.1 ملین میٹرک ٹن گندم کی پیداوار ہوئی۔ جبکہ رومانیہ میں تیل کی پیداوار بھی ہوتی تھی۔ اسی سال رومانیہ میں 1.8 ملین میٹرک ٹن خام تیل کی پیداوار ہوئی۔

رومانیہ میں یہودی اور یونانی اقلیتوں کے ہاتھوں حکومت کے اعلیٰ عہدے ہونے کے باعث عوام الناس میں بے چینی رہتی تھی۔ یہ یہودی اور یونانی عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے

تھے۔ اسی ناانصافی کا نتیجہ تھا کہ 1908ء میں انقلاب برپا ہوا اور رومانیہ جاگیردارانہ نظام سے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف راغب ہوا۔ اقلیتی عوام یہودیوں اور یونانیوں کے اثر ورسوخ کو کم کیا گیا۔ اور ملکی ترقی کی بنیاد ڈالی گئی۔

1883ء میں رومانیہ اتحادِ ثلاثہ (جرمنی، اٹلی اور آسٹریا۔ ہنگری) میں شامل ہو گیا۔ اس طرح علاقائی لحاظ سے یورپ کی سب سے مضبوط قوتوں کے تحفظ نے رومانیہ کو ملکی ترقی کی طرف راغب کیا۔ 1913ء میں رومانیہ نے دوسری جنگِ بلقان میں سربیا، یونان اور مانٹی نیگرو کے ساتھ مل کر بلغاریہ سے جنگ کی اور بلغاریہ کی شکست پر میکڈونیا کی تقسیم سے رومانیہ کو جنوبی ڈوبروجا کے علاقے ملے جس سے علاقائی وسعت کے خواب کو تعبیر ملی۔

1914ء میں رومانیہ کی باقاعدہ، جزوقتی اور محفوظ دستوں پر مشتمل کل فوج 2,90,000 فوجیوں پر مشتمل تھی۔ 1916ء سے 1918ء تک رومانیہ کے علاقے جرمن اور آسٹرو ہنگرین فوجوں کے زیرِ قبضہ رہے۔

بیلجیم

بیلجیم پر 1865ء سے شاہ لیوپولڈ دوم کی حکومت تھی۔ 1893ء میں حقِ رائے دہی کا قانون نافذ کیا گیا تھا جبکہ گزشتہ سال بیلجین لیگ برائے حقوقِ خواتین بنائی گئی۔ حکومت کو ووٹنگ، حقوق اور زبان کے معاملات میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ فلیمش تحریک ابتدائی طور پر صرف زبان کے سلسلہ میں متحرک ہوئی تھی تاہم انیسویں صدی کے اختتام پر معاشرتی مسائل پر بھی سوالات کا آغاز ہو گیا۔ جیولیس میکلوڈ نے تحریک اٹھائی کہ بیلجیم کی صنعتوں میں والونوں کو بہتری نوکریاں دی جاتی ہیں مگر فلیمنگ چھوٹے درجے کی نوکریوں کے لیے بھرتی کیے جاتے ہیں۔

1906ء میں فلیمنگ تحریک کے حامیوں نے ٹیکنیکی تعلیم فلیمش زبان میں دینے کا مطالبہ کیا۔ 1907ء میں بیلجیم کی افریقی نوآبادی وینزویلا کی عوامی بے چینی حد سے بڑھ گئی۔ 1908ء میں کانگو کی عوام سے امتیازی سلوک کے باعث تحریک زور پکڑ گئی اور حکومت کو اپنی پوری مساعی بروئے کار لاتے ہوئے اس مسئلے کا حل نکالنا پڑا۔ 1912ء میں جیولیس ڈیسٹری نے

بادشاہ کے نام کھلا خط وسیع پیمانے پر شائع کیا جس کے باعث والون تحریک کا آغاز ہوا۔1912ء میں بلجیم میں الیکشن ہوئے۔اِن کے ساتھ ہی ملک میں فسادات کا سلسلہ چل نکلا۔ملک کے بیشتر حصوں میں فوجی دستے حالات پر قابو پانے کے لیے روانہ کیے گئے جو خود فسادات کا حصہ بن گئے۔1913ء میں 10,00,000 مزدوروں نے مزدوروں کے حقوق کے لیے احتجاج کیا۔اسی سال جبری بھرتی کا سلسلہ بھی متعارف کروایا گیا۔

جنگِ عظیم اوّل کے آغاز پر ملکی معاشرتی وسیاسی صورتِ حال انتہائی پست اور پسماندہ تھی۔فسادات ہو رہے تھے۔مزدوروں میں شدید بے چینی پائی جاتی تھی۔عوام فلیمنگ اور والون تحریکوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے سے دست وگریبان تھے۔مردوں کی متوقع عمر 49 برس جبکہ خواتین کی 52 برس رہ گئی تھی۔

ایک طرف تو حکومت شدید مسائل سے دوچار تھی مگر معاشرتی بہتری کے لیے امور بھی انجام دیے جا رہے تھے۔1900ء میں ریٹائرمنٹ پر انشورنس کا آغاز ہوا 1903ء میں دورانِ ملازمت حادثہ کی صورت میں رقم انشورنس دینے کا فیصلہ کیا گیا۔1905ء میں زیبروگ کی بندرگاہ مکمل کی گئی۔بلجیم بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مقام کا حامل تھا۔جنگِ عظیم اوّل کے آغاز پر پوری دنیا میں چھٹے نمبر تھا۔اس کا بین الاقوامی تجارت کا حجم روس سے زیادہ تھا۔1912ء میں بلجیم کی مجموعی آمدن 755 ملین بلجین فرینک تھی۔

اس دور میں بلجیم میں بہت سے لوگ عالمی شہرت یافتہ تھے۔بہت سے دانشور، شاعر، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں حیثیت رکھنے والے افراد کثرت سے موجود تھے۔1904ء میں انسٹیٹیوٹ برائے بین الاقوامی قانون غانٹ کو نوبل امن ایوارڈ دیا گیا۔1909ء میں بلجیم کے سابق وزیرِ اعظم اے بیرنارٹ کو اور 1913ء میں ہنری ماری لافونٹین کو نوبل امن ایوارڈ دیا گیا۔بلجیم کے مشہور شاعر موریث میٹرلنک کو 1911ء میں ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔

1839ء میں عالمی قوتوں نے بلجیم کی غیر جانبدارانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کی یقین دہانی کرائی تھی۔اِن قوتوں میں سے پروشیا 1871ء میں جرمنی میں ضم کر دیا گیا۔تاہم بلجیم کی غیر جانب دارانہ پالیسی برقرار رہی۔نومبر 1913ء میں بلجیم نے ایک بار پھر غیر جانب دارانہ حکمتِ عملی کا اعلان کیا۔

بیلجیم انیسویں صدی کے دوسرے ربع سے ہی غیر جانبدار ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ بیشتر عالمی قوتوں نے اس کے غیر جانب دار رہنے پر مدد و اعانت کے معاہدے کر رکھے تھے۔ نومبر 1913ء میں بیلجیم نے ایک بار پھر اپنے غیر جانب دارانہ رویے کا اعلان کیا۔ جرمنی کے 1907ء کے شیلفن پلان کے مطابق جرمنی کو بیلجیم کے راستے فرانس کی قلعہ بندیوں پر حملہ کرنا تھا۔ چنانچہ جرمنی نے 2 اگست 1914ء کو بیلجیم کو الٹی میٹم دیا کہ وہ اُس کی افواج کو گزرنے کے لیے راستہ دے۔ حکومتِ بیلجیم نے راستہ دینے سے انکار کر دیا جس پر 4 اگست کو جرمنی نے بیلجیم اور لیگزم برگ پر حملہ کر دیا۔ ماہِ اگست اور ستمبر میں جرمنی نے تقریباً پورے بیلجیم پر قبضہ کر لیا۔ بیلجیم کی مشہور لڑائیوں میں یپرلیس اور لینگ مارک شامل ہیں۔

یونان

1897ء سے 1914ء تک کی توسیع پسندانہ پالیسی کی وجہ سے یونان سخت مشکلات کا شکار رہا۔ 1897ء میں اسے عثمانی ترکوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی اور اس کے بہت سے علاقے چھن گئے اور بین الاقوامی تحویل میں دے دیے گئے۔ 1908ء میں یونان کے جزیرے کریٹ کے بیشتر علاقے وہاں کے ایک سیاست دان ایلف تھیریوزوینی زی لوس کے زیرِ انتظام کر دیے گئے تاہم یہ علاقے یونان سے ملحقہ ہی رہے۔

1912ء میں اٹلی نے یونان کی افریقی نوآبادیات پر بعد از جنگ قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف 13-1912ء میں پہلی جنگِ بلکان ہوئی جس میں یونان نے بلغاریہ، سربیا اور مونٹی نیگرو کے ساتھ مل کر عثمانی ترکوں سے جنگ کی۔ اِس جنگ میں ترکی سے کچھ علاقے چھین لیے گئے مگر اِن علاقوں پر بلغاریہ نے اپنا تسلط جما لیا۔

بادشاہ جارج اوّل کے اقتدار کو سخت مخالفت کا سامنا تھا۔ ملک میں کریٹی سیاست دان ایلف تھیریوزوینی زی لوس کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ بالآخر 1909ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا

گیا اور ایلف تھیر یوزو ینی زی لوس بطور وزیرِ اعظم مقرر کیے گئے۔ موصوف ''میگالی نظریہ'' -- ایک عظیم یونانی ریاست -- کی بھرپور حمایت کرتے تھے تاہم ابھی بھی بادشاہ کی پشت پناہی سے ایک بڑا سیاسی طبقہ توسیع پسندانہ حکمتِ عملی کی مخالفت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1911ء میں دستور میں کئی بڑی تبدیلیوں کی منظوری دی گئی جو توسیع پسندانہ پالیسی سے مزاحم تھیں۔

13-1912ء کی جنگِ بلقان دوم میں یونان، سربیا اور مونٹی نیگرو مل کر بلغاریہ سے میکڈونیا اور جنگِ بلقان اوّل کے مفتوحہ علاقے چھیننے میں کامیاب ہو گئے اس طرح یونان کے کُل علاقے میں 7 فیصد توسیع ہوئی اور یونان کی آبادی 2.8 ملین سے بڑھ کر 4.8 ملین ہو گئی۔ تاہم اِس 2 ملین کی نئی شامل ہونے والے آبادی میں سے زیادہ آبادی غیر یونانیوں پر مشتمل تھی۔ اِس توسیع نے وزیرِ اعظم کے ہم خیال لوگوں کو تقویت دی اور ملک بھر میں توسیع پسندانہ سوچ کے حامل افراد کا اضافہ ہوا۔ اسی سوچ کے رواج پذیر ہونے پر 1913ء میں بادشاہ جارج اوّل کا سیاسی قتل کر دیا گیا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا کنسٹنٹائن اوّل مسند نشین ہوا۔

1914ء میں یونانی عوام دو متحارب گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جن میں ایک دوسرے کے خِلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ملکی سالمیت خطرے میں تھی اور دوعملی کی کیفیت شروع ہو چکی تھی۔ بادشاہ اور وزیرِ اعظم دو مخالف سمتوں پر گامزن تھے۔ انھی حالات کے تناظر میں 1915ء میں جب ایلف تھیر یوزو ینی زی لوس کو وزیرِ اعظم کے عہدے سے سبکدوش کیا گیا تو اُس نے جزائرِ کریٹ پر اپنی خود ساختہ حکومت قائم کر لی۔ بعد ازاں سیلونیکا پر بھی تسلط جما لیا اور نئے یونان کی بنیاد رکھ دی۔ جبکہ بادشاہ کے زیرِ انتظام علاقہ پُرانا یونان کہلایا جانے لگا۔

یونان کی باقاعدہ حکومت نے جنگ میں غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ 1915ء میں بلغاریہ کے جنگ میں شامل ہونے پر سربیا اور مونٹی نیگرو کا دفاع مشکل ہو گیا۔ اِن ممالک کو دفاع کے لیے جنگی ساز و سامان اور اشیائے خورد و نوش کی ترسیل ضروری تھی۔ اِس سپلائی کے لیے یونان کے علاقے سیلونیکا سے گزرنا پڑتا تھا۔ باقاعدہ حکومت نے اتحادیوں کے متعدد درخواستوں کو اِس لیے رد کر دیا کہ سیلونیکا سے سپلائی کی بحالی سے یونان کی غیر جانبدارانہ پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ دوسری طرف ایلف تھیر یوزو ینی زی لوس نے اِس کی

اجازت دے دی۔ اور سربیا اور مونٹی نیگرو کی سپلائی لائن بحال ہو گئی۔

اِس عظیم خدمت کے عوض میں اتحادی ممالک نے ایلف تھیروز وینی زی لوس کی خود ساختہ حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اور بعد ازاں 1917ء میں اتحادی ممالک کے دباؤ کے باعث بادشاہ کنسٹنٹائن اوّل کو جلاوطن کر دیا گیا اور پورے یونان کی حکومت ایلف تھیریوز وینی زی لوس کے حوالے کر دی گئی۔

مانٹی نیگرو

1878ء میں برلن میں منعقد ہونے والی برلن کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ عثمانی ترکی کے زیرِ انتظام بندرگاہ بار مونٹی نیگرو کے حوالے کر دی جائے گی۔ اِس فیصلہ کے مطابق 1880ء میں مونٹی نیگرو کے ترک مقبوضہ جات واپس کر دیے گئے۔ 1879ء میں ایک دستوری اصلاح کے تحت سینٹ کو ختم کر کے ریاستی کونسل قائم کی گئی اور ملک میں ایک ہائی کورٹ تشکیل دیا گیا۔ 1888ء میں نیا قانون پاس کیا گیا اور بالآخر 1905ء میں پہلا تحریر شدہ دستورِ عمل نافذ کر دیا گیا۔

1910ء میں ملک کو بادشاہت قرار دیا گیا اور اسی کے ساتھ ایک اور اعلان بھی کیا گیا جس کے مطابق اِس بادشاہت کو "زیٹا" کا نام دیا گیا۔ تاہم اِس اعلان کو خاطر خواہ پذیرائی نہ ملی۔ ملک کو جدید خطوط پر استوار کیا گیا پہلے سے موجود ریلوے لائنوں میں اضافہ کیا گیا اور ڈاک کے نظام میں بہتری لائی گئی۔

13-1912ء کی جنگِ بلکان دوم میں مونٹی نیگرو سربیا اور یونان کا اتحادی تھا اور اِن ممالک نے بلغاریہ سے جنگِ بلکان اوّل کے مقبوضہ جات کے حصول کے لیے جنگ کی تھی۔ اِس طرح مونٹی نیگرو سربیا کا اتحادی تھا۔ سربیا نے روس سے دفاعی معاہدہ کر رکھا تھا۔ 14 اکتوبر 1915ء کو بلغاریہ کے جنگِ عظیم اوّل میں کود پڑنے اور بعد ازاں سربیا پر قبضہ کر لینے کے باعث مونٹی نیگرو کو بحیثیت اتحادی ملک سربیا کے حق میں جنگ میں شامل ہونا پڑا۔

اٹلی

انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہی اٹلی عالمی منظرنامے پر ایک متحدہ ریاست کے طور پر ابھر آیا تھا۔ اسی صدی کے گزشتہ تین ربع کی طرح اب یہ چھوٹی چھوٹی جھگڑالو ریاستوں کا مجموعہ نہ تھا۔ 1890ء میں اٹلی 30 ملین اطالوی باشندوں پر مشتمل ایک طاقتور ریاست کے طور پر عالمِ شہود پر جلوہ افروز تھا۔ اِس کی آبادی میں آئے روز تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اطالوی ریاستوں پر سے بیرونی ممالک کے اثرات کا خاتمہ ہو چکا تھا اور مجموعی طور پر جذبہ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا احساس دِن بدن مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ 1914ء میں اٹلی کی آبادی بڑھ کر 35.3 ملین ہو چکی تھی۔ جس میں سے 11.6 فیصد آبادی شہروں میں رہائش پذیر تھی۔

اٹلی کو اصل مقام اتحادِ ثلاثہ (1886ء) کے بعد حاصل ہوا جب اِس کے دو (2) دشمن پڑوسیوں آسٹریا۔ ہنگری اور فرانس میں سے ایک (آسٹریا۔ ہنگری) کے ساتھ سفارتی تعلقات میں بہتری آئی اور احساسِ تحفظ نے اندرونی خلفشار کو کم کرنے اور عوامی یکجہتی کے حصول کو ممکن بنانے میں مدد دی۔ اِس کے دشمنوں میں سے فرانس تنہا رہ جانے کے باعث شدید مشکلات کا شکار تھا۔ جبکہ اٹلی ایک بڑی طاقت تصور کیا جانے لگا۔ دیگر اہم ممالک کی جانب سے یہاں باقاعدہ سفیر تعینات کیے جانے لگے اور روم عالمی طاقتوں میں شامل ہو گیا۔

اٹلی کے عالمی طاقت بن جانے کے باوجود صنعتی ترقی، زراعت، شرح خواندگی اور ذرائع نقل و حمل میں پسماندگی کے باعث اٹلی اقوامِ عالم میں اپنا اصل مقام برقرار نہ رکھ سکا۔ اِس کی شرح خواندگی 37.6 فیصد تھی۔ زراعت کا نظام انتہائی پسماندہ اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے کھیت جہاں مشترکہ طور پر کھیتی باڑی کا نظام رائج تھا ملکی زرعی پیداوار میں خاطر خواہ اضافے کے ہدف کو پورا کرنے میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔

تاہم یہ مقام اُس وقت مشکوک ہو گیا جب اٹلی میدانِ کارزار میں 1896ء میں ایک افریقی بے سروسامان قوم سے شدید شکست و تباہی کا شکار ہو گیا۔ پھر اٹلی کے اعلیٰ حکام کی سیاسی و عالمی بصیرت بھی ملکی وقار کو پستی کی طرف راغب کر رہی تھی 1911-12ء میں لیبیا کے ساتھ اعلانِ

جنگ کر دیا۔ اِس طرح اٹلی کمزور سے کمزور ترین ہوتا چلا گیا۔ عالمی طور پر اس کی صنعتی شراکت پہلے سے مزید کم ہو گئی۔ اقتصادی اور سماجی حالات نے اٹلی کو بڑی طاقتوں کی صف سے کھینچ باہر کیا تھا اب اس ملک سے اِس کے پڑوسی ملکوں کو کوئی خدشہ نہ تھا۔ اٹلی 1914ء میں 1871ء کے اٹلی کی سی حالتِ زار کو پہنچ چکا تھا۔ اِس کی بحریہ کمزور اور جدید بحری آلات و اسلحہ سے محروم ہونے کے باعث اپنی حیثیت کھو چکی تھی۔

پورے یورپ میں سب سے زیادہ ان پڑھ آبادی اٹلی میں تھی۔ 1913ء میں اٹلی میں توانائی کا استعمال صرف 11 ملین میٹرک ٹن تھا جو عالمی طاقتوں میں شمار ہونے والے ممالک میں سب سے کم تر تھا۔ وہاں فی کس صنعت سازی 26 تھی۔ جبکہ مجموعی صنعتی صلاحیت 22.5 تھی۔ عالمی صنعتی پیداوار میں کُل حصہ 2.4 فیصد رہ گیا تھا۔ لوہے اور فولاد سازی کی پیداوار 0.93 ملین رہ گئی تھی۔

اٹلی کو 88 فیصد ایندھن کے لیے کوئلہ برطانیہ سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ کوئلے کی درآمد کے باعث مجموعی آمدن اور اخراجات کا توازن بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ فوجی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے رقم کی دستیابی ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اکثر اوقات بڑھتی ہوئی آبادی ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے مگر اٹلی میں معاملہ اِس کے برعکس تھا۔ پسماندہ نظامِ زراعت، عدم صنعت و حرفت، ذرائع ابلاغ و نقل و حمل کی کم یابی اور تعلیمی میدان میں درماندگی کے باعث اٹلی کی آئے روز بڑھتی ہوئی آبادی بجائے خود ایک زحمت بن رہی تھی۔

1914ء میں اٹلی کی بری اور بحری فوج مجموعی طور پر 3,45,000 تھی۔ جنگی جہازوں کا ٹن ماپ، 4,98,000 تھا۔ یہ بری و بحری فوج بھی بدحالی کا شکار تھی۔ یہ امریکہ اور جاپان سے زائد ہونے کے باوجود تکنیکی اور فنی اعتبار سے ایک ناکام فوج تھی۔ جس کے پاس نہ اعلیٰ ہتھیار تھے اور نہ ہی جنگ کے لیے درکار جذبہ رہ گیا تھا۔ فوج میں بھرتی کا طریقہ کار انتہائی مشکل اور کٹھن تھا۔ پھر جنوبی اٹلی اور کیتھولک چرچ کے درمیان کش مکش نے اس علاقے کے لوگوں کو سرکاری بھرتی اور ملکی ترقی سے بدظن کر رکھا تھا۔ مجموعی طور پر وہاں گروہی اور علاقائی رجحانات کارفرما تھے اور مجموعی قومی جذبے کا فقدان تھا۔

اِس قدر فوجی اعداد و شمار بادی النظر میں مناسب معلوم ہوتے ہیں مگر جنگ صرف فوجی

عددی قوت کے بل بوتے پر نہیں لڑی جاتی۔ اِس کے لیے قومی جذبہ، مضبوط معیشت، مستحکم سیاسی و معاشرتی اساس، جدید بری، بحری اور فضائی جنگی ضروریات اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ عالمی منظر نامے میں اعلیٰ سفارتی تعلقات کا ہونا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ مگر اٹلی اِن صفات سے محروم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اٹلی نے پہلے پہل جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

جاپان

جاپان اپنے جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ اور بالکل ہی لاتعلق رہتے ہوئے اپنی زبان کی پیچیدگی کی طرح عالمی امور میں پیچیدہ ملک کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اِس سرزمین میں قدرتی وسائل کی کمی، پہاڑی جغرافیائی نوعیت اور زلزلے اقتصادی ترقی کی راہ میں سدِ سکندری کی حیثیت رکھتے تھے۔ 20 فیصد زمینی حصہ کاشتکاری کے قابل تھا جہاں فرسودہ نظامِ زراعت سے کسی قدر زرعی پیداوار حاصل ہوتی تھی۔ جاپان کا کوئی قریبی دوست ملک نہ تھا۔ اِس قوم میں خود پسندی اور اعلیٰ ہونے کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اِس احساس کے آثار آج بھی بہت حد تک باقی ہیں۔ جاپانی عوام اپنی خودی کے خود ساختہ خول میں محدود ہو کر رہ چکے تھے اور کسی قسم کی کوئی بیرونی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔

یہ صورتِ حال انیسویں صدی کے ربع آخر تک برقرار رہی۔ اور جاپان سیاسی لحاظ سے ناپختہ، فوجی لحاظ سے ضعیف اور اقتصادی لحاظ سے کمزور ترین ملک تھا۔ یہ موازنہ یورپی ممالک کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر مشرقِ بعید میں بہر حال جاپان اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ 1868ء کی تحریکِ تجدید سے میجی نے جاپانی عوام کو مغرب کے زیرِ تسلط نہ آنے کی فکر دی۔ اسی فکر نے جدید کاری، صنعتی ترقی اور خود کفالت کی طرف بھرپور توجہ دلائی۔ جاگیردارانہ نظام میں بھی بہتری لائی گئی۔ تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی جس کے نتیجے میں شرح خواندگی تیزی سے بڑھی۔ قانون میں اصلاح کی گئی، بینکاری کا جدید نظام اپنایا گیا۔ بری اور بحری افواج کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کی گئی اور برطانوی بحری بیڑے کی طرز پر بیڑے کی تعمیر کی گئی۔

یہی وہ دور تھا جب جاپان میں بیک وقت اقتصادی ترقی اور بری و بحری طاقت میں

اضافہ ہو رہا تھا اور یہ سب عوامل اُس قومی نعرے کا نتیجہ تھے جو جاپانیوں کو سیاسی طور پر مستحکم کرنے کے لیے لگایا گیا تھا اور اس کے الفاظ تھے "ایک امیر ملک۔ طاقت ور فوج"۔

جاپان کی جغرافیائی حیثیت بھی اِس کی ترقی کی راہ میں اہمیت رکھتی ہے۔ جاپانی جزیرے چاروں طرف سے سمندر میں گھرے ہونے کے باعث ساری دنیا سے الگ تھلگ تھے۔ قرب و جوار میں کوئی دشمن نہ تھا۔ اور اگر کوئی دشمن تھا تو اُس کے لیے ایک طاقت ور بحری قوت ہونا بہت ضروری تھا۔ جاپان کی آبادی تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ زراعت کے نظام میں بھی بہتری لائی گئی مگر زراعت اور ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ لوگوں کا تناسب ہنوز 1890ء جیسا ہی رہا۔ صنعتی ترقی پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ جدید ایندھن کے وسائل بھی وافر تھے اور عالمی پیداوار میں تناسب بھی مناسب تھا۔ مگر ابھی ترقی کے سفر کے بہت سے اسرار و رموز باقی تھے۔ جاپان کی فولاد سازی کی صنعت برائے نام تھی۔ سرمائے کی کمی اور قرضوں پر قرضے ملکی معیشت کے استحکام میں رکاوٹ پیدا کر رہے تھے۔ اسی لیے جاپان کے پاس مسلح افواج کی جدید ضروریات، زیادہ سے زیادہ صنعتی ترقی اور تعمیر و ترقی کے لیے وافر سرمائے کی کمی تھی اور ملک ترقی کی راہ میں متوقع سبک رفتاری سے گامزن نہ تھا۔

جاپان کی جغرافیائی اہمیت کے علاوہ جاپانیوں کا حوصلہ اور عزم وہ اہم عامل رہے ہیں جن کی بدولت جاپان نے حیرت انگیز طور پر ایک عام ملک سے سبک رفتاری سے ترقی کرتے ہوئے عالمی قوتوں میں شمار ہونا شروع کر دیا۔ اپنی تہذیب کے بہترین ہونے کا احساس فوج اور ملک سے بے پناہ محبت، شہنشاہ کا تقدس اور سب سے بڑھ کر نظم و ضبط کی پابندی ایسے اوصاف ہیں جن کی بدولت ناقابلِ شکست قوم کا وجود ممکن ہوا جو ہر قسم کے خطرے اور مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کے موجب بنے۔

1903-5ء تک جاری رہنے والی جاپانیوں کی روسیوں سے جنگ نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ روس جو بظاہر وسیع و عریض رقبہ پر محیط، دنیا کی سب سے بڑی آبادی اور سب سے بڑی فوج والا ملک تھا، کوریا اور منچوریا سے متعلقہ مفادات کے اختلاف پر جاپان سے مزاحم ہوا اور 1904ء میں ایڈمرل ٹوگو کے ہاتھوں تاشوہیما کے مقام پر روسی بحریہ کو تباہی سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر آرتھر کی بندرگاہ پر جاپان کے اچانک حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جاپانی ہر

صورت میں فتح کے خواہش مند تھے۔اور ہر قیمت پر کامیاب ہونا چاہتے تھے۔جاپانی افسروں اور جوانوں نے بہادری اور شجاعت کے بے مثال کارنامے انجام دیے۔روس کے سرنگوں سے اٹے میدانوں، مشین گنوں کی آگ برساتی گولیوں اور برقی تاروں سے گزر کر روسی خندقوں پر جاپانیوں نے قبضہ کرلیا۔

اِس صورتِ حال نے جنگی مبصرین کو ایک بار پھر جنگی لوازمات اور ضرورریات کی قطع و برید اور نئے سرے سے تدوین کرنے کی دعوت دی۔دنیا کو احساس ہوا کہ جنگ صرف معاشی استحکام، فوجی قوت، جدید اسلحہ اور سیاسی وجغرافیائی حقائق کے بل بوتے پر نہیں لڑی جاتی۔بلکہ جذبہ، اطاعت، نظم وضبط، عزم اور فتح کے حصول کا یقین سب سے اہم ہیں۔

1913ء میں جاپان کی کُل آبادی 51.3 ملین تھی۔جس میں سے 12.8 فیصد آبادی شہروں میں مقیم تھی۔اسی سال توانائی کا استعمال 23 ملین میٹرک ٹن ہورہا تھا۔صنعت سازی کی فی کس شرح 20 تھی جبکہ مجموعی صنعتی صلاحیت 25.1 تھی۔جاپان میں لوہے اور فولاد سازی کی شرح 0.25 ملین تھی۔1914ء میں جاپان کی مجموعی قومی آمدن 2 بلین ڈالر تھی جبکہ فی کس آمدنی 36 ڈالر تھی۔

پُرتگال

1889ء میں شاہ لوئس اوّل کی وفات پر اُس کا بیٹا شاہ کارلوس اوّل تخت نشین ہوا۔پرتگال میں سپین کی طرح عرصہ دراز سے دور پبلیکن پارٹیاں ہی حکومت تشکیل دیتی تھیں۔1906ء میں شاہ کارلوس اوّل نے خلافِ روایت جاؤ فرانکو کو وزیرِاعظم مقرر کردیا جو رپبلیکن کے خِلاف تھا۔1908ء کے آغاز میں رپبلیکن پارٹی کی ناکامی کے لیے تحریک چلائی گئی۔جس کے ساتھ ہی 2 فروری 1908ء کو شاہ کارلوس کا سیاسی قتل کردیا گیا۔

1908ء میں حکومت کا تختہ الٹ کر شاہ مینوئل دوم تخت نشین ہوا۔کچھ عرصہ تک بادشاہت پسند اور رپبلیکن پارٹیوں میں سخت اختلاف رہا۔1910ء میں ایک فوجی انقلاب برپا ہوا جس کے تحت رپبلیکن پارٹی کی حکومت آگئی اور بالآخر شاہ مینوئل دوم کو جلا وطن کردیا

گیا۔ 1911ء میں دستور پاس کیا گیا جس کے تحت چرچ اور حکومتی اداروں کو علیحدہ کرتے ہوئے پوپ کے اختیارات بہت کم کر دیے گئے۔

پرتگال کے برطانیہ سے دیرینہ دوستانہ تعلقات تھے۔ 1890ء میں برطانیہ اور پرتگال کے مفادات متصادم ہونے پر پرتگال نے اپنے مفادات دوستی کے لیے قربان کر دیے تھے۔ تاہم جنگِ عظیم اوّل میں پرتگال اتحادی ممالک کی صف میں باقاعدہ طور پر کھڑا نہیں ہوا۔ بلکہ شروع میں اس کی حکمتِ عملی غیر جانب دارانہ رہی۔

پرتگال کی تجارت افریقی ممالک سے ہونے کے باعث اِس کی معیشت منڈیوں سے کاروبار پر منحصر تھی۔ دوسری طرف جنگ کے دوران جرمنی اپنی یو بوٹس کی مدد سے برطانوی بحریہ کی ناکہ بندی کر رہا تھا۔ اِس صورتِ حال سے پرتگال کو تجارتی نقل و حرکت میں نقصان ہوا۔ علاوہ ازیں جنوبی انگولا میں جرمن دستوں اور پرتگالی دستوں کے مابین جھڑپیں بھی ہوئیں۔ مگر دونوں حکومتیں پرتگال کے غیر جانبدار رہنے پر آمادہ رہیں۔

برطانیہ نے پرتگال سے مطالبہ کیا کہ اُس کی افریقی نوآبادیات کی بندرگاہوں پر آنے والے جرمن بحری جہازوں کو ضبط کر کے برطانیہ کے ہاتھوں فروخت کر دے۔ پرتگال نے 24 فروری 1916ء کو اِس ہدایت پر عمل درآمد کیا۔ جس پر جرمنی نے 8 مارچ 1916ء کو پرتگال کے ساتھ اعلانِ جنگ کر دیا۔

1916ء میں پرتگال نے جنوبی افریقہ سے جرمنی کے مشرقی افریقہ پر حملہ کر دیا۔ پاوّل وان لیٹوور بیک نے گوریلا جنگ کرتے ہوئے کامیابی سے نہ صرف دفاع کیا بلکہ پرتگالی افواج کو افریقہ میں مصروف رکھا اور یورپ میں جاری جنگ میں شریک نہ ہونے دیا۔ گوریلا جنگ کے ذریعے وربیک پرتگال کے افریقی علاقوں میں گھس گیا اور جنگ کے اختتام تک اُن علاقوں پر قابض رہا۔

دوسری طرف پرتگال کو یورپ میں بھاری فوجی جانی نقصانات اُٹھانا پڑے۔ خندقوں کی جنگ میں اِس کے 10,000 فوجی مارے گئے۔ جبکہ 60,000 فوجی 1918ء میں انفلوئنزا کی وبا پھوٹ پڑنے سے ہلاک ہو گئے۔ دورانِ جنگ پرتگال کی حکومتیں بار بار تبدیل ہوتی رہیں۔ ملک مکمل طور پر سیاسی عدمِ استحکام کا شکار رہا۔ 1918ء میں جرمنی نے پرتگالی فوج کی صفِ اوّل کو توڑ کر رکھ دیا۔ جبکہ اسی سال دسمبر میں وزیرِ اعظم سیڈونیا پائس کو قتل کر دیا گیا۔

تلخیص

بیسویں صدی کے آغاز میں اقوامِ عالم پر یورپ کی گزشتہ چار (4) صدیوں سے قائم بالادستی اپنے آخری مراحل میں تھی۔ برطانیہ اپنی نوآبادیاتی وسعت کے باوجود آہستہ آہستہ قوموں کی امامت کے منصب سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ ابھی بھی اس میں اتنا دم خم تھا کہ وہ صفحۂ ہستی میں کسی قدر ہل چل پیدا کر دے مگر اب پہلے سے وہ شان و شوکت اور دبدبہ نہ رہا تھا۔ یورپ میں برطانیہ کی بالادستی ختم ہو چکی تھی اور گزشتہ ربع صدی سے برلن میں یورپ اور کم و بیش دیگر دنیا کے فیصلے کیے جا رہے تھے۔ تاہم شاہی بحریہ کا جاہ و جلال اب بھی قائم و دائم تھا۔ عالمی تجارت اب بھی زوروں پر تھی۔

دوسری طرف روس اپنے طول و عرض کے برعکس قوت، معیشت و معاشرت میں انتہائی پسماندہ و درماندہ ملک کی حیثیت سے نظر آ رہا تھا۔ زراعت، نقل و حمل، صنعت و حرفت، جدید کاری اور فولاد سازی کے ناقص نظام و صورتِ حال کے باعث ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی بجائے افادیت کے زحمت بن رہی تھی۔ ملک میں جاری ملی و لسانی فسادات معاشی استحکام کی راہ میں شدید رکاوٹ تھے۔ اُدھر فرانس کی معاشی معاشرتی اور سیاسی حالت ابتری کا شکار تھی۔ سربیا اپنے ہمسایہ ممالک سے الجھا ہوا تھا اور ملک میں سیاسی عدمِ استحکام جھلکتا تھا۔ رومانیہ بیرونی تحفظ کے زیرِ اثر ترقی کی راہ پر گامزن تھا تاہم جمہور عوام یہودی اقلیتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

بیلجیم گزشتہ ایک صدی سے غیر جانبدارانہ حکمتِ عملی پر سختی سے کاربند تھا۔ ملک میں سیاسی بے چینی اور فسادات کا سلسلہ چل رہا تھا لسانی و نسلی فسادات اور سیاسی شورشیں اپنے عروج پر تھیں۔ تاہم معاشی طور پر ملک ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ یونان میں گروہی اختلافات بیرونی اثر و رسوخ اور انتشار کی شدید کیفیت تھی۔ ملک دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ مانٹی نیگرو بھی اپنے مختصر وجود اور غیر اہم جغرافیائی حقیقت کے باعث اپنے اردگرد موجود ہمسایوں میں سے زور آور اور طاقت ور ہمسایوں کے زیرِ اثر تھا۔ اٹلی اُس وقت تک یورپ کی بڑی طاقتوں میں سب سے غیر خواندہ اور پسماندہ ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاہم اتحادِ ثلاثہ (1882ء) نے اٹلی کے احوال میں

بہتری کی طرف پیش قدمی کے مواقع پیدا کیے۔

جاپان ابھرتی ہوئی عالمی قوتوں میں نیا نیا شامل ہوا تھا۔ اس کا منفرد جغرافیہ، اور ملک میں ترقی اور صنعت سازی کے مثبت اقدامات اسے عالمی قوتوں کے کلب میں شامل ہونے کے موجب بنے تھے۔ پرتگال بھی سیاسی طور پر بادشاہت اور جمہوریت پسند عناصر کی باہمی کشاکش کے باعث کمزور حیثیت کا حامل تھا۔ طویل عرصے سے جاری سیاسی پارٹیوں کی بادشاہت پسندوں سے کشمکش کے باعث بالآخر 1910ء میں فوجی انقلاب کے تحت جمہوری نظام نافذ کر دیا گیا۔

اتحادی ممالک میں سب سے اہم اور عالمی قوتوں میں امامت کے منصب پر فائز ہونے کے لیے سب سے اہل ملک امریکہ تھا۔ امریکہ جغرافیائی طور پر سب سے الگ تھلگ ہونے کے باعث آئے روز کے ہمسایہ ممالک کی شورشوں سے محفوظ تھا۔ معدنی لحاظ سے ہر طرح کے قدرتی وسائل سے مالا مال تھا۔ پھر وہاں ہجرت کر کے آنے والے یورپی مہاجر اپنے اپنے علاقوں سے اچھا خاصا سرمایہ لے کر وہاں گئے تھے اس طرح سرمایہ کی منتقلی بھی اِس ملک میں ترقی کے سفر کو شروع ہی سے تیز کرنے میں ممد و معاون رہی تھی۔ اس وقت اِس ملک میں جدید صنعتیں لگائی گئی تھیں۔ زرعی ترقی کے لیے جدید نظام متعارف کروائے گئے تھے۔ وہاں کی بیشتر آبادی زندگی کی جملہ سہولیات سے مستفید ہو رہی تھی۔ ملکی مجموعی آمدن اور فی کس آمدن پوری دنیا میں سب سے زیادہ تھی۔

اس طرح یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کے آغاز پر عالمی امامت کا منصب تبدیلی کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ یورپ جو گزشتہ چار (4) صدیوں سے عالمی قوتوں میں مرکزی مقام کا حامل تھا، باہمی انتشار، قوت کی دوڑ اور قومی تعصبات کے باعث کمزور ہوتا چلا گیا تھا۔ ایشیاء اور افریقہ بھی انتشار، خانہ جنگی اور محکومیت کے باعث کوئی اہم کردار ادا کرنے سے قاصر تھے۔ اسی وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ ترقی کی راہ پر سبک رفتاری سے گامزن تھا۔ وہاں ایسی صنعتیں فروغ پا رہی تھیں جہاں کئی کئی ہزار افراد ملازم تھے۔ بھاری صنعت پر بھرپور توجہ دی جا رہی تھی۔

زراعت کے فرسودہ نظام کی جگہ نئے ترقی یافتہ نظام نے لے لی تھی۔ حکومت اور اختیارات زیرک اور معاملہ فہم افراد کے ہاتھوں میں ہونے کے باعث ملکی معیشت و سیاست اور

معاشرت مثبت سمت میں راغب تھی۔ بلاشبہ ایک قوم کو اقوامِ عالم میں سرِ فہرست کھڑا ہونے کے لیے جتنے بھی لوازم درکار ہوتے ہیں وہ سب ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پائے جاتے تھے۔

1914ء میں یورپی متحارب قوتوں کا نقشہ

2

مرکزی قوتوں کی صورتِ حال

مسلم اُمہ کی عظیم ترین بالادستی کے بعد یورپی اقوام تاریخِ عالم اپنی نوکِ قلم سے تحریر کررہی تھیں۔ اسلامی ریاستوں میں طوائف الملوکی، نااہلی اور تن آسانی کے باعث عالمی امامت چودھویں صدی کے اختتام سے ہی یورپ کی طرف عازمِ سفر تھی۔ پھر برطانیہ عظمیٰ یورپی اقوام میں سب سے زیادہ ذہین اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے عرصہء دراز تک عالمی منظرنامے پر چھایا رہا۔ اِس کا وسیع وعریض اقتدار مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اقوامِ مغرب کے توسیع پسندانہ عزائم کے نتیجے میں دنیا بھر میں قابلِ رہائش مناسب ممالک کی تلاش و بسیار کی مہمیں مکمل ہوچکی تھیں۔ یورپ کی بیشتر آبادی براعظم امریکہ میں ہجرت کرچکی تھی۔ یورپی اقوام نوآبادیات اور براعظم پر اپنے اثر ورسوخ کو قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ یہی وہ فیصلہ کن گھڑی تھی کہ جب تاریخ کا طالبِ علم تبدیلیِ امامتِ عالمی کے بھرپور مناظر کا مطالعہ کررہا تھا۔

جنگِ عظیم اوّل درحقیقت عالمی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ

جنگ ہے جس نے عالمی افق پر نئے دور کے آغاز کا عندیہ دیا۔ زمامِ تقدم یورپ سے منتقل ہو رہی تھی اور سات سمندر پار ایک ایسے ملک کو تفویض ہوئی تھی جو یورپی مہاجرین پر مشتمل تھا۔ اسے جغرافیائی لحاظ سے سب سے بڑی فوقیت یہ حاصل تھی کہ اِس کے اردگرد یورپی وایشیائی ممالک کی طرح جھگڑالو اور لڑاکا ممالک کا جمِ غفیر نہ تھا۔ اور اس ملک کو مکمل طور پر وہ تمام وسائل و حالات میسر تھے جو کسی قوم کو عالمی قیادت کے عظیم مرتبہ پر فائز کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہوتے ہیں۔ یہ ملک متحدہ ریاست ہائے امریکہ تھا۔

براعظم یورپ میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، پروشیا، آسٹریا، ہنگری اور روس کے علاوہ عثمانی ترکوں کی سلطنتیں اپنے جاہ جلال، طنطنہ اور شان وشوکت کے اظہار اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے پر کمر بستہ تھیں۔ کسی ایک حریف کی کمزوری دوسرے کے لیے اظہارِ قوت کا باعث بن جاتی۔ انہی حالات میں یورپ پوری اٹھارویں صدی میں گھرا رہا۔

قومی تعصبات، حب الوطنی، نسلی امتیازات، دیرینہ مسائل و جھگڑے اور باہمی چپقلشیں متعدد جنگوں کے اور کشیدگیوں کے اسباب بنے۔ نوآبادیات پر قبضہ وتسلط اور زیادہ سے زیادہ توسیع کے عزائم اسلحہ، فوج اور نئے نئے جنگی تجربات کی دوڑ کا باعث تھے۔ انہیں اسباب وعلل کے باعث یورپ میں امن وامان کا قیام مفقود ہوتا جا رہا تھا۔

برطانیہ ایک عرصے سے نوآبادیاتی نظام میں سب سے آگے تھا۔ اِس کی تجارتی مارکیٹ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ بیشتر دنیا کے وسائل اور ذرائع تجارت میں روزافزوں ترقی اور کامیابی کا باعث تھے۔ تمام کی تمام تجارت کا انحصار بحری گزرگاہوں پر تھا۔ تجارتی راستوں کی دیکھ بھال اور ان پر مکمل طور پر کنٹرول رکھنے کے لیے برطانیہ کی عظیم الشان بحریہ پوری دنیا میں بے مثال حیثیت کی حامل تھی۔

جہاں ایک طرف برطانیہ کی زیادہ تر توجہ بحری قوت میں اضافے پر مرکوز تھی وہیں دوسری طرف جرمنی اور روس اپنی بری فوجوں میں مسلسل اضافہ کر رہے تھے۔ پھر انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یورپ کی صورتِ حال تیزی سے تبدیل ہو چکی تھی۔ 1882ء میں جرمنی نے آسٹریا۔ ہنگری اور اٹلی سے اتحادِ ثلاثہ قائم کر کے علاقے میں فرانس کو بالکل تنہا کر دیا تھا۔

(تصویر مرکزی قوتوں کے تین متحد بادشاہ)۔

براعظم یورپ میں جرمنی کا اثر ورسوخ بسمارک کی شاندار سفارت کاری اور غیر توسیع پسندانہ سوچ کے باعث آئے روز بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ یہ صورتِ حال برطانیہ کے لیے سخت تشویش ناک تھی۔ برطانیہ جرمنی کی ابھرتی ہوئی عالمی قوت کے سامنے بند باندھنا چاہتا تھا تاکہ عالمی امامت وقیادت کی زمام اس کے ہاتھ رہے۔ جبکہ دوسری طرف فطری جذبے کے تحت عالمی قوت بننے کی خواہش جرمنوں کو انتھک محنت کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ اسی تعصب نے برطانیہ کو نوآبادیاتی جھگڑوں کے باوجود فرانس کی حمایت کرنے اور جرمنی کے سیلِ رواں کو روکنے کے لیے ہر قسم کے اقدامات کرنے پر آمادہ کیا۔

مناسب ہوگا کہ ہم بیسویں صدی کے آغاز پر عالمی قوتوں کے بدلتے ہوئے توازن کا مطالعہ کرتے ہوئے جنگِ عظیم اوّل کے اصل اسباب ووجوہات ذہن نشین کرلیں۔ اس کے بعد ہم جنگ، اس کے نتائج اور اثرات کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔ گزشتہ باب میں ہم اتحادی ممالک کی مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لے چکے ہیں اب ان کے مخالف گروہ یعنی مرکزی ممالک کی صورتِ حال کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جرمنی

جرمنی 1870ء کے بعد سے یورپ کی اہم طاقت کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا۔ 1871ء میں آٹو وان بسمارک کے بطور چانسلر تعینات ہونے سے جرمنی کے سفارتی افق روشن تر ہوتے چلے گئے۔ جرمنی جغرافیائی اعتبار سے یورپ کے مرکز میں واقع ہونے کے باعث پورے یورپ کی توجہ کا مرکز بن رہا تھا۔ اسے توسیعی عزائم کو پورا کرنے کے لیے دیگر یورپی ممالک کی نظر میں آئے بغیر نقل وحرکت کرنے کی آزادی نہ تھی۔ اِس کی قوت کے اضافے پر چاروں اطراف واقع ممالک چونک جاتے اور متحدہ ہو کر اِس کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے۔

انہیں حالات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بسمارک نے دو(2) اہم سفارتی اور پالیسی ساز اقدامات کیے۔ پہلے یہ کہ اتحادِ ثلاثہ کے ذریعے آسٹریا۔ ہنگری اور اٹلی سے دفاعی معاہدہ کر لیا۔ اِس طرح جرمنی کے دشمنوں میں صرف فرانس اور روس رہ گئے جبکہ بحری دشمنی میں برطانیہ ہی مدِ مقابل تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس نے توسیع پسندانہ حکمتِ عملی بالکل ہی ترک کر کے دیگر یورپی ممالک کو یہ باور کروایا کہ وہ جرمنی کو ایک طاقت ور ریاست کے طور پر پروان چڑھانا چاہتا ہے جو دوسروں کے پرامن وجود کے قیام اور ترقی کا حامی ہے۔

1890ء میں جرمنی اپنی کامیاب سفارت کاری اور عمدہ حکمتِ عملی کے باعث یورپ کی مرکزی قوت بن چکا تھا۔ جرمنی اپنے ہم عصر عالمی ممالک کے برعکس قدیم مرکزی ریاستی نظام میں استحکام حاصل کر چکا تھا جبکہ دیگر ممالک آزاد جمہوریتوں کی حیثیت سے ترقی کی منازل طے کر رہے تھے۔ یہ امر جمہوری دنیا کے ممالک کے لیے تشویش ناک تھا۔ اسی سال بسمارک اور جرمن قیصر ولیم دوم میں جرمن حکمتِ عملی پر اختلافات کے باعث بسمارک کو ریٹائر کر دیا گیا۔ تاہم جرمنی ابتدائی کٹھن مراحل طے کرتے ہوئے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

1891ء میں جرمنی نے روس کے وفد کو جو دفاعی معاہدے کی تجدید کے لیے آیا تھا، اتحادِ ثلاثہ کی پوشیدہ دستاویز دکھاتے ہوئے تجدیدِ معاہدہ سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ روس کے ساتھ دفاعی معاہدہ اور اتحادِ ثلاثہ ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے باعث بیک وقت نہیں چل

سکتے۔ یہی وہ عظیم سفارتی غلطی تھی جس کا ارتکاب جرمنی کی نئی حکومت نے کیا۔ اب روس نے فرانس کی طرف رُخ کیا۔ دونوں ممالک جرمنی کی بڑھتی ہوئی قوت سے نالاں تھے اور اپنے بارے میں جرمن عزائم کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ لہٰذا 1894ء میں دونوں میں ایک دہرا اتحاد قائم ہو گیا۔ بسمارک کے برعکس ولیم دوم توسیع پسندانہ سوچ رکھتا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بسمارک بالکل ہی توسیع پسندانہ سوچ نہ رکھتا تھا مگر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ بسمارک نے عالمی منظر نامے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اِس خطرے کو بھانپ لیا تھا کہ جرمنی کی توسیعی پالیسی کے باعث جرمنی کی ترقی بلکہ وجود کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ اس لیے اُس نے توسیعی عزائم کا نہ ہی اظہار کیا اور نہ ہی کوئی حکمتِ عملی اختیار کی۔

جرمنی کے توسیع پسندانہ عزائم میں تیزی کی دو (2) وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ ولیم دوم کو یہ احساس تھا کہ موجودہ عالمی طاقتوں کا زور توڑنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس قدر طاقتور ہو جایا جائے جس سے طاقتوں کے توازن میں تبدیلی لائی جانی ممکن ہو۔ اور اس قدر طاقت کے حصول کے لیے وسائل کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جرمنی کی ترقی کی رفتار پورے یورپ میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں حیرت انگیز طور پر تیز تھی۔ آبادی میں مناسب اضافہ، صنعتی، کیمیائی اور برقی ترقی ولیم دوم کو یہ باور کروا رہے تھے کہ وہ عالمی طاقتوں کے ہم پلہ ہونے کے باعث اپنے دشمنوں کو چشمِ زدن میں زیر کر سکتا ہے۔

توسیع کے جذبہ کے زیرِ اثر ہی جرمنی نے 1898ء میں بحری بیڑے میں بے تحاشا اضافہ شروع کر دیا۔ ایڈمرل تریز کی قیادت میں بحریہ دنیا میں چھٹے نمبر سے برطانیہ کے بعد دوسرے نمبر پر آ گئی۔ قبل ازیں جرمنی سے روس اور فرانس ہی نالاں تھے اب بڑھتی ہوئی بحری قوت نے برطانیہ کو شدید تشویش میں مبتلا کرتے ہوئے مجبور کر دیا کہ وہ فرانس سے اپنے تمام جھگڑے پسِ پشت ڈال کر جرمنی کے خلاف معاہدہ کرے۔

بحری قوت میں اضافے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جرمنی اپنے مخصوص سیاسی حالات کے باعث اپنی بری فوج کو محدود رکھنا چاہتا تھا۔ اِس طرح دفاعی اخراجات کے لیے خطیر رقم صرف بحریہ پر ہی خرچ کی جانے لگی تھی۔ حالات و واقعات جس ڈگر پر جا رہے تھے وہاں جرمنی کے اردگرد دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جبکہ دوستوں میں سے اٹلی اور رومانیہ کے ساتھ سفارتی

تعلقات میں سرد مہری آ جانے کی وجہ سے اِن دو (2) ممالک کی حیثیت مشکوک ہو چکی تھی۔

اب مناسب ہوگا کہ ہم 4-1913ء میں جرمنی کی مجموعی صورتِ حال کا جائزہ لیں:۔

سیاسی و معاشرتی حالات

1914ء میں جرمنی پر قیصر ولیم دوم کی حکومت تھی جبکہ جرمن چانسلر تھیوبیلڈ وان بیتھمن ہال ویگ کی سرکردگی میں جملہ امورِ سلطنت بجا لائے جا رہے تھے۔ جبکہ آرمی ہائی کمانڈ کے چیف ہیلمتھ وان مولٹک تھے۔ جرمنی کے ایوانِ بالا (بانڈسٹریٹ) میں جرمنی کی ریاستوں اور شہروں سے نمائندوں کا چناؤ عمل میں لایا جاتا تھا۔ چناؤ کا مخصوص طریقہ پروشیاء کی بالادستی کو بہتر صورت میں قائم رکھنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ جبکہ ایوانِ زیریں (رائخ سٹیگ) عمومی رائے شماری سے تشکیل دیا جاتا تھا۔ چانسلر کا تقرر بادشاہ ولیم دوم کرتا جبکہ چانسلر اپنی مرضی سے وزارتوں کی تقسیم کرتا تھا۔

1890ء میں بسمارک کی ریٹائرمنٹ کے بعد سے جرمنی کی داخلہ اور خارجہ حکمتِ عملی میں توازن کا فقدان تھا۔ عموماً چانسلر کی تبدیلی سے حکمتِ عملی بھی تبدیل ہو جاتی اور بسمارک کے بنائے ہوئے اصول حکمتِ عملی وضع کرنے میں خاطر میں نہ لائے جاتے تھے۔ چانسلر کا تقرر قیصر کے حکم سے ہوتا تھا جو پروشین۔ لیوتھرن شرفاء میں سے چنا جاتا تھا۔ اِس طرح کے چانسلر عموماً زمینداروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پالیسیاں مرتب کرتے تھے اور ٹیکسوں کا زیادہ تر بوجھ مزدوروں اور کسانوں کے سر ڈالا جاتا تھا۔

جرمنی کی یونیورسٹیاں قومی ترقی میں انتہائی اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔ جرمنی میں شرح خواندگی پورے یورپ میں سب سے بہتر اور اعلیٰ تھی۔ کئی ووکیشنل ٹریننگ کے ادارے قائم تھے جہاں سے صنعتی اور تکنیکی مہارت معاشرے میں منتقل کی جاتی تھی۔ جرمن فوج میں 1000 فوجیوں میں سے صرف ایک ان پڑھ ہوتا تھا اور اِس فوج سے فیضیاب ہونے والے پورے ملک میں مختلف مقامات پر ترقی کے سفر میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اِس طرح پڑھے لکھے مزدور، انجینئر، کیمسٹ، سیلز مین، مینجر وغیرہ جرمنی کی حیرت انگیز ترقی کا باعث بن رہے تھے۔

جرمنی کی آبادی کا صرف چالیس فیصد حصہ ہی دیہاتی علاقوں میں رہائش پذیر تھا۔

جرمنی کی تیز رفتار صنعتی ترقی اور صنعت سازی کی بدولت وہاں سے ہجرت کرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔ 1880ء کے عشرے میں مجموعی طور پر 1,30,000 افراد سالانہ ہجرت کرتے تھے جبکہ بڑھتے ہوئے روزگار کے مواقع ملنے پر 1890ء میں یہ شرح گر کر صرف 20,000 افراد سالانہ رہ گئی تھی۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی شہری آبادی کے باوجود زرعی اصلاحات کی وجہ سے پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ 1914ء میں 1,00,000 سے زائد آبادی والے شہروں میں مجموعی آبادی کا 20 فیصد حصہ رہائش پذیر تھا۔

1914ء میں جرمنی کی مجموعی آبادی 67 ملین تھی۔ آبادی میں تیزی سے اضافہ اور صنعتی، کیمیائی اور برقی ترقی کا باہمی تناسب اِس کی مجموعی ترقی اور خوشحالی کا ضامن تھا۔ گزشتہ سالوں میں روزگار کی فراہمی میں ہونے والی ترقی نے پورے ملک میں خوشحالی کے دروازے کھول دیے تھے۔ عوام میں جذبہ حُب الوطنی انتہائی شدت سے بھرا ہوا تھا۔ جرمن قوم اپنے جرمن ہونے پر فخر کرتی تھی۔ اور متحدہ جرمنی اُن کے قومی فخر کی علامت تھا۔

جرمنوں کو جاپانیوں کی طرح اپنی تہذیب و ثقافت پر بھی بڑا ناز تھا۔ یہ مستقبل کی ابھرنے والی وہ طاقت تھی جو اُس وقت کے مروجہ نظام کو چیلنج کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ 1890ء کے بعد سے جرمنی کے توسیع پسندانہ عزم کی تسکین نوآبادیات سے نہ ہو رہی تھی۔ اِس طرح اِس ملک میں ایک طرح کی بے چینی بھی پائی جاتی تھی۔ یہی وہ جذبہ اور بے چینی تھی جس کے تحت جرمن چانسلر بیتھمن ہال ویگ نے 1914ء میں بے انتہا جذباتی ہو کر کہا تھا کہ "ہر کسی کو چیلنج دینا ہے۔ ہر ایک کی راہ کو ماپنا ہے اور اِس ساری سعی و عمل کے دوران کسی کو کمزور بھی نہیں کرنا۔"

جرمنی کے اعلیٰ حکام روس کی بڑھتی ہوئی آبادی اور طاقت سے خائف تھے۔ بیرونِ براعظم توسیع کے مواقع نہ ملنے پر جرمنی کے حکمتِ عملی مرتب کرنے والے ادارے براعظم کے اندر توسیع کے عزائم پورے کرنے کے لیے سوچنے لگے تھے۔ یہ سب جرمنوں کے احساسِ ناانصافی کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آ رہا تھا۔

معاشی و اقتصادی حالت

1914ء میں جرمنی کی معاشی و اقتصادی صورتِ حال 1890ء کی نسبت دو سے تین گنا

زیادہ مستحکم ہو چکی تھی۔ یہ واحد قدیم طرز کا ریاستی ملک تھا جو صنعتی استحکام کے درجے پر پہنچ چکا تھا۔ اس وقت یہ فرانس اور روس سے کہیں آگے تھا۔ کئی شعبوں میں تو یہ برطانیہ کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ برطانیہ 1870ء میں جرمنی سے دوگنی فولادی پیداوار کرتا تھا۔ جبکہ 1914ء میں جرمنی برطانیہ کی نسبت دوگنی مقدار میں فولاد سازی کرتا تھا۔ یہ پیداوار 17.6 ملین ٹن تھی۔

1913ء میں مجموعی قومی پیداوار کا 60 فیصد صنعت سازی سے حاصل ہوتا تھا۔ جرمنی میں بھاری مشینری کے کئی کارخانے قائم تھے جن میں 1911ء تک 13.2 ملین مزدور کام کرتے تھے۔ جرمنی میں سیمنز اور اے ای جی جیسی بڑی بڑی صنعتی فرمیں قائم تھیں جہاں مجموعی طور پر 1,42,000 افراد ملازمت کرتے تھے۔ اور جرمنی کی فی کس آمدنی 352 جرمن مارک سے بڑھ کر 728 جرمن مارک تک پہنچ گئی۔ جرمنی کی فیکٹریاں ان کے مدِ مقابل برطانیہ اور فرانس کی فیکٹریوں سے کہیں بڑی اور اعلیٰ تھیں۔ کیمیائی صنعت میں ہوچسٹ جیسی عظیم کمپنیاں بھی جرمنی کی مجموعی آمدن اور کیمیائی ترقی کے لیے مسلسل مصروفِ عمل تھیں۔

جرمنی کے ذرائع نقل و حمل، یونیورسٹیاں، ڈاک کا نظام قومی تحویل میں تھا جبکہ سکول عمومی طور پر نجی تحویل میں تھے تاہم اُن کی باقاعدہ نگرانی بذریعہ ریاست کی جاتی تھی۔ جرمنی میں 1913ء میں 187 میٹرک ٹن توانائی کا استعمال ہوتا تھا جو برطانیہ سے بہت تھوڑا ہی کم تھا۔

سٹیل (فولاد) کی پیداوار برطانیہ، فرانس اور آسٹریا۔ ہنگری کی مجموعی پیداوار سے زیادہ تھی 1914ء میں سٹیل سازی کے اعداد و شمار 17.6 ملین ٹن تھے۔ اسی سال جرمنی کی کوئلے کی پیداوار 277 ملین ٹن تھی۔ جرمنی بیسویں صدی کی نئی صنعت بجلی، آلۂ بصر اور کیمیائی ترقی میں پوری دنیا پر سبقت رکھتا تھا۔ جرمنی کی بائر اور ہوچسٹ جیسی کیمیائی فرمیں پوری دنیا کا 90 فیصد رنگ فراہم کرتی تھیں۔ 1890ء کی نسبت جرمنی کی بیرونی تجارت میں تین (3) گنا اضافہ ہوا تھا۔

جرمنی کی صنعت سازی کی فی کس شرح 85 تھی۔ جبکہ مجموعی صنعتی صلاحیت 137.7 تھی۔ اس وقت جرمنی کا عالمی صنعتی پیداوار میں تناسب 14.8 فیصد تھا جو برطانیہ سے کچھ زیادہ تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے جدول نمبر 9)

جنگِ عظیم اوّل کے آغاز پر جرمنی کی مجموعی قومی آمدن 12 بلین ڈالر تھی۔ فی کس آمدنی 184 ڈالر تھی۔ یہی وہ ہوش ربا اعداد و شمار تھے جو اُس وقت کی عالمی قوتوں کو سخت پریشانی میں مبتلا

جدول نمبر 9

1914ء میں جرمنی کی مجموعی معاشرتی ومعاشی صورتِ حال

کُل آبادی	شہری آبادی	توانائی کا استعمال	صنعت سازی (شرح)	صنعتی صلاحیت	فولاد سازی (ٹن)	عالمی پیداواری تناسب	مجموعی آمدن	فی کس آمدن	کوئلے کی پیداوار
67 ملین	21 فیصد	187 ملین میٹرک ٹن	85 فی کس	137.7	17.6 ملین	14.8 فیصد	12 بلین ڈالر	184 ڈالر	277 ملین ٹن

جدول نمبر 10

1914ء میں جرمنی کی مجموعی فوجی صورتِ حال

باقاعدہ فوج	مجموعی فوج	ڈریڈناٹس	آبدوزیں	بحری جہازوں کا ٹن ماپ	لڑاکا طیارے
8,91,000	45,00,000	17	30	13,05,000	246

کر رہے تھے۔ ایک فطری عمل ہے کہ نئی ابھرنے والی قوتیں جب عالمی منظر نامے میں اہمیت حاصل کرنا چاہتی ہیں تو مروجہ عالمی نظام میں تبدیلی کی خواہاں ہوتی ہیں جو پرانی اور مستحکم عالمی قوتوں نے اپنے مفاد میں تشکیل دیا ہوتا ہے۔ اور اِس مقصد کا حصول پہلی قوتوں کو برانگیختہ کیے بغیر مشکل ہوتا۔ تاہم ایک اعلیٰ ترین سفارتی نظام ہی پر امن طور پر بتدریج تبدیلی کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔

جرمنی کی بڑھتی ہوئی اقتصادی ترقی اور قدیم طرزِ ریاست و حکومت میں استحکام نئی تشکیل شدہ جمہوری و معاشرتی ریاستوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اُن قوتوں کے تشکیل کردہ نظام کی بقا کو جرمنی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے شدید خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ بُری طرح مشتعل تھیں۔ اور ایک دوسرے سے ہزار اِختلافات ہونے کے باوجود ایک مشترکہ خطرے کے سامنے متحد ہو چکی تھیں۔

1870ء سے 1890ء تک بسمارک کی جہاندیدہ نگاہ اور دُور اندیش سوچ غیر متصادم ماحول کی تشکیل اور قیام میں مصروفِ عمل رہی۔ جبکہ ولیم دوم دور رس عوامل کی بجائے فوری نتائج کا خواہاں تھا۔ اور بالآخر اُس نے بسمارک کی بتدریج عالمی قوت بننے کی حکمتِ عملی کے برعکس فوری طور پر سب سے بڑی قوت بننے کے لیے اقدامات کرنے شروع کر دیے جن کے باعث جرمنی سفارتی طور پر تنہا ہوتا چلا گیا۔ اور ایک ایسا وقت آیا کہ جرمنی کے حلیف (اٹلی اور رومانیہ) دورانِ جنگ مخالف کیمپ میں جا کھڑے ہوئے۔

جغرافیائی و فوجی صورتِ حال

جرمنی جغرافیائی لحاظ سے براعظم یورپ کے قریب قریب مرکز میں واقع ہے۔ نقشے پر نظر دوڑانے سے ایک بات واضح طور پر عیاں ہوتی ہے کہ جرمنی چاروں اطراف سے طاقتور حریف ممالک میں گھرا ہوا تھا۔ اسی جغرافیائی صورتِ حال کے پیشِ نظر 1882ء میں بسمارک نے دشمنوں کی تعداد کم کرنے اور تصادم کے امکانات کو کم سے کم کرنے کے لیے اتحادِ ثلاثہ کے ذریعے آسٹریا۔ ہنگری کی دشمنی کو دوستی میں تبدیل کر دیا تھا۔ دشمنوں کی تعداد میں کمی کا لازمی نتیجہ قوت میں اضافہ اور رہے سہے دشمنوں کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔ تاہم یہ معاہدہ 1891ء تک صیغۂ راز میں رہا۔

جرمنی کی جغرافیائی حدود مشرق میں روس کی عظیم سلطنت سے ملتی تھیں۔ جنوب مشرق میں آسٹریا۔ ہنگری واقع تھا۔ جنوب میں سوئٹزرلینڈ، جنوب مغرب میں فرانس کے ممالک تھے۔ مغرب میں لیگزمبرگ اور بیلجیم، شمال مغرب میں ہالینڈ اور شمال میں ڈنمارک واقع تھے۔ (دیکھیے نقشہ نمبر 3)
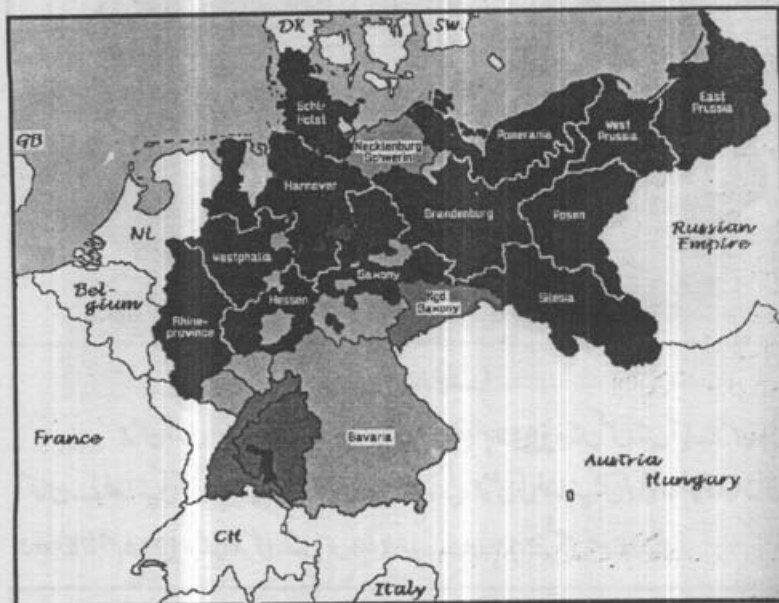
(نقشہ نمبر 3: جرمنی 1914ء میں)

بیسویں صدی کے آغاز پر جرمن حکومت نے بری فوج میں وسیع تر اضافے کے لیے جبری بھرتی شروع کردی۔ جس کے تحت ہر جرمن باشندے کے لیے ضروری تھا کہ وہ چند سال لازماً جرمن فوج میں بطور باقاعدہ ملازم بھرتی ہو۔ جبکہ اپنی مدت مکمل کر لینے کے بعد وہ فوج سے علیحدہ کردیا جاتا تھا۔ اس طرح فوج نہ صرف ملکی دفاع میں اہم کردار ادا کرتی تھی بلکہ وہاں نوجوانوں کی تربیت اور ہنر مند بنانے کے لیے وسیع میدان بھی میسّر تھا۔ ضرورت پڑنے پر فوج سے علیحدہ ہونے والے افراد کو بطور محفوظ دستے استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔

1914ء میں جرمنی کی باقاعدہ بری فوج 25 کوروں پر مشتمل تھی جن میں مجموعی طور پر 7,00,000 فوجی ملازم تھے۔ جبکہ مجموعی طور پر محفوظ دستے اور دیگر افواج ملا کر کُل 45,00,000

• فوج اگست 1914ء میں جرمنی میدانِ کارزار میں لانے کی پوزیشن میں تھا۔ (جدول نمبر 10 میں اعداد و شمار درج ہیں)۔
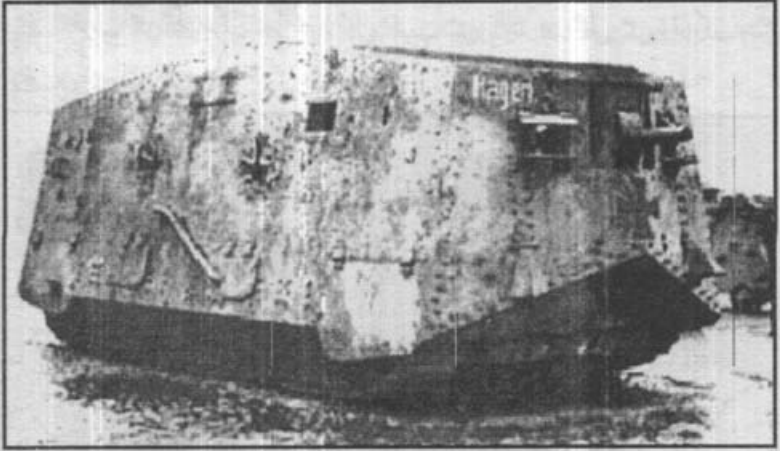
(جرمن A7V ٹینک)

جرمن آرمی ایئر سروس (جرمن فضائیہ) کا قیام 1912ء میں عمل میں آیا۔ جرمن ہائی کمان نے فضائیہ کی کوئی خاص اہمیت محسوس نہ کی اِس لیے جرمنی کی فضائیہ میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہو سکا تاہم 1914ء میں جرمنی کے پاس 246 طیارے اور 11 ایئر شپس موجود تھے۔

(جرمن نیوی زیپلن L2)

جرمنی کی بحریہ 1914ء میں دنیا بھر کی دوسری بڑی بحریہ تھی۔ اس وقت جرمن بحریہ کے پاس 17 جدید جنگی بحری جہاز (Dreadnoughts)، 20 جنگی بحری جہاز، 5 تیز بحری جنگی جہاز (Battle Cruisers)، 7 جدید ہلکے کروزرز، 18 کروزرز، 30 پیٹرول سے چلنے والی آب دوزیں، 10 یو بوٹس موجود تھیں جبکہ 17 مزید یو بوٹس تیاری کے مراحل میں تھیں۔
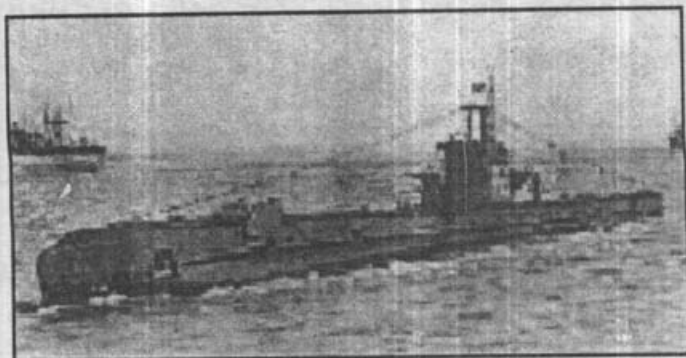
(جرمن یو بوٹ)

آسٹریا۔ہنگری

متحدہ آسٹریا۔ہنگری کی سلطنت کا قیام 1867ء میں عمل میں آیا۔ جب معاہدہ ویانا کے تحت سلطنت کا یہ نیا نام اختیار کیا گیا۔ آسٹریا۔ہنگری اپنے قیام کے وقت سے جرمنوں کے پروشیا اور اٹلی کے زیرِ قبضہ اپنے علاقوں کا نعم البدل بلکان کے روسی علاقوں سے حاصل کرنے کا دیرینہ خواہش مند تھا۔ اور یہ بات اِس دوہری ریاست کے حکمرانوں کو اچھی طرح معلوم تھی کہ اِس طرح کی سوچ پر روس کی جانب سے شدید ردِ عمل ہوگا۔

تاریخِ یورپ میں 1860ء کی دہائی بہت خونریز رہی تھی۔ اِس کے نتیجہ میں نئے عالمی نظام کا وجود ممکن ہوا تھا اور سیاسی مدبرین انتہائی ذمہ داری سے اپنے اپنے ممالک کے لیے حکمتِ عملی مرتب کر رہے تھے۔ انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ عالمی قوت بن کر ابھرنے کے لیے صرف

بڑی فوج ہی کافی نہیں ہے بلکہ فوج کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معاشی واقتصادی نظام، قومی جذبہ حب الوطنی، مضبوط سیاسی نظام اور مستحکم سفارتی تعلقات بہت ضروری ہیں۔ اسی لیے 1870ء کے عشرے میں تمام یورپی مدبرین امن کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

دوسری طرف یورپ کی اکثریتی قوم جرمن جو قبل ازیں مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی تھیں پروشیا کے صدر بسمارک کے ''نارتھ جرمن فیڈریشن'' کے تحت ازسرِ نو متحد و منظم ہو رہی تھیں۔ اِس صورتِ حال نے جہاں ایک طرف فرانس کو دہلا دیا تھا، وہیں آسٹریا۔ ہنگری کو بھی سہما دیا تھا۔ روس ابھی جنگِ کریمین کے زخم چاٹ رہا تھا اور برطانیہ اپنے نو آبادیاتی اور اندرونِ ملک سخت الجھے ہوئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہمہ تن مصروف تھا۔

اِس طرح آسٹریا۔ ہنگری کی نئی قائم ہونے والی سلطنت بڑی قوتوں میں سب سے کم مستحکم اور کمزور حیثیت کی حامل تھی۔ وہاں کی بہت بڑی آبادی آئے روز ہجرت کر رہی تھی۔ جس کے باعث مجموعی طور پر ملکی پیداواری صلاحیت گر رہی تھی۔ اِس صورتِ حال کے باوجود بھی آسٹریا۔ ہنگری کی مشترکہ سلطنت اپنے رقبے، اور گزشتہ صدی کے جاہ و جلال کے باعث بڑی قوتوں میں شمار ہوتی تھی۔ اِس کے ترقیاتی اعداد و شمار ابھی بھی دیگر ہمسایہ ممالک کے لیے مرعوب کُن تھے۔

اگرچہ آسٹریا۔ ہنگری کے مجموعی اعداد و شمار اپنی ہیت کے لحاظ سے ایک بڑی طاقت کے کمزور و ادنیٰ درجے کے حامل دکھائی دیتے تھے۔ مگر بنظرِ غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آسٹریا۔ ہنگری کی معیشت گروہی عناصر اور طبقاتی نظام میں منقسم تھی۔ اِس کے چند علاقوں کی آمدن دیگر علاقوں کی مجموعی آمدن سے دوگنا ہوتی تھی۔ اِس کے علاقے گلیشیا اور بوکووینا کی 73 فیصد آبادی زراعت پیشہ تھی جبکہ اِن علاقوں کے باسیوں کی فی کس آمدن 313 کراؤن تھی۔ آسٹریا کے زیریں علاقوں کی فی کس آمدن 850 کراؤن، بوہیمیا میں 761 کراؤن تھی۔ مزید یہ کہ دلماتیا میں 264 کراؤن فی کس آمدنی تھی جو آسٹریا۔ ہنگری میں غیر مساوی تقسیم دولت اور بلحاظ علاقہ و قوم امتیازی سلوک روا رکھے جانے کی کھلی دلیل تھی۔

ایک طرف تو آسٹریائی صوبوں اور بوہیمیائی علاقوں میں صنعتی ترقی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ ہنگری میں زراعت کے فروغ کے لیے کوششیں بار ور ہو رہی تھیں وہیں دوسری طرف سلافی

کے غربت زدہ علاقے کسی قسم کی حکمتِ عملی اور ترقیاتی امور سے محروم تھے۔ اِن علاقوں میں آبادی میں ہونے والا اضافہ آسٹریا۔ ہنگری کے مجموعی اعداد و شمار کی اوسط میں کمی کا باعث بن رہا تھا۔ آسٹریا اور بوہیمیا کے صوبوں میں قائم صنعتی یونٹ اِس قدر نہ تھے کہ نئے عالمی تناظر میں ملک کی صنعتی ضرورت کو پورا کر سکیں۔ اور ویانا کو دیگر بڑی طاقتوں کے شانہ بشانہ کھڑا کر سکیں۔

اور یہ سب آسٹریا۔ ہنگری کی مختلف النوع آبادی کا نتیجہ تھا جو باہمی جذبہ ملی سے قطعاً عاری، زبان، رنگ و نسل اور گروہ بندی کے جھنجھٹوں میں الجھی ہوئی تھی۔ تنگ نظری، جمودی سوچ اور نفسانفسی اپنے عروج پر تھی۔ ملک میں پندرہ (15) مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں اور ایک زبان بولنے والے دوسری زبان سیکھنا ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ اسی لیے تو 1914ء میں جنگِ عظیم کے آغاز پر جنگ کا پہلا حکم آسٹریا۔ ہنگری نے اپنی فوج کو پندرہ (15) مختلف زبانوں میں دیا گیا تھا۔

1867ء میں قائم ہونے والی دوہری سلطنت کی بنیاد آسٹریا اور ہنگری کی مساوی حیثیت پر رکھی گئی تھی۔ مگر مراعات و ترقیاتی منصوبوں کے یک طرفہ بہاؤ نے ہنگری کے دانشوروں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ متحدہ سلطنت کو ختم کر کے اپنے اپنے ممالک کی صورت میں بٹ جائیں۔ اور آزاد ریاستوں کو قائم کرتے ہوئے بادشاہت کا طوق گلے سے نکال پھینکیں۔

اِس قدر کشیدگی کی صورت میں فرانس روس کے ساتھ دوہرے اتحاد میں جرمنی کے آسٹریائی علاقوں پر قبضہ کر کے یورپ کی بہت بڑی سلطنت بن جانے کے خوف پر باقاعدہ خفیہ بات چیت شروع ہو گئی۔ پھر جرمن اور چیک زبان بولنے والوں کی باہمی کشاکش ملکی زعماء کو پریشان کیے رکھتی تھی۔ 1905ء میں تو اعلیٰ فوجی حکام ہنگری پر قبضے کے منصوبے بنانے میں مشغول ہو گئے تھے۔

اِن تمام خطرات سے زیادہ خطرہ سلطنت کو جنوب کے غلاموں کے طبقے سے تھا جو اکثر اوقات منحرف ہو کر سربیا اور روس سے امداد کے طلب گار رہتے تھے۔ اِن کے مطالبات پر گفتگو اور غور و خوض ویانا کے آزاد خیال طبقہ کے زور دینے پر چلتا رہتا تھا تاہم مگیار نسل کی طرف سے اِس پیش رفت کی شد و مد سے مخالفت کی جاتی رہی تھی۔ یہ طبقہ اپنے گروہی اقلیت کے امتیاز کو بہر صورت قائم رکھنا چاہتا تھا۔

ملک کی مجموعی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہر دفعہ ویانا سیاسی حل پیش کرتا اور اسی طرح کی کاوشوں کی بدولت متحدہ سلطنت قائم چلی آ رہی تھی۔ معاملات کے حل کے لیے کمیٹیاں بنائی جاتیں جو مسائل پر غور و خوض کر کے حل کے لیے تجاویز پیش کرتیں اور اِن تجاویز کے مطابق ترقیاتی کام مثلاً ریلوے لائنوں کا بچھایا جانا، نوکریاں فراہم کرنا، ٹیکسوں میں چھوٹ دینا، اسکول قائم کرنا، فلاحی مراکز کا قیام اور ڈاکخانے کی سہولت فراہم کرنا وغیرہ انجام دیے جاتے اور سلطنت کو برقرار رکھنے کی سعی کی جاتی۔

انہیں حالات کی وجہ سے آسٹریا۔ ہنگری کی مجموعی آمدنی کا بیشتر حصہ مسائل کے حل کے لیے خرچ ہو جاتا اور فوج و دفاع کے لیے بجٹ میں رقم بہت کم رکھی جاتی۔ یہ رقم ہمسایہ ممالک کے دفاعی بجٹ کا تہائی یا نصف کے مساوی ہی ہوتی تھی۔ اِس لیے فوج کے پاس فرسودہ اسلحہ، پرانی توپیں اور بے کار بندوقیں تھیں۔

فوج میں افرادی قوت کی بھی شدید کمی تھی۔ کیونکہ مجموعی آبادی کا صرف 30 فیصد حصہ ہی فوج کی ملازمت میں رکھا جاتا جن میں سے نصف سے زیادہ تعدا میں فوجیوں کو صرف آٹھ (8) ہفتے کی تربیت/ٹریننگ کے بعد مستقل رخصت پر بھیج دیا جاتا۔ اِس طرح جرمنی کے برعکس آسٹریا۔ ہنگری کی فوج سے فارغ ہونے والے افراد نہ ہی ہنر مند ہوتے اور نہ ہی معاشرے میں پیداواری اکائی کے طور پر اپنے حصے کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز پر یورپ ایک بار پھر بحران کا شکار تھا۔ آسٹریا۔ ہنگری اِس بحران میں بڑی قوتوں میں سب سے زیادہ تشویش ناک صورتِ حال سے دوچار تھا۔ اس وقت اس کی فوجی صورتِ حال قابلِ رحم، سیاسی حالتِ زار انتہائی پیچیدہ اور لسانی و گروہی طبقوں کی شکار اور سفارتی ہیت اِن سب سے زیادہ مضحکہ خیز تھی۔ اسے اپنے اردگرد موجود ممالک روس، اٹلی، فرانس اور سربیا سے شدید خطرہ لاحق تھا۔ جبکہ فرانس روس کے ساتھ دوہرے دوستی کے معاہدے کر رہا تھا۔ اور آسٹریا۔ ہنگری اپنے تین (3) اطراف دشمنوں کے نرغے میں تھا۔

1912ء میں رومانیہ بھی مخالف کیمپ میں چلا گیا۔ سربیا نے مونٹی نیگرو کے ساتھ مل کر جنوب کے غلاموں کو شورش کے لیے اُبھارنا شروع کر دیا۔ اٹلی اتحادِ ثلاثہ کا ساتھی ہونے کے باوجود آسٹریا۔ ہنگری کے جنرل فرینز کونریڈ کی دھمکیوں کے باعث نہایت کشیدہ و کبیدہ خاطر تھا۔

اِس صورتِ حال کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اگر کسی ایک طرف بھی حملہ کیا جاتا تو مخالفین متحد ہو کر آسٹریا۔ ہنگری پر چڑھ دوڑتے۔ جس کا متحمل یہ ملک کسی طور بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اب ہم 14-1913ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی متحدہ سلطنت کی حالتِ زار کا جائزہ لیں گے:

سیاسی و معاشرتی حالات

1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری میں بادشاہ فرینز جوزف کی حکومت تھی جو 1867ء سے اِس دوہری بادشاہت کا حکمران تھا۔ ملک کی جملہ انتظامیہ کو چننے اور برخواست کرنے کا اختیار بھی فرینز جوزف ہی کے پاس تھا۔ ملک میں ایک قومی اسمبلی بھی بذریعہ رائے عامہ منتخب کی جاتی تھی جسے ملک بھر سے محدود پیمانے پر انتخاب کے ذریعے منتخب کیا جاتا تھا۔ اِس اسمبلی کا عمومی انتظامی معاملات میں کوئی خاص عمل دخل نہ تھا۔

1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی 52.2 ملین آبادی تھی۔ جس میں مختلف النوع اقوام شامل تھیں۔ ملک کی واضح اکثریت جرمنوں کی تھی جو 10 ملین سے زائد تھی جبکہ دوسری بڑی آبادی ہنگرییَن تھے جو 9 ملین تھی۔ بقیہ آبادی مختلف دیگر اقوام پر مشتمل تھی جن میں پولش، بوسنیائی، چیک، کروشیائی، سربیائی، اٹیلین، رُوتھینز، رومانیائی، سلویکی اور غلام شامل ہیں۔ اِس دوہری بادشاہت میں 15 مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ایک قوم دوسری قوم کی زبان اور تہذیب وتمدن کو قبول کرنے سے انکاری تھی۔ اِسی لیے اکثر و بیشتر لسانی و نسلی فسادات کا سلسلہ حکومت کے لیے مشکلات کا باعث بنتا رہتا تھا۔

آسٹریا۔ ہنگری کی سلطنت میں ایک کرنسی رائج تھی جبکہ فرینز جوزف کی سربراہی میں آسٹریا اور ہنگری کی علیحدہ علیحدہ پارلیمنٹس منتخب کی گئی تھیں۔ پوری دوہری سلطنت علاقائی طبقات میں بٹی ہوئی تھی۔ اِس کے صوبوں کی آبادی معاشی تفریق کا شکار تھی۔ آسٹریا کے زیریں علاقے خوشحالی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بوہیمیا کی حالت قدرے بہتر تھی۔ جبکہ گلیشیا، بوکوینا اور دلماتیا کے علاقے افلاس و غربت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

آسٹریا اور ہنگری کے صوبوں میں جدید صنعتی ترقی کے لیے ضروری اقدامات کیے

جارہے تھے۔ جبکہ دوہری سلطنت کے بقیہ علاقے اِن اقدامات سے یکسر محروم تھے۔ جنوبی علاقوں کے باسی جو غلام کہلاتے تھے بُری طرح نظرانداز کیے جارہے تھے۔ اِس کی بڑی وجہ سربیا اور روس کی اُن کے ساتھ ہمدردی تھی۔ تاہم اگر اُن کے جائز حقوق پورے کیے جاتے تو ان علاقوں سے سربیا اور روس کے اثر کو بہت حد تک کم کیا جاسکتا تھا۔

مجموعی طور پر آسٹریا۔ ہنگری پر جنگِ عظیم اوّل کے وقت ''شرفاء'' کا اثر رورسوخ زیادہ تھا۔ جبکہ نمائندگان بہت حد تک بے اختیار تھے۔ چیک اور دیگر اقلیتی اقوام حکومت اور انتظامات کے نظام سے مکمل طور پر باہر ہونے کے باعث آسٹریا۔ ہنگری سے علیحدگی کے بارے میں غور کررہی تھیں۔ انہی حالات میں سلطنت کے سپہ سالار، اٹلی جو اتحادِ ثلاثہ کا حلیف تھا، کوفوج کشی کی دھمکیاں دے رہا تھا جس پر باہمی تعلقات شدید کشیدگی کا شکار تھے۔

معاشی واقتصادی حالت

1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی کُل آبادی کا 8.9 فیصد حصہ شہروں میں رہائش پذیر تھا۔ ملک کی مجموعی آمدن 3 بلین ڈالر اور فی کس آمدنی 57 ڈالر تھی۔ ملک کی مجموعی طور پر 50 فیصد آبادی زراعت کے شعبہ سے منسلک تھی۔ زراعت کے لیے پسماندہ علاقے مختص تھے جہاں کسی قسم کے ترقیاتی کام نہ کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زراعتی پیداوار بھی حسبِ منشا حاصل نہ ہوتی تھی۔

صنعتی انقلاب کے اثرات کے تحت انیسویں صدی کے اواخر میں آسٹریا۔ ہنگری میں صنعتی ترقی کا سفر تیزی سے شروع ہوا۔ تاہم بیسویں صدی کے آغاز میں اِس کی رفتار آہستہ ہوگئی۔ 1914ء میں فی کس صنعت سازی کی شرح 33 تھی جبکہ ملک کی مجموعی صنعتی صلاحیت 40.7 تھی۔ دوہری ریاست میں توانائی کا استعمال بھی فرانس اور روس سے کچھ ہی کم 49.4 ملین میٹرک ٹن تھا۔

اُس وقت آسٹریا۔ ہنگری میں کوئلے کی پیداوار 48 ملین ٹن تھی جو متذکرہ بالا ہردو ممالک سے کہیں زائد تھی۔ یہاں کپڑے کی صنعت اپنے عروج پر تھی۔ شراب اور شکر کی پیداوار بھی ترقی سے ہمکنار تھی۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بجلی کی فراہمی ممکن ہوئی۔ اسی دور میں گلیشیا

کے علاقے میں تیل کی دریافت ہوئی۔ دوسری جانب ریلوے کی ترقی کے لیے زور وشور سے وسائل بروئے کار لائے گئے۔ سکودا میں اسلحہ سازی کے بیشتر کارخانے قائم کیے گئے۔

اِن اعداد وشمار کے باوجود ملک کی صنعتی پیداوار 1913ء میں عالمی پیداوار کا صرف 4.4 فیصد حصہ بنتی تھی جو اُس وقت کی بڑی طاقتوں میں سے صرف اٹلی سے زائد تھی۔ ملکی معیشت علاقائی امتیازی سلوک کے باعث پہلے ہی کھوکھلی ہو چکی تھی۔ جبکہ اندرونی مسائل نے اسے مزید کھوکھلا کر دیا تھا۔ ملک میں 30 لاکھ سے زائد سول ملازمین مختلف اداروں/محکموں میں کام کر رہے تھے۔ ویانا کے پاس مختلف علاقوں اور زبانیں بولنے والی آبادی کی شورش یا بے چینی کو ختم کرنے کے لیے نوکریوں کی فراہمی یا ٹیکسوں میں رعایت کے سواء اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اِس طرح ملکی اخراجات مجموعی آمدن سے بڑھ جاتے تھے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتا تھا۔ (تفصیل کے لیے جدول نمبر 11)

جغرافیائی و فوجی صورتِ حال

آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری ریاست کا کُل رقبہ 6,75,000 مربع کلومیٹر تھا۔ ملک کے شمال مشرق میں روس، مشرق میں رومانیہ، جنوب میں سربیا اور مونٹی نیگرو، جنوب مغرب میں اٹلی، مغرب میں سوئٹزرلینڈ اور شمال مغرب میں جرمنی واقع تھے۔ اِس طرح یہ سلطنت شمال مغرب کے علاوہ ہر طرف سے اپنے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی۔ اِس صورتِ حال میں وہاں کی حکومت اپنی خارجہ پالیسی اور سفارتی تعلقات میں کوئی خاص حکمتِ عملی وضع کرنے یا اختیار کرنے میں بُری طرح ناکام رہی تھی۔

اِس ملک کے اپنے ہمسایہ ممالک سے بے شمار تنازعے چل رہے تھے۔ پھر اِس کے زیرِ قبضہ کئی علاقے اِس سلطنت کے اچھے دنوں میں فتح کیے گئے تھے اور اب وہاں کی عوام میں حکومت کی غیر منصفانہ پالیسیوں کے باعث بے اطمینانی اور بے چینی پائی جاتی تھی۔ اِس صورتِ حال کو وہ ممالک جن سے علاقے چھینے گئے تھے پوری طرح استعمال کرتے تھے۔ اور عوامی بے چینی اور شورشوں کے سبب حکومت کی جانب سے ہڑبڑاہٹ کا اظہار سفارتی محاذ پر کیا جاتا جو عالمی بحران کے اِس دور میں دوستوں کی تعداد میں کمی اور دشمنوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کر رہا تھا۔

جدول نمبر 11

1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی مجموعی معاشرتی و معاشی صورت حال

کُل آبادی	شہری آبادی	توانائی کا استعمال	صنعت سازی (شرح)	صنعتی صلاحیت	قوموں کی تعداد	عالمی پیداواری تناسب	مجموعی آمدن	فی کس آمدن	کوئلے کی پیداوار
52.2 ملین	8.9 فیصد	49.4 ملین میٹرک ٹن	33 فی کس	40.7	15	4.4 فیصد	3 بلین ڈالر	57 ڈالر	48 ملین ٹن

جدول نمبر 12

1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی مجموعی فوجی صورت حال

مجموعی فوج	ڈیسٹرائرز	بحری جنگی جہاز	آب دوزیں	بحری جہازوں کا ٹن ماپ	لڑاکا طیارے
4,44,000	18	16	5	3,72,000	35

جرمنی سے قائم شدہ اتحادِ ثلاثہ بھی اہلِ ویانا کی نظر میں کھٹکتا تھا۔ اور وہ اِس اتحاد کو بادلِ ناخواستہ ہی برداشت کر رہے تھے۔ تاہم وہ اِس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے کہ جرمنی کی مدد و اعانت کے خاتمے پر روس اور فرانس آسٹریا۔ ہنگری جیسے کمزور ہمسائے کو ایک طوفانی ریلے کی طرح بہالے جائیں گے۔ اسی لیے ہر پانچ (5) سال بعد اتحادِ ثلاثہ کی تجدید کی جاتی تھی جس میں آسٹریا۔ ہنگری بادلِ ناخواستہ اپنی کمزور حالتِ زار کے باعث شامل چلا آ رہا تھا۔

ملک کی شہنشاہی فوج بلاواسطہ بادشاہ فرنز جوزف کی قیادت میں منظم تھی جو فوج کا اعلیٰ کمانڈر بھی تھا۔ تاہم 1914ء میں فرینز جوزف کی عمر 84 برس ہو چکی تھی اور اُس کی پیرانہ سالی کے باعث چیف آف سٹاف فرنز کونریڈ فوج میں اپنی مقبولیت کے باعث کافی اثر رکھتا تھا اور عملی طور پر وہ ہی ملک کی افواج کا سپہ سالار تھا۔ کونریڈ جارحانہ حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا اور ملک کے اندرونی و بیرونی مسائل کا حل بذریعہ فوج و قوت حل کرنے کا خواہاں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر اوقات اٹلی اور سربیا سے تصادم کے شوشے چھوڑتا رہتا تھا۔ جس کے باعث ہمسایہ ممالک سے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔

1914ء سے قبل کونریڈ نے جنگ کا منصوبہ بنالیا تھا جس کے مطابق وہ فوجوں کو ملک کے تین اطراف موجود دشمنوں سے بیک وقت لڑنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اِس منصوبے کے مطابق 9 دستوں پر مشتمل ایک خصوصی فوج جسے ''اے اسٹافل'' کا نام دیا گیا تھا، اٹلی یا روس سے لڑنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔

3 دستوں پر مشتمل ایک اور فوج جسے ''منی ملگرپ بلکان'' کا نام دیا گیا تھا، سربیا اور مونٹی نیگرو کے ساتھ لڑنے کے لیے مخصوص تھی۔ ایک اور فوج جو 4 دستوں پر مشتمل تھی اور اسے ''بی اسٹافل'' کا نام دیا گیا تھا، بطور محفوظ فوج منظم کی گئی تھی۔ اِس فوج کی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ اگر اٹلی یا روس سے جنگ نہ ہو تو سربیا پر پوری شدت سے حملہ کرنے والی فوج کی کمک کے طور پر استعمال کی جا سکے۔

1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی مجموعی فوج 4,44,000 تھی۔ اِس فوج کے پاس پرانی ساخت کی توڑے دار بندوقیں، توپیں اور رسل و ترسیل کے لیے پرانی ساخت کا ریلوے نظام موجود تھا۔ شاہی آرمی نے فضائیہ کی اہمیت کو نظرانداز کیا تھا۔ مزید برآں جیسا کہ پہلے ذکر کیا

گیا ہے کہ آسٹریا۔ ہنگری میں مجموعی آمدن کا بہت قلیل حصہ ہی دفاع کے لیے مختص کیا جاتا تھا اِس لیے بھی اِس ملک کے پاس صرف 35 طیارے اور ایک ایئر شپ تھی۔

آسٹریا۔ ہنگری کی بحریہ بھی اپنے دونوں دشمن ہمسایہ ممالک روس اور اٹلی سے چھوٹی تھی۔ یہ بھی دفاع کے لیے کم رقم اور دفاعی ترجیحات میں غیر اہم سمجھ کر بری طرح نظرانداز کی گئی تھی۔ 1914ء میں آسٹریا۔ ہنگری کی بحریہ کے پاس صرف 16 جنگی بحری جہاز، 5 کروزرز، 18 ڈیسٹرائرز اور 5 آبدوزیں تھیں۔ اِس کے مجموعی بحری جہازوں کا ٹن ماپ 3,72,000 تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے جدول نمبر 12)

ترکی

سلطنتِ دولتِ عثمانیہ 1299ء سے 1922ء تک اپنے جاہ وجلال کے جھنڈے نقشہ ہائے عالم پر گاڑھے رہی۔ اِس سلطنت کی عظمت وشان سولہویں اور سترھویں صدی میں اپنے عروج پر تھی جب اِس کی حدود جنوبی افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مغربی یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دولتِ عثمانیہ کی عظیم سلطنت 29 صوبوں اور 3 باجگوار ریاستوں پر مشتمل تھی۔ اس سلطنت کی ہیبت یورپ کے ایوانوں میں چھائی ہوئی تھی۔

سلطنتِ ترکی پر زوال کے آثار انیسویں صدی کے آغاز ہی سے دِکھائی دے رہے تھے۔ 1566ء کے بعد پے در پے 13 نااہل حکمران مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوئے اور سلطنتِ خداداد کی قسمت میں زوال ہی زوال تحریر کرتے چلے گئے۔ کئی مفتوح علاقے واپس چھین لیے گئے۔ اور سلطنت دِن بدن سکڑتی ہی چلی گئی۔

مرکزیت کے خاتمے کے ساتھ ہی مشرق ومغرب میں پھیلی ہوئی یہ سلطنت اپنی سیاسی یکجائی سے یکسر عاری ہوگئی اور دور دراز کے علاقوں میں غیر مسلم قوموں کے گروہوں کو بیرونی ہاتھوں نے اپنے مفادات کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران شیعہ سنی فسادات اور معاشی واقتصادی ابتری نے حکومت کی ساکھ کو انتہائی کمزور کر کے رکھ دیا تھا۔

1829ء میں جنگِ آزادیِ یونان کے بعد یونان نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں ملکی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے 1839ء میں محمود دوم نے ترکی میں جدت لانے کی کوشش کی اور "تنظیمات" کے نام سے یورپ کے جدید فکری، حکومتی، زراعتی اور قانونی طرز پر حکومت کرنی شروع کی۔ لیکن 1875ء میں سربیا، مونٹی نیگرو، بوسینیا، ولاچیا اور مالدووا میں قومیت پرستی کی تحریکوں نے سر اٹھایا اور بالآخر 8-1877ء کی جنگِ روس و ترکی کے بعد متذکرہ علاقوں کے باشندوں نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا حالانکہ یہ ریاستیں گزشتہ 6 عشروں سے نیم خودمختار حیثیت سے دولتِ عثمانیہ کے جھنڈے تلے متحد تھیں۔

اسی دوران سربیا کے ایک یہودی "یہودا سولومن الکلائی" فلسطینی علاقوں میں واپس چلا گیا جہاں اُس نے اسرائیلی آزادی کی تحریک شروع کر دی۔

1908ء میں "جوان ترک" تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اور تحریک کے مطالبات پورے نہ ہونے پر 1909ء میں سلطان عبدالحمید دوم کو حکومت سے بے دخل کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے بھائی محمود پنجم کو تخت نشین کر دیا گیا۔ جبکہ جوان ترک تحریک کے دوران آسٹریا۔ ہنگری نے باقاعدہ طور پر بوسینیا اور ہرزوگووینیا کے علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اٹلی اور ترکی کی جنگ میں لیبیا سے ہاتھ دھونے پڑے اور پھر جنگ ہائے بلکان میں بلکان کے بیشتر علاقے بھی ترک حکومت سے چھین لیے گئے۔

1908ء کے بعد مجلسِ اتحاد وعمل تشکیل دی گئی جس کے تحت ملک کے انتظامات چلائے جانے لگے۔ اِس مجلس نے سب سے پہلے ملک کی بحریہ کی قابلِ رحم حالتِ زار کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا گیا کہ عوام الناس سے چندہ حاصل کر کے بحریہ کی تشکیل و تکمیل کی جائے۔ اِس سلسلے میں 1910ء کے اوائل میں دو بڑے بڑے جدید طرز کے بحری جنگی جہازوں کی تیاری کے لیے برطانیہ کو رقوم دے دی گئیں۔

جہازوں کی تکمیل کے وقت جرمنی سے متوقع جنگ کے خطرے کے پیشِ نظر برطانیہ نے جنگِ عظیم اوّل کے شروع ہو جانے پر جہاز بجائے ترکی کے حوالے کرنے کے، اپنی بحریہ کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اِس طرح ترک عوام اور حکومت کو برطانوی حکومت کے اِس غیر

اخلاقی رویے سے شکایات پیدا ہوئیں دوسری طرف جرمنی کے قیصر ولیم دوم نے اِس صورت حال سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور ترکی کو دو جنگی بحری جہاز پیش کر دیے اور بدلے میں ترکی کو اپنے حلیف کے طور پر جنگ میں شریک کر لیا۔

ترکی فضائیہ دنیا کی چند قدیم ترین فضائی افواج میں سے ایک تھی۔ یہ جون 1909ء میں قائم کی گئی جب ترکی کی جانب سے دو (2) پائلٹ بین الاقوامی فضائی کانفرنس منعقدہ پیرس میں بھیجے گئے۔ 1910ء میں مزید فضائی آفیسر ٹریننگ کے لیے یورپ بھیجے گئے تاہم اِس بار ٹریننگ مکمل نہ ہو سکی اور آفیسرز رہائش اور دیگر مسائل کے باعث 1911ء میں ہی ترکی واپس چلے گئے۔ ترکی کے وزیرِ دفاع محمود سیو کیت پاشا نے ترکی فضائیہ کے قیام کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا اور اسی سال دو آفیسر فیسا اور یوسف کینان عالمی فضائی ٹیسٹ کے لیے روانہ کیے جنھوں اعلیٰ ترین نمبر حاصل کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔ 1912ء میں استنبول میں فضائی اکیڈمی قائم کی گئی اور اِس طرح جنگِ عظیم اوّل کی ایک اہم فضائیہ بن گئی۔

(ترک پائلٹ 1912ء میں)

ترکی جنگِ عظیم اوّل میں جنگ کے آغاز سے دو (2) ماہ بعد اکتوبر 1914ء میں شامل ہوا اور اِس کی جانب سے روس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا۔ اُس وقت ترکی کی کُل فوج 2,10,000 تھی۔

بلغاریہ

1878ء کی برلن کانفرنس کے نتیجہ میں عثمانی ترکی سے بلغاریہ کی سلطنت علیحدہ کردی گئی۔ بلغاریہ کی سلطنت کا انتظام وانصرام 1887ء سے 1908ء تک شہزادہ فرڈیننڈ کے ہاتھ رہا جو 1908ء کے آخر میں بادشاہ بن گیا۔ جبکہ 1914ء میں وزیرِ اعظم کے منصب پر واسیل راڈوس لاوو براجمان تھے۔ 1911ء میں بادشاہ فرڈیننڈ نے اپنے نام کے ساتھ زار کا خطاب لگانا شروع کردیا۔ قانونی دائرہ کار کے مطابق بادشاہت کرتے ہوئے فرڈیننڈ نے وزرائے اعظم کے ذریعے اپنے اختیارات کو خوب بڑھا لیا تھا۔ اِس کی بڑی وجہ وہاں کی سیاسی جماعتیں تھیں۔ 1896ء سے 1918ء تک بادشاہ فرڈیننڈ کا ذاتی حکمرانی کا دور کہلاتا ہے۔

ترکی کے زیرِ انتظام یورپی علاقوں بشمول میکدونیا کی عوام اپنے ہم خیال ممالک کی پسِ پردہ تحریک پر شورش کے لیے سر اُٹھا رہی تھی۔ میکدونیا کی عوام بلغاریہ سے ہم آہنگی رکھتی تھی۔ 1912ء میں بلغاریہ نے سربیا، مونٹی نیگرو اور یونان کے ساتھ مل کر ان علاقوں کے حصول کے لیے ترک حکومت سے جنگ کی اور ترک دستوں کو شکست دے دی۔ یہ جنگِ بلکان اوّل کہلاتی ہے جس میں بلغاریہ نے میکدونیا کے علاوہ تھریس اور سیلونیکا کے علاقے بھی اپنے قبضہ میں لے لیے۔ سربیا، مونٹی نیگرو اور یونان کو خاطر خواہ علاقے نہ ملنے پر انہوں نے آپس میں مل کر بلغاریہ کے خلاف اعلانِ جنگ کردیا۔ جنگِ بلکان دوم میں بلغاریہ کو شکست ہوئی اور میکدونیا کے علاقے اس سے چھین لیے گئے۔

1894ء میں وزیرِ اعظم سٹائلوو نے گھریلو صنعت کو فروغ دیا۔ درآمدی ٹیکس 8 فیصد سے بڑھا کر 14 فیصد کردیا جو بعد میں 1906ء میں 25 فیصد کردیا گیا۔ 1897ء میں چیمبر آف کامرس تشکیل دیا گیا اور تجارتی قوانین بنا کر نافذ العمل کیے گئے۔ 1896ء میں ریلوے ٹریک صرف 861 کلومیٹر پر محیط تھا جو 1914ء میں 2123 کلومیٹر تک وسیع کردیا گیا تھا۔ صرف بیس (20) سال کے عرصے میں فیکٹریوں اور ملازمین کی تعداد میں چار (4) گنا اضافہ ہوا۔

بلغاریہ کی آبادی 1914ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق 4.85 ملین تھی۔ اور

اِس کے دارالحکومت صوفیا کی آبادی 1,10,000 نفوس پر مشتمل تھی۔ ملک کے اعوام خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ اکثر و بیشتر گھریلو صنعت سے وابستہ تھے جبکہ فیکٹریوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملکی معیشت کو تقویت پہنچا رہی تھی۔

اگست 1914ء میں جنگِ عظیم اوّل کے شروع ہونے پر بلغاریہ جنگِ بلکان دوم کی شکست سے مکمل طور پر نہیں سنبھلا تھا۔ اور ابتدائی طور پر بلغاریہ نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ جنگِ عظیم کے دونوں فریق بلغاریہ کی مضبوط فوج اور انتہائی اہم جغرافیائی پوزیشن کے باعث اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ بلغاریہ کے قانون کے مطابق خارجہ حکمتِ عملی کا مکمل اختیار بادشاہ کے پاس تھا اور پارلیمنٹ اِس میں کوئی دخل نہیں دے سکتی تھی۔ جبکہ بادشاہ فرڈیننڈ جرمن نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود سختی سے غیر جانب دارانہ حکمتِ عملی پر کاربند رہا۔

1915ء کی گرمیوں میں جب کہ مرکزی قوتوں کو بہت زیادہ کامیابیاں حاصل ہو چکی تھیں بلغاریہ نے جنگ میں مرکزی قوتوں کی طرف سے اتحادی قوتوں کے خلاف شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ مرکزی قوتوں کی طرف سے بلغاریہ کے چھینے ہوئے تمام علاقوں کے واپس ملنے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔

تلخیص

یورپ کے مرکز میں واقع دو (2) بڑی قوتوں جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری چونکہ روس ،فرانس اور برطانیہ کے درمیان گھری ہوئی ہیں اور مرکز میں واقع ہیں لہٰذا جنگِ عظیم اوّل میں جرمنی، آسٹریا۔ ہنگری، بلغاریہ اور ترکی مرکزی قوتیں کہلاتے ہیں۔ 1914ء میں مرکزی قوتوں کی سیاسی، معاشی اور فوجی صلاحیت تیزی سے ترقی کر رہی تھی اور بالخصوص جرمنی کی آئے روز بڑھتی ہوئی طاقت اس وقت کی عالمی قوتوں روس، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کو بہت کھٹکتی تھی۔

دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ براعظم یورپ پر تقریباً جرمنی کا ہی کنٹرول تھا۔ خصوصاً 1880ء کے عشرے میں تو پورے یورپ کے فیصلے برلن سے ہوتے تھے اور بسمارک کی سفارت کاری کا عروج تھا۔ جس نے جرمن قوم کو متحد کرتے ہوئے متحدہ جرمنی کی بنیاد رکھنے کے ساتھ

ساتھ براعظم یورپ پر اکثریتی قوم جرمنوں کا سکہ رائج کرنے کے لیے دوررس اقدامات کیے۔

1890ء میں بسمارک کی ریٹائرمنٹ کے بعد جرمنی کی خارجہ پالیسی میں موجود ٹھہراؤ ختم ہو گیا اور توسیع پسندانہ حکمتِ عملی کا آغاز ہو گیا جس کے باعث اس کے تعلقات فرانس اور روس سے کشیدہ ہو گئے۔ نوآبادیات کے حصول کے سلسلہ میں ایک طاقتور بحریہ ضروری تھی اور بحریہ کو طاقتور بنانے پر برطانیہ جرمنی سے خفا تھا۔

جرمن بحریہ کا سربراہ ترپز جرمن بحریہ کو دنیا کی سب سے بہترین اور صفِ اوّل کی بحریہ کی حیثیت سے دیکھنے کا خواہاں تھا۔ اور اس مقصد کے حصول میں برطانیہ سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ کیونکہ برطانیہ اپنے پڑوس میں ایک مضبوط اور خود سے زیادہ طاقت ور بحریہ کا وجود اپنی سالمیت کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اِس طرح 1914ء میں یورپ کے حالات کشیدہ تھے اور اتحادی سفارت کاری کے باعث کوئی بھی بہانہ ایک بہت بڑی جنگ شروع ہونے کا موجب بن سکتا تھا۔

دوسری جانب آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری سلطنت آئے روز معاشی، معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور ہو رہی تھی۔ ملک میں 15 مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں اور مختلف قومیں اپنے اپنے قومی تشخص اور تہذیب و تمدن کو دیگر قوموں پر رائج کرنے کے لیے آپس میں لڑ جھگڑ رہی تھیں۔

عثمانی ترکوں کی سلطنت بھی انحطاط کا شکار تھی اور گزشتہ صدی سے اِس کی حدود میں کمی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بلغاریہ کی سلطنت جنگِ بلقان دوم کی شکست پر اپنے زخم چاٹ رہی تھی۔ مجموعی طور پر مرکزی قوتوں میں سے جرمنی ہی ایسا ملک تھا جو قدرے طاقتور تھا۔
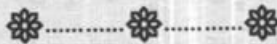
3

جنگ کے اسباب

انیسویں صدی میں برپا ہونے والے صنعتی انقلاب اور سیاسی نقطہِ نظر سے پیدا ہونے والی تبدیلی کے باعث بیسویں صدی کے آغاز پر اقوامِ یورپ تبدیلی کے مراحل سے دوچار تھیں بیشتر ممالک میں بادشاہت بیزاری کا رویہ پوری قوت سے اُٹھا تھا اور بادشاہت پسند عناصر سے برسرِ پیکار تھا۔ چند ممالک میں بادشاہت اور پارلیمانی نظام میں مفاہمت کی راہ نکال لی گئی تھی۔ اِس طرح یہ دور ایک طرف بادشاہی نظام کی بقا اور جمہوری و پارلیمانی نظام کے قیام کی جنگ کا دور ہے۔

یورپی اقوام عالمی منظرنامے میں سب سے اہم مقام پر فائز ہونے کے باعث باہمی انتشار اور مخاصمت کا شکار ہو چکی تھیں۔ اقتدار اور بالادستی کی دوڑ، قومی اور تہذیبی تضادات، لسانی تفریق، دیرینہ جھگڑے اور انتقامی سیاست اپنے عروج پر تھے۔ علاقائی توسیع پسندی کے رجحانات نے بیرونِ یورپ نوآبادیات کے قیام کا راستہ ہموار کیا تھا اور نوآبادیات میں توسیع کی خواہش ہر یورپی قوم کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔

نوآبادیات میں توسیع پر باہمی اختلافات اور جھگڑے بڑی بڑی جنگوں اور باہمی رقابتوں کا باعث بنتے تھے۔ اِسی رجحان نے بحری ترقی کی اہمیت کو اجاگر کیا اور بحری بالادستی کی

دوڑ کا آغاز ہوا۔ پہلے بحری بالادستی کے حامل ممالک کے لیے یہ امر نا قابلِ قبول تھا کہ کوئی دوسرا ملک اُن کی ہمسری کرے اور اُن کے کنٹرول والے علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرے۔ اِس طرح مخاصمت اور ناپسندیدگی کے جذبات پروان چڑھتے رہے اور سیاسی طور پر ایک ایسی فضا نے جنم لیا جہاں ممالک گروہ بندی میں جکڑے گئے۔

چند ممالک اتحاد کے بعد اپنے مخالفین کے لیے مزید خطرناک ہو گئے اور اس خطرے کے پیشِ نظر جواباً دوسری طرف بھی اُسی طرز کا اتحاد قائم ہو گیا۔ اِس طرح کی اتحادی سیاست میں کسی چنگاری کے بھڑک کر آگ بننے اور پورے براعظم کو اپنی لپیٹ میں لے لینے کا خدشہ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے منڈلا رہا تھا۔

ایسے نامساعد حالات میں ضرورت اِس امر کی تھی کہ اہلِ یورپ کے دانشمند اور سیاسی مفکرین انتہائی تحمل اور بردباری سے باہمی تنازعات کا حل بذریعہ سفارت کاری ڈھونڈتے اور جنگ کی تباہ کاریوں سے پورے براعظم کو محفوظ رکھتے۔ مگر اُس وقت کے حکمرانوں نے عجلت سے غیر ذمہ دارانہ فیصلے کیے اور بالآخر جنگ نے کروڑوں افراد کو نگل لیا۔ لاکھوں بے گھر، یتیم اور لاوارث ہو گئے۔ یورپ بھر کی معیشت مکمل طور پر تباہ و برباد ہو گئی۔

اِس باب میں ہم جنگِ عظیم اوّل کے اسباب پر تفصیلی بحث کریں گے۔

برّی، بحری اور فضائی بالادستی کی کوشش

صنعتی ترقی کے ساتھ ہی یورپی ممالک میں جدید اسلحہ سازی کا رجحان تیزی سے بڑھنے لگا۔ نئی نئی بندوقوں، مشین گنوں، توپوں اور ٹینکوں کی ایجاد پر جملہ یورپی ممالک بڑی خطیر رقوم خرچ کرنے لگے تھے۔ افواج کو متحرک اور ذرائع ابلاغ میں تیزی لانے کی کوششیں عروج پر تھیں۔ یورپ میں گزشتہ عرصہ میں ہونے والی جنگوں سے جنگی ماہرین نے اسباق سیکھے تھے اور بڑی عرق ریزی سے نئے اسلحہ سے فوج کی مطابقت کرنے کے لیے سعی کی جا رہی تھی۔ ریلوے جو اُس وقت تک رسل و ترسیل کا سب سے بڑا اور مؤثر ذریعہ تھا بتدریج فعال بنایا جا رہا تھا۔

جنگی ماہرین اِس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ صرف بہت بڑی فوج ہی فتح کی ضمانت نہیں

ہوتی بلکہ کامل فتح کے لیے جدید تکنیک اور اسلحہ، کامیاب اور برق رفتار ذرائع ابلاغ، فوج میں جذبہ حب الوطنی اور اطاعت، فوج کی تیز ترین اور برموقعہ حرکت، باہمی ربط، جنگی ساز و سامان اور غیر معمولی نوعیت کی جنگی منصوبہ سازی کے علاوہ ملکی وسائل، سیاسی و معاشرتی حالات، معاشی استحکام، سفارتی تعلقات اور لمبے عرصہ تک جنگ چھڑ جانے کی صورت میں مضبوط معاشی نیٹ ورک کی موجودگی مردِ میدان ہونے کے لیے ضروری عناصر ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ یورپ کے چیدہ چیدہ ممالک جن میں جرمنی، برطانیہ، روس اور فرانس قابلِ ذکر ہیں جدید اسلحہ اور تکنیک پر تحقیق کرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط معیشت کے قیام اور لمبے عرصے تک جنگ چھڑ جانے کی صورت میں فوج کی اسلحہ اور بارود کی ضرورت اور ملکی معیشت کے استحکام پر بھی بھرپور توجہ دے رہے تھے۔ جدید اسلحہ جو ابتدائی طور پر افواج کے لیے بحالتِ جنگ استعمال کرنا مشکل اور کٹھن تھا، استعمال کرنے کا عادی بنانے کے لیے مشقیں کی جارہی تھیں۔

نئے سے نئے اسلحہ کی دریافت پر تحقیق کے لیے ادارے قائم کیے گئے تھے۔ جو آئے روز اپنی تحقیقات کی رپورٹ اعلیٰ حکام کو پہنچاتے تھے۔ جبکہ اعلیٰ حکام غور و خوض کے بعد بڑے پیمانے پر صنعتی یونٹوں اور اسلحہ ساز فیکٹریوں کو جدید اسلحہ کی وافر فراہمی کے تخمینہ اور قابلِ عمل ہونے پر عرق ریزی کرنے کے بعد پیداواری مراحل میں داخلے کی ہدایات کررہے تھے۔

بری افواج کی ترقی اور جدیدیت کے مراحل کے ساتھ ہی بحری افواج اور اسلحہ کی ضرورت بھی دوچند ہو چکی تھی۔ یورپ کی اکثر بڑی قوتوں کی بیرونِ یورپ نوآبادیات تھیں جن سے مسلسل رابطے اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تجارتی جال کو برقرار رکھنے اور اس میں کسی قسم کی رخنہ اندازی سے بچنے کے لیے ایک مضبوط بحریہ کا ہونا از بس ضروری سمجھا جاتا تھا جو جدید تکنیک، اسلحہ، لڑاکا بحری جہازوں، آب دوزوں، کروزروں اور دیگر جنگی ضروریات سے لیس ہو۔

یہ اسلحہ کی دوڑ ہی کا نتیجہ تھا کہ یورپ کے چیدہ چیدہ ممالک فولادی لڑاکا بحری جہاز بنانے کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ سمندروں سے فضائی حملے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے ایئر شپس ایجاد ہو کر بڑے پیمانے پر زیرِ استعمال تھیں۔ یو بوٹس کی ٹیکنالوجی نے بحری جنگ کی ہیئت یکسر تبدیل کر دی تھی اور اب دشمن کے بحری جہازوں کی نظر میں آئے بغیر ہی انہیں نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔

تارپیڈو بھی اسی طرح کے میزائل تھے جو سمندر کے اندر ایک خاص زاویے سے دشمن کے بحری جہازوں کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اور اِس سب کچھ کے حصول کے لیے روز بروز بڑھتی ہوئی دوڑ میں برطانیہ، جرمنی، امریکہ اور فرانس سرِ فہرست تھے۔ اِس طرح یورپ کے اہم ممالک باہمی چپقلش کے باعث بحری جدت اور جدید بحری بیڑے کے حصول کے لیے ایک دوڑ میں شریک ہو چکے تھے۔

فرانس کی بحریہ 1914ء میں 1910ء کی نسبت دوگنی طاقتور ہو چکی تھی۔ جرمنی 1914ء پوری دنیا میں دوسری بڑی بحری قوت بن چکا تھا۔ امریکہ جنگِ سپین 1898ء کے بعد طاقتور بحریہ کی اہمیت سے آگاہ ہو چکا تھا اور بیسویں صدی کے آغاز سے ہی طاقتور بحریہ کے حصول کے لیے مصروفِ عمل تھا۔ برطانیہ کی شاہی بحریہ پہلے ہی پوری دنیا کی عظیم ترین بحریہ کی حیثیت سے اپنا آپ منوا چکی تھی۔ 1914ء میں برطانیہ کی بحری جہاز سازی کی صنعت اپنے عروج پر تھی۔

کچھ یہی حال فضائیہ کا بھی تھا گو فضائیہ کے بارے میں اُس وقت کے جرنیل کچھ خاص پُر امید نہیں تھے۔ تاہم فرانس، برطانیہ، جرمنی، روس، ترکی اور امریکہ تمام کے تمام ہی فضائی ذریعہ ترسیل کے لیے کوشاں تھے۔ مزید برآں جدید طیاروں کو میدانِ جنگ میں استعمال میں لانے پر نت نئے تجربات ہو رہے تھے۔ لڑاکا طیارے بنائے جا رہے تھے اور اُن کے ذریعے بارود اور جنگی تباہی پھیلانے والا مواد ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے علاوہ دشمن کے علاقوں پر پھینکنے کا اہتمام بھی کیا جا رہا تھا۔

طیاروں کی رفتار اور زیادہ سے زیادہ وزن اُٹھانے کی صلاحیت میں اضافہ کے لیے ہر ملک اپنی اپنی فضائی اکیڈمیوں میں تیاریاں کر رہا تھا۔ پائلٹس تیار کیے جا رہے تھے از طیاروں پر مشین گن نصب کر کے فضاء سے بری فوج پر حملہ کرنے کے لیے طیاروں کے نقشے میں مناسب تبدیلی کر دی گئی تھی۔ اب پائلٹ سے بھی آگے گن مین کو بٹھایا گیا تھا جہاں سے وہ بلا روک ٹوک مسلسل فائرنگ کر سکے۔

حاصلِ کلام یہ کہ جب کسی علاقے میں کوئی ایک ملک اسلحہ سازی میں بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے تو دیگر ممالک بھی از خود اسلحہ کی دوڑ میں شریک ہو جاتے ہیں کیونکہ پیچھے رہ جانے والے ممالک اپنی جغرافیائی اور قومی سرحدوں کی حفاظت میں ناکامی کے باعث اپنی حیثیت

کھو بیٹھتے ہیں اور بالآخر کار اپنے طاقتور ہمسایہ ممالک کے لیے تر نوالہ بنتے ہوئے صفحۂ ہستی سے مِٹ جاتے ہیں۔

یہی صورتِ حال 1914ء میں یورپ کی ہو چکی تھی۔ برطانیہ پوری دنیا میں سب سے طاقتور تصور ہوتا تھا۔ اور اسی طاقت وقوت کو جرمنی کی نئی ابھرنے والی عالمی قوت مسلسل چیلنج کر رہی تھی۔ دوسری طرف روس تیزی سے اپنی جغرافیائی حدود میں اضافہ کر رہا تھا، جو اِس کے ہمسایہ ممالک، خصوصاً جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کے لیے مسلسل خطرے کی گھنٹی تھی۔ اِس صورتِ حال میں ہر ملک اسلحہ اور جنگی ساز وسامان کی تیاری میں سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

معاشی واقتصادی کامیابی کی خواہش

ایڈم سمتھ کی کتاب ''Welth of Nations'' نے اقوامِ یورپ میں اک نئی سوچ کو جنم دیا تھا جس کے بعد قوموں کی معاشی ترقی کے لیے باقاعدہ تحقیق کی جانے لگی تھی اور اقوامِ یورپ معاشی وسائل اور ذرائع کے حصول کے لیے ایک نئے طریقہ سے مصروفِ عمل ہو گئے تھے۔ بارٹر سسٹم کی جگہ بین الاقوامی تجارت ومعیشت نے لے لی تھی۔

قومیں اپنی تمام ضرورتیں اپنے ہی وسائل سے پوری کرنے کی بجائے ایک یا چند ایک پیداواری صلاحیتوں میں تخصص کی خواہاں نظر آتی تھیں اور دیگر ضروریات کے لیے عالمی منڈی کی طرف رجوع کرنے لگی تھیں۔ برطانوی استعمار کے پھیلاؤ کی وجہ بھی یہی نقطۂ نظر تھا۔ پہلے پہل تو وہ تجارت کے عمومی مقاصد کے لیے یورپ سے باہر نکلے اور ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا وغیرہ تک جا پہنچے اور وہاں کے سادہ لوح عوام کو اپنا محکوم بنالیا۔

یورپ کی تمام اقوام تجارت ومعاشی ترقی اور خوشحالی کے لیے یورپ کی تنگ سرزمین سے نکل کھڑی ہوئی تھیں اور اِس طرح عالمی کھوج اور عالمی پیداواری ذرائع کی تحقیق اور اُن سے استفادہ کی سرتوڑ کوششیں جاری تھیں۔ ہر ملک اپنی بیرونِ یورپ تجارت کے لیے بحریہ کی تشکیل کے لیے کوشاں تھا۔

جس ملک کے لیے یہ آسانی سے ممکن نہ تھا تو وہ دیگر ممالک کے بحری جہازوں کے

ذریعے اپنے تجارتی کاروان اور قافلے روانہ کررہا تھا۔ بین الاقوامی تجارت کا رجحان نیا نیا قائم ہوا تھا۔ جس کے تحت ممالک دنیا بھر کے دور دراز علاقوں کی پیداوار سے اپنے ملک کی ضرورت کے مطابق اجناسِ خورد و نوش اور دیگر اشیاءِ ضرورت خرید کرتے اور بدلے میں اپنے ممالک کی تیار کردہ اجناس و اشیاء انہیں فروخت کرتے یا اُن سے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرتے۔

یورپ کی باہمی جنگوں سے یورپی ماہرین و دانشوروں کو اِس بات کا مکمل طور پر احساس ہو چکا تھا کہ جنگ لڑنے کے لیے کسی ملک کی مضبوط معیشت اور مستحکم سفارتی تعلقات انتہائی ضروری ہیں۔ اپنے اردگرد منڈلانے والے خطرات کے پیشِ نظر ہر ملک معاشی و اقتصادی طور پر دیگر ہمسایہ ممالک سے سبقت لے جانے کا خواہاں نظر آتا تھا۔ کیونکہ یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ معاشی طور پر مستحکم ملک اپنے مدِ مقابل معاشی طور پر غیر مستحکم یا کم مستحکم ملک پر فوقیت رکھتا ہے۔ اِس طرح معاشی سبقت و استحکام دوسروں کے کمزور اور اپنے ملک کے مضبوط ہونے کی علامت تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز پر اقوامِ یورپ معاشی کامیابی کی خواہش میں ایک دوسرے سے مخاصمت کے جذبے سے سرشار تھیں۔ نہر سویز اِس لیے انتہائی اہم مسئلہ بن چکی تھی کہ یہ ایشیائی ممالک سے تجارت کے لیے یورپ کا سب سے مختصر ترین راستہ تھی اور ہر یورپی ملک اِس پر اپنی بالادستی قائم کرکے دیگر ممالک کے گزرنے والے بحری جہازوں سے محصول حاصل کرسکتا تھا۔

برطانوی شاہی بحریہ اپنی بلند شان و شوکت اور وسعت کے باعث عالمی تجارت کے تمام بہترین راستوں پر قابض و حاکم تھی۔ جبکہ دیگر ممالک اِس بالادستی سے سخت نالاں تھے۔ کیونکہ اِس طرح اپنی تجارت سے ہونے والی آمدن کا کچھ حصہ برطانیہ کو پیش کرنے کے پابند تھے۔ جو برطانوی معیشت کے لیے بہتر اور اُن ممالک کی معیشت کے لیے سخت نقصان دہ تھا۔

فولاد سازی، صنعت سازی، کیمیائی مصنوعات کی تیاری، برقی و معدنی ذرائع سے توانائی کا حصول اور زرعی ترقی کے لیے ہر ملک اپنی اپنی سطح پر کوششوں میں مصروف تھا۔ اِن مفادات کے حصول کے لیے یورپی ممالک اپنی تجارت کا دائرہ کار بڑھانے اور ایسے ممالک جہاں سے اُن کی ضروریات پوری ہوسکیں، پر انحصار کرنے پر مجبور تھے۔ اِس طرح ملکی مفادات کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر بھی انحصار کیا جاتا تھا۔ زیادہ طاقتور ممالک اِس انحصار سے ناجائز فوائد بھی حاصل کرتے۔ اور مفادات کے حصول میں پیدا ہونے والی رکاوٹیں باہمی رنجش و تعصب

کے جذبات کی آبیاری کا ذریعہ بن کر یورپی ممالک کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑا کرتیں۔

جرمنی عالمی تجارت میں سبقت لے جانے کی خواہش میں جدید ترین بحری بیڑے کے قیام میں مصروفِ عمل تھا۔ دوسری طرف جرمنی کے بحری بیڑے کے طاقتور ہونے سے برطانوی سمندری اجارہ داری کو شدید خطرہ تھا۔ اور اِسی تشویش اور تعصب نے برطانیہ کو جرمنی کے خلاف میدانِ کارزار سجانے اور فرانس اور روس کے ساتھ مفادات کے چھوٹے ٹکراؤ کے باوجود ہم صف ہونے پر آمادہ کیا۔ یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ برطانیہ، فرانس اور روس ایک دوسرے کے خیر خواہ تھے۔ بلکہ اپنے اردگرد ایک ابھرتی ہوئی معاشی واقتصادی قوت کو دیکھ کر یہ ممالک سخت پریشان ہو گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے اپنی باہمی مخالفتوں کو بھول کر متحد ہو چکے تھے۔

فرانس بیرونی سرمائے کی فراوانی کے باعث دیگر ممالک کو سودی قرضوں کی فراہمی پر اپنی معیشت کو استوار کر رہا تھا۔ روس صنعتی ترقی اور فولاد سازی کے لیے کوشاں نظر آتا تھا۔ جرمنی فولاد سازی، کیمیائی مصنوعات کی تیاری، بھاری مشینری کی تیاری اور برقی پیداوار میں اضافے کے اسباب پر غور کر رہا تھا۔ برطانیہ عالمی سوداگر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ یہ سب اقدامات معاشی واقتصادی استحکام وترقی کے لیے رُوبہ عمل لائے جا رہے تھے۔ اور اِن اقدامات کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے پر کڑی نظر بھی رکھی جا رہی تھی تاکہ کسی مقابل کے زیادہ طاقتور ہو جانے کی صورت میں حصولِ طاقت کے جملہ ذرائع سے زیادہ سے زیادہ استفادی کیا جا سکے۔

یورپی ممالک کے مابین ہونے والی جنگیں گزشتہ صدی کے پہلے نصف کی جنگوں کی طرح صرف عددی وعلاقائی برتری کے لیے نہیں لڑی جاتی تھیں بلکہ یہ جنگیں عالمی منڈیوں، پیداواری علاقوں اور توسیعی مقاصد کے حصول کے لیے لڑی جا رہی تھیں اور اِن سب مقاصد کے حصول سے ایک ہی بنیادی مقصد حاصل ہو سکتا تھا اور وہ تھا معاشی بالادستی!

دیرینہ جنگوں سے پیدا ہونے والی رقابتیں

تاریخِ یورپ کے مطالعہ سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ یورپ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے باہمی جنگوں کی لپیٹ میں رہا ہے۔ ان جنگوں میں اُس وقت وقتی طور پر کمی آئی جب اہلِ یورپ

نے طاقتی عدمِ توازن اور کمزوری کے باعث حالات کو جوں کا توں رہنے دینے پر سمجھوتہ کرلیا۔ بسمارک اپنی ساحرانہ سفارت کاری سے یورپ کی بساط برلن میں بچھائے بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کے ہمسایہ ممالک اس سے رقابت ومخاصمت کے باوجود اُس کی طاقت سے مرعوب، اپنے جذبات چُھپائے بیٹھے تھے۔

جنگِ کریمین (56-1854) نے روس کی حالتِ زار کو اقوامِ عالم پر فاش کردیا تھا اور روس کے بڑھے ہوئے جغرافیہ و بڑی فوج کا دبدبہ خاک میں مل چکا تھا۔ دوسری طرف اتحادی ممالک جن میں فرانس اور برطانیہ اہم ہیں، اپنی حالتِ زار کے باعث پریشان کُن صورتِ حال سے دوچار تھے۔ ترکی کی بحریہ روس کے ہاتھوں بُری طرح تباہ ہوچکی تھی۔ تاہم یہ امر واقع ہے کہ روس جنگِ کریمین کے بعد اگلے پچاس سال تک اس کے اثرات اور نقصانات کی تلافی کرنے کے قابل ہوسکتا تھا۔

فرانس پروشیاء (جو بعد میں متحدہ جرمنی سلطنت بنا) کے ہاتھوں 1870ء میں شکستِ فاش کھا چکا تھا اور نپولین سوم قید کرلیا گیا۔ فرانس کے علاقے الساس اور لورین جرمنی کے قبضے میں آگئے۔ فرانسیسیوں کے لیے شکست اور پھر الساس و لورین کے علاقوں کے چھن جانے کا غم ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ شکست کے بعد سے ہی اپنے علاقے واپس لینے اور شکست کی ذلت کا انتقام لینے کے لیے خواب دیکھ رہے تھے اور اِس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے روس اور برطانیہ کو یہ احساس شدت سے دلا رہے تھے کہ یورپ میں جرمنی ہی اُن کے مفاد کا مخالف ہے جس کو قدموں تلے روندنے کے بعد ہی یورپ اور اقوامِ عالم میں مکمل بالادستی حاصل ہوسکتی ہے۔

99-1898ء میں دریائے نیل کے بالائی حصے پر قبضے کے لیے فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے مدِمقابل صف آراء ہوئے اور فرانس کو ہزیمت اُٹھانا پڑی۔ چونکہ یہ محدود جنگ تھی اِس لیے اس کے اثرات کچھ خاص گہرے نہ تھے تاہم اہلِ فرانس بیرونِ یورپ اپنے مفادات کو یورپ کے اندر کے مفادات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے۔

جنوبی یورپ میں سربیا، بلغاریہ، مونٹی نیگرو اور یونان جنگ بلکان اوّل میں ترکی سے برسرِپیکار ہوئے اور ترکی کے زیرِ قبضہ میکدونیا، تھریس اور سیلونیکا کے علاقے چھڑانے میں کامیاب ہوگئے۔ تاہم مالِ غنیمت کی تقسیم پر اوّل الذکر اتحادی ممالک آپس میں لڑ پڑے۔ جنگِ

بلقان دوم میں بلغاریہ کے خلاف سربیا، مونٹی نیگرو اور یونان نے اعلانِ جنگ کر دیا اور بلغاریہ سے مقبوضہ میکڈونیا کے تمام علاقے چھین لیے۔

اِن جنگوں نے بلقانی اور جنوبی یورپ کے ممالک میں باہمی نفرت اور رقابت کی فضا پیدا کر دی۔ ترکی اور بلغاریہ مجموعی طور پر نقصان زدہ ہونے کے باعث انتقامی جذبات سے لبریز ہو گئے۔ اور موقعہ کی تاک میں بیٹھ گئے کہ کب اپنے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کے لیے فوجوں کو قابض ممالک پر حملے کا حکم دیں۔

آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری سلطنت کے زیرِ قبضہ اٹلی کے علاقوں پر آسٹریا۔ ہنگری کی جانب سے سخت پالیسیوں کے باعث اٹلی کی جانب سے ردِ عمل اور احتجاج کا اظہار ہوتا تھا۔ اِس پر آسٹریا۔ ہنگری کے جرنیل فرنز کونیریڈ کی جانب سے وقتاً فوقتاً اٹلی سے جنگ کی دھمکیوں اور چھیڑ چھاڑ کے باعث اٹلی اور آسٹریا۔ ہنگری کے تعلقات میں سرد مہری آ چکی تھی حالانکہ ہر دو ممالک اتحادِ ثلاثہ کے معاہدے کے پابند تھے۔

جنگِ عظیم اوّل کے آغاز کے لیے چنگاری کا کام کرنے والا واقعہ؛ آسٹریا۔ ہنگری کے ولی عہد آرک ڈیوک فرینز فرڈیننڈ اور اُس کی بیوی صوفیہ کے سربیا کے شہر سراجیو میں مورخہ 28 جون 1914ء کو گیوریلو پرنسپ کے ہاتھوں قتل کی تحقیقات سے بھی یہ ثابت ہو گیا تھا کہ گیوریلو پرنسپ نے سربیائی حکومت کے ایماء پر یہ قتل کیا تھا۔ یہ عیاں کرنے کے لیے کافی ہے کہ یورپی ممالک باہمی رنجشوں اور شدید ترین دشمنیوں کا شکار تھے۔ اور ذرا سا موقعہ ملنے پر اپنی پرانی رنجشوں کی تلافی کرنے کو تیار تھے۔

قومی تعصبات

یورپ پچیس (25) سے زائد اقوام کا براعظم ہے۔ 1914ء میں ہر قوم اپنے قومی تشخص، زبان، رہن سہن، انداز و اطوار اور رسوم و روایات میں دوسری قوموں سے مختلف و منفرد ہونے کے باعث اپنی جداگانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں اور دوسروں سے مخاصمت کے جذبے سے سرشار تھی۔ اِن اقوام میں جرمن، چیک، ہنگری، پولش، فرانسیسی، برطانوی، سربیائی،

کوشیائی، پرتگالی، سپینش، غلام اور رومانوی قابلِ ذکر ہیں۔ اِن تمام اقوام کی زبانیں مختلف تھیں۔ اور ہر قوم دوسری زبان کے فوقیت لے جانے پر سخت نالاں ہوتی اور فسادات پھوٹ پڑتے۔

آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری سلطنت 15 مختلف زبانیں بولنے والی اقوام پر مشتمل تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت کو آئے روز فسادات اور لسانی و قومی مسائل سے دوچار رہنا پڑتا تھا۔ مزید براں آسٹریا۔ ہنگری کی حکومت کی جانب سے سربیا کے خلاف اعلانِ جنگ کے احکامات اپنی فوج کو 15 مختلف زبانوں میں دیے گئے۔

فرانس کے خلاف پروشیاء کی کامیابی (1867ء) کے زخم فرانسیسی قوم کے دلوں پر ہرے بھرے تھے۔ اور وہ ہر دیگر قوم کو اپنے زیرِ نگیں بنانے کے لیے منصوبہ سازی کر رہے تھے۔ جبکہ دوسری طرف جرمنوں کو اپنی اعلیٰ تہذیب و تمدن اور بلند قومی اقدار کے احساس نے دیگر اقوام پر اُن کی بالادستی کے قیام کی راہ پر گامزن کیا۔ برطانوی شہنشاہیت ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور امریکہ میں پھیلی ہوئی اپنی مقبوضات (نوآبادیات) کے باعث اپنی قوم کے سب سے اعلیٰ وارفع ہونے اور دیگر تمام قوموں کے ہیچ ہونے کے کامل یقین سے مرصع تھی۔ اسے دنیا کی کوئی دوسری قوم اپنی ہم پلہ نہ لگتی تھی۔

گوروں کے اندرناک پلک کے امتیاز اور زبان و مکاں کے فرق نے پہاڑوں جیسے اختلافات پیدا کر دیے تھے اور بالآخر یہ اختلافات اِس قدر بڑھ گئے کہ ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرنا انتہائی مشکل ہو گیا۔ یورپ کی تاریخ باہمی جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ انیسویں صدی یورپی تنازعات اور قومی منافرت کی صدی تھی۔ جس میں پورا یورپ اکثر و بیشتر قومی بنیادوں پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہا تھا۔ اب ایک عارضی سکوت کے بعد بیسویں صدی آتش فشاں کے اُس دھانے پر کھڑی تھی جہاں سے لاوا کسی بھی وقت پھوٹ سکتا تھا۔

سربیا میں ہونے والے آسٹریا۔ ہنگری کے ولی عہد اور اُس کی اہلیہ کا سیاسی قتل جو جنگِ عظیم اوّل کا بظاہر محرک و وجہ بنا، بھی ایک قومی منافرت اور تعصب کا کھلا مظاہرہ تھا جسے کے تحت سربیا نے آسٹریا۔ ہنگری کے زیرِ تسلط سربیائی باشندوں اور غلاموں کے ساتھ حکومت کے ناروا سلوک کا انتقام لیا اور پورے یورپ بلکہ پوری دنیا کو ایک عظیم جنگ کی لپیٹ میں دے دیا۔

اتحادی سیاست

اتحادی سیاست جہاں متحد ممالک کو بہت سے تحفظات فراہم کرتی ہے وہیں دیگر ہم پلہ ممالک کی علاقائی سالمیت کے لیے لٹکتی ہوئی تلوار کی مانند ہوتی ہے۔ جس سے بچاؤ کے لیے مخالف ممالک اپنے گروہ کو تشکیل دیتے ہیں اور اِس طرح خطرات کی نوعیت ایک یا دو ممالک سے بڑھ کر کئی ممالک بلکہ براعظم اور بعض اوقات پوری دنیا تک پھیل جاتی ہے۔

پروشیاء کے صدر بسمارک کی سفارتی کوششوں سے متحدہ جرمن ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے بادشاہ (قیصر) کے لیے ولیم دوم کو چنا گیا۔ اور متحدہ جرمنی کی صدارت بسمارک کے پاس رہی۔ بسمارک نے توسیع پسندانہ سوچ کے برعکس جرمنی کے ایک مکمل سلطنت ہونے کی حیثیت سے اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کی پالیسی پر عمل درآمد شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ آسٹریا۔ ہنگری اور اٹلی سے اتحادِ ثلاثہ کا خفیہ معاہدہ کرلیا۔ بسمارک چھوٹی چھوٹی علاقائی اور محدود جنگوں کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا۔ اس کے لیے بیرونِ یورپ نوآبادیاتی مفادات اِس قدر اہم نہ تھے کہ اُن کے لیے وسیع وعریض جنگوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

ایک طرف تو بسمارک اتحادِ ثلاثہ کے بندھن میں بندھا ہوا تھا، دوسری طرف روس کے ساتھ بھی دفاعی معاہدات چل رہے تھے۔ اِس طرح بسمارک کا دور سفارتی لحاظ سے یورپ کے لیے محفوظ دور تھا۔ اس دور میں برلن پورے یورپ کے اہم فیصلے کرتا اور دیگر یورپی ممالک کو اپنے ہمراہ لیے چل رہا تھا۔ 1890ء میں بسمارک کو صدارت سے الگ کردینے کے بعد جرمنی کی خارجہ پالیسی بے سمتی کا شکار ہوئی۔ اگلے ہی سال روس کی جانب سے دفاعی معاہدے کی توسیع کے لیے آنے والے وفد کو اتحادِ ثلاثہ کا معاہدہ دکھا کر مزید معاہدہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا گیا کہ روس کے ساتھ دفاعی معاہدہ آسٹریا۔ ہنگری کے ساتھ اتحادِ ثلاثہ سے متصادم ہونے کے باعث مزید تجدید کے قابل نہ ہے۔

جرمنی کے اِس یوٹرن نے روس کو فرانس کے قریب ترین کردیا اور بالآخر آخرالذکر دو

ممالک 1894ء میں اتحادِ ثلاثہ کے مقابلے میں باہمی اتحاد کے معاہدے میں بندھ گئے۔ فرانس علاقے میں برطانوی اثر ورسوخ سے آگاہ تھا اور خاص کر برطانوی شاہی بحریہ کی شان وشوکت سے آگاہ تھا۔ اس لیے پیرس لندن کو مسلسل برلن کے خطرے سے آگاہ اور باہمی دوستی کے معاہدے میں شرکت کی دعوت دے رہا تھا۔

قیصر ولیم دوم توسیع پسندانہ سوچ کا مالک تھا اور نوآبادیاتی توسیع کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بسمارک کو فارغ کیا گیا تھا۔ جرمنی بحریہ کے ایڈمرل ٹرپز نے جرمن بحریہ کو تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن کرنا شروع کیا تو لندن کے برلن سے متعلق خدشات جن کو پیرس ہوا دے رہا تھا، بھڑک اُٹھے اور بالآخر 1905ء میں روس اور فرانس کے باہمی دوستی اور دفاع کے معاہدے میں برطانیہ بھی شامل ہو گیا۔

اِس صورتِ حال میں کسی بھی ملک کی معمولی غلطی ہر دو فریقین کو جنگ کے اندھیروں میں دھکیل سکتی تھی۔ اِس پر مزید یہ کہ کئی چھوٹے یورپی ممالک سے برطانیہ، روس اور فرانس نے اُن پر حملے کی صورت میں دفاع میں تعاون و مدد دینے کے معاہدے کر رکھے تھے۔ مثال کے طور پر سربیا کے دفاع کا معاہدہ روس سے تھا، جبکہ بیلجیم کے دفاع کی ذمہ داری برطانیہ کے سر تھی۔

یہ اتحادی سیاست جملہ ممالک کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور باہمی مفادات پر منحصر تھی۔ جس میں بہرحال کوئی بھی ذاتی دوست یا دشمن نہ تھا۔ گو کہ بین الاقوامی تعلقات میں یہ بنیادی حکمتِ عملی ہوتی ہے کہ کوئی بھی ذاتی دوست یا دشمن نہیں ہے بلکہ قومی مفاد ہی کی بنیاد پر دوستی اور دشمنی استوار کی جاتی ہے۔ مگر اِس حکمتِ عملی کے ساتھ ایک باقاعدہ سانچہ سازی کی جاتی ہے جس کے خطوط پر دوستی اور دشمنی کے جاری معیار پرکھے اور بوقتِ ضرورت بتدریج تبدیل کیے جاتے ہیں۔

یورپ کی اُس وقت کی اتحادی سیاست کسی خاص پیرائے سے یکسر خالی نظر آتی ہے۔ اِس کی مثال اٹلی اور رومانیہ ہیں۔ ہر دو ممالک اتحادِ ثلاثہ کے ارکان ہونے کے باوجود اپنے اتحادیوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ کیونکہ اتحادِ ثلاثہ قائم کر لینے کے باوجود اتحاد میں شامل ممالک ایک دوسرے سے رنجش و دشمنی کے جذبات سے بھرے پڑے تھے۔ اور اپنے اپنے وقتی

مفاد کی تسکین کے لیے جس طرح اچانک ایک دوسرے کے نزدیک آ کر اتحاد میں بندھ گئے تھے اُسی طرح خاموشی سے اتحاد سے علیحدہ بھی ہو گئے تھے۔

سربراہوں کا غیر ذمہ دارانہ رویہ

1870ء کا عشرہ یورپ کے اُفق پر سیاسی استحکام اور غیر جارحانہ حکمتِ عملی کو پروان چڑھانے کے دور کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس عشرے میں یورپی ممالک کے سربراہان انتہائی تدبر اور ذمہ دارانہ انداز سے باہمی مسائل کے حل تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اِس کی بڑی وجہ 1860ء کے عشرے میں ہونے والی خونریز جنگیں اور اُن کے نتیجے میں ہونے والی تباہی تھی۔

امن و امان کے زیادہ عرصہ برقرار رہنے پر اہلِ یورپ کی جنگجویانہ فطرت پھر سے پھڑک رہی تھی۔ اہلِ دانش و اصحابِ فہم و فراست جن کو جنگ کی کلفتوں کے باعث حکمران طبقے نے چار و ناچار برداشت کر لیا تھا آہستہ آہستہ جلد باز اور کم فہم حکمرانوں کی نظر میں کھٹکنے لگے۔ اِس طرح کچھ کو اقتدار سے فارغ کر دیا گیا اور کچھ موت کی آغوش میں چلے گئے۔

گزشتہ صفحات میں یورپ کے جن حالات کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں وہ اِس بات کے غماز ہیں کہ یورپی ممالک کے سربراہان نے دانشمندی کی بجائے انتہائی سطحی اندازِ فکر اختیار کرتے ہوئے حالات میں سدھار لانے کی بجائے روز بروز بگڑتے حالات کے لیے راہ ہموار کی۔ بڑی اور خونریز جنگوں کو کافی وقت گزر جانے کے باعث اُن کے ثرات و نتائج کی تلخی بھی ان حکمرانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ وقتی مفادات کے حصول کے درپے ہو کر عدم تحفظ اور جارحانہ رویہ پر عمل پیرا ہو چکے تھے۔

دانشمندانہ رویہ سے مراد بزدلی ہرگز نہیں ہوتا۔ لیکن یہ امر قابلِ غور ہے کہ یک طرفہ مصالحانہ رویہ اختیار کرنے پر مخالفین کمزوری کا گمان کرنے لگتے ہیں اور اپنے مطالبات/شرائط بڑھا دیتے ہیں جن کو برداشت کرنا روز بروز مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم عرصہ زیرِ غور کے دوران کسی بھی یورپی حکمران کی جانب سے ذمہ دارانہ رویہ قرطاسِ تاریخ پر نہیں ملتا۔

1891ء سے جرمنی کی جانب سے غیر ذمہ دارانہ رویے کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو یہ ملک روس اور فرانس سے دشمنی مول لیے بیٹھا تھا، جبکہ دوسری طرف اِس کی بحریہ کے آفیسران برطانیہ سے جنگ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ فرانس فوجی اور عملی طور پر غیر فعال ہو چکا تھا اور جرمنی جیسے مضبوط ملک کے لیے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔

فرانس زیادہ سے زیادہ اپنے چھنے ہوئے علاقے الساس اور لورین کی واپسی کے خواب وخیال میں مصروف تھا اور اِس بات سے پیرس اچھی طرح واقف تھا کہ وہ تنہا جرمنی سے لڑنے کے قابل نہیں۔ اسی لیے وہ روس سے مل کر اپنے خواب کی تعبیر کرنا چاہتا تھا۔ اس صورتِ حال میں جرمنی کے چیف آف سٹاف کا قیصر ولیم کی خواہش پر شیلفن پلان بنانا جس میں فرانس پر حملہ اور قبضے کی منصوبہ سازی کی گئی تھی، سراسر جارحانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویہ تھا۔

روس جو کہ جنگِ کریمین کے زخم چاٹنے کے بعد گزشتہ نصف صدی سے سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا بہر حال اپنے وسیع ترین رقبے اور بہت بڑی فوج کی وجہ سے اب بھی ایک خطرناک ملک تھا۔ روس کی طرف سے دوستی اور معاہدہ دفاع کے لیے جرمنی آنے والے وفد کو معاہدہ کی تجدید کے موقع پر معاہدہ سے دستبرداری، دشمنی کے پیغام کے سوا کچھ بھی نہ تھا جو نہایت نامناسب رویہ تھا۔

ولیم دوم کی توسیع پسندانہ سوچ اور حکمتِ عملی بھی دیگر عالمی قوتوں کی نظر میں کھٹک رہی تھی اور اُن کی جانب سے ردِ عمل کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔ پھر اتحادی سیاست کے کھلے اقدامات کرنے کے بعد اپنے اتحادی ممالک کے معاملات سے چشم پوشی کر لینا اور اُن کی دوستی اور دشمنی سے بے نیاز ہو کر اپنی من مانی کرنا بھی نامناسب رویہ تھا۔

جرمنی کو چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے اردگرد دشمنوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر اپنے دوستوں سے تعلقات میں سرد مہری نہ آنے دیتا بلکہ گاہے بگاہے دوستوں کے جذبات کی حدت کو چیک کرتا رہتا تاکہ کسی قسم کی کٹھن گھڑی میں اُن کی جانب سے کوئی مایوسی نہ ہو۔ مگر ولیم دوم اپنے نوآبادیاتی ایجنڈے اور عالمی قوت بننے کے نشے میں غیر ذمہ دارانہ رویہ پر کاربند رہا۔

دوسری طرف آسٹریا۔ ہنگری اپنے اندرونی خلفشار، سیاسی عدم استحکام، معاشی

پسماندگی اور دفاعی کمزوریوں کے باوجود اپنے تمام ہمسایہ ممالک سے چھیڑ چھاڑ کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ یہاں تک کہ اٹلی جو اتحادِ ثلاثہ کا تیسرا رکن تھا، بھی آسٹریا۔ ہنگری کے شہزادے اور چیف آف سٹاف فرنز کونیریڈ کی دھمکیوں اور چھیڑ چھاڑ سے تنگ آچکا تھا۔ گو آسٹریا۔ ہنگری کے چانسلر اور بادشاہ کی جانب سے کونیریڈ کی دھمکیوں کی مزمت آتی تھی مگر مزمت کے بعد پھر سے دھمکی آمیز بیان آنے سے مزمت کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح رومانیہ بھی آسٹریا۔ ہنگری کے زیرِ انتظام رومانوی قوم کے علاقوں میں اُن سے امتیازی سلوک روا رکھنے پر سخت نالاں تھا۔ سربیا سے بھی تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ جبکہ آسٹریا۔ ہنگری کے حکمران اچھی طرح جانتے تھے کہ سربیا کی پشت پناہی روس کرے گا۔

اُس وقت یورپ کی مخدوش فضاء میں وہاں کے حکمرانوں کی جانب سے دانشمندانہ اور عقل مندانہ رویے کی کمی شدت سے تاریخ کے طالب علم کو محسوس ہوتی ہے۔ باہمی رقابتوں، قومی تعصبات اور معاشی و اقتصادی بالادستی کی دوڑ میں نتائج سے بے پرواہ ہو کر کود جانا ہی وہ غیر ذمہ دارانہ رویے ہیں جو اہلِ ارباب کی جانب سے ظاہر ہوئے اور جنگِ عظیم اوّل کے اسباب بنے۔

صنعتی انقلاب اور قدامت پرستی

انیسویں صدی کے آغاز میں صنعتی انقلاب کے اثرات ترقی یافتہ اقوام پر منعکس ہو رہے تھے۔ ان اثرات کے نتائج واضح ہونے پر اہلِ یورپ کے مفکرین اور دانشور حضرات سابقہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، جغرافیائی، فوجی اور قومی اندازِ فکر سے نکل کر نئے افق کے نئے انداز و اطوار سے آشنا ہو رہے تھے۔ لیکن ابھی بھی بہت سے اہلِ علم و دانش ایسے تھے جو اپنی سابقہ روایات سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بادشاہانہ نظام کے خواہاں تھے اور اِسی نظام میں ترقی کے خواہش مند تھے۔ جدید پارلیمانی طرزِ حکومت کی قباحتیں اُن کی سوچ کی تبدیلی کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔

دوسری طرف جدت پسند عناصر یورپ کی بڑی بڑی قوتوں پر چھا چکے تھے۔ یہاں تک

کہ برطانیہ اور فرانس کے سیاسی زعماء نے بھی بادشاہت اور پارلیمانی نظام کے درمیان کی راہ نکال لی تھی اور ہر دو اداروں میں اختیارات کی تقسیم کے مسائل آئے روز درپیش تھے۔ اِس طرح نہ ہی مکمل طور پر بادشاہت باقی رہی تھی اور نہ ہی جمہوری پارلیمانی نظام کی وضع و قطع ابھر کر سامنے آئے تھی۔ مفادات اور اختیارات کی تقسیم پر منافرتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ یورپ کے بیشتر ممالک میں فسادات چھڑ چکے تھے۔ اور مسلح جدوجہد کا آغاز ہو چکا تھا۔

کارل مارکس کے نظریہ کو بھی بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور مارکسی اپنے اپنے کمیونز بنا کر جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے مطالبات منوانے کے انوکھے طریقے شدت پسندی کی انتہا پر تھے۔ ہر کارخانہ، فرم، مارکیٹ، زمین اور ادارہ غرض ہر چیز ملکیتِ سرکار تھی۔ انسان انسان نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ صرف ایک مشین کی طرح کی کوئی چیز سمجھا جاتا تھا۔ جس کی اپنی کوئی ملکیت تھی اور نہ ہی کوئی ذاتی زندگی۔ بس دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے ضروری کپڑے کا حق دار تھا۔

نئے پارلیمانی نظام کے علمبردار ممالک پوری دنیا کو اپنے نظام کے مطابق ڈھالنے کے خواہاں تھے تاکہ کوئی دوسرا نظام اُن کے مدِ مقابل ہی نہ ہو۔ اور وہ اِس نظام کو اپنانے والے اولین ممالک ہونے کی وجہ سے اپنی کلیدی اہمیت کا ہر طرح سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اور دیگر ممالک اُن کی امامت میں اسی راستے پر گامزن رہیں۔ جبکہ دوسری طرف قدیم طرز کی بادشاہت کے بچاؤ کے لیے سرگرمِ عمل ممالک بڑھ کر پوری دنیا پر اپنے نظام کی بہتری اور افادیت ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس نظام کے دیگر اقوام پر چھا جانے سے اُن کے علم بردار بن جائیں۔

اِس تصادم میں یورپ کے کئی ممالک کے عوام شریک تھے۔ ہر دو فریقین کو اُن کے بیرونی حلیف پسِ پردہ مدد فراہم کر رہے تھے اور اِس طرح اُٹھنے والی تحاریک کے لیے ایندھن فراہم ہوتا رہتا۔ صورتِ حال اِس قدر بگڑ چکی تھی کہ کئی ممالک (جیسا کہ ہم گزشتہ دو ابواب میں مطالعہ کر چکے ہیں) میں قدیم طرزِ حکومت کے خلاف سخت بغاوتیں ہوئیں اور کئی بادشاہوں کا سیاسی قتل اور کچھ کو جلا وطن کر دیا گیا۔

ان حالات میں جہاں ایک طرف برطانیہ اور فرانس میں جمہوریتیں قائم ہو چکی تھیں اور

صنعتی ترقی کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں۔ وہیں جرمنی نے قدیم طرزِ بادشاہت کے باوجود صنعت و حرفت اور معاشی ترقی میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو اول الذکر ممالک کے متعارف کردہ نئے نظام کے لیے کھلا چیلنج تھا۔ اور اُسے دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کر سکتا تھا۔

اِس صورتِ حال سے جمہوریت کے علم بردار تمام ممالک سخت خائف تھے۔ اور ہر ممکن ذرائع سے جرمنی کی ابھرتی ہوئی طاقت کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر جرمنی نہیں تھا بلکہ قدیم نظام تھا جسے ختم کرنے کے لیے وہ ہر اُس ملک کو زیر کرنا چاہتے تھے جو پارلیمانی جمہوریت کے خلاف ہو۔ اور مستحکم ہونے پر نئے نظام کے خلاف صف آراء ہو سکے۔

نوآبادیاتی نظام میں بالادستی کی دوڑ

اٹھارویں صدی کے اختتام پر یورپی ممالک مختلف حیلے بہانوں سے ایشیاء اور افریقہ کے ساحلوں پر اپنی مضبوط قلعہ بندیاں کر چکے تھے اور وہاں کی حکومتوں کو اپنی تجارت اور درباری خرید و فروخت کے باعث بہت حد تک متاثر کر چکے تھے۔ براعظم امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی خوب دسترس تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز پر یورپی ممالک کی کئی نوآبادیات قائم ہو چکی تھیں اور کئی ایک پر باقاعدہ تسلط کے لیے تھوڑی ہی محنت و قوت درکار تھی۔

یورپی ممالک یورپ کی تنگ سرزمین سے نکل کر بیرونی دنیا کی تلاش میں چلے تھے اور بیرونی دنیا کی دستیابی پر اپنی آبادی وہاں بسانے یا بصورتِ دیگر وہاں کی تمام معاشی افادیت حاصل کرنے کے لیے سلطنت اور کنٹرول کے قیام کے خواہاں تھے۔ اِس قسم کی سوچ یورپی حکمرانوں کی توسیع پسندانہ حکمتِ عملی کو مرتب کرنے کا باعث بنی اور بالآخر کار انیسویں صدی کے اختتام پر تقریباً تمام یورپی ممالک بیرونِ یورپ نوآبادیات قائم کر چکے تھے۔

یہ یورپی اقوام کے مکمل عروج کی صدی تھی کہ ایسی یورپی قوم جو یورپ میں بالکل ہی غیر مؤثر اور غیر اہم تھی وہ بھی ایشیاء اور افریقہ کے ممالک کو اپنے پایۂ تخت کے زیرِ نگیں کر چکی تھی۔ برطانیہ، فرانس، جرمنی، پرتگال اور بیلجیم وغیرہ سب ہی تو نوآبادیات قائم کر چکے تھے۔ اور

برطانیہ، فرانس، جرمنی اور پرتگال تو بیک وقت کئی ممالک کو اپنی نوآبادیات میں شامل کر چکے تھے۔ دوسری طرف روس زار کی قیادت میں وسطی ایشیائی ریاستوں کو رفتہ رفتہ کچل رہا تھا۔

اِس طرح توسیع پسندانہ رجحان تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ چونکہ تقریباً ہر یورپی ملک ہی نوآبادیات کے قیام کے لیے کوشاں تھا۔ لہٰذا نوآبادیاتی ممالک کے حصول کے لیے یورپی ممالک باہمی انتشار اور کشمکش میں مبتلا ہو رہے تھے۔ یورپ کے اندر کے معاملات بھلے جس نوعیت کے ہوں مگر بیرونِ یورپ نوآبادیات پر بہر حال مفادات کے تضاد کا آغاز ہو چکا تھا۔ فرانس برطانیہ سے نالاں تھا اور برطانوی بالادستی کے خاتمے کا خواہاں تھا۔ برطانیہ فرانس کی نوآبادیات کو محدود کرنے کے لیے مصروفِ عمل نظر آتا تھا۔

جرمنی میں آٹو وان بسمارک نوآبادیاتی نظام میں استحکام حاصل کر کے برطانیہ، فرانس اور دیگر توسیع پسند ممالک کی نظر میں کھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر قیصر ولیم دوم بہر حال اپنی سلطنت کی وسعت کے خواب دیکھتا تھا اور اِس مقصد کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔ لہٰذا بسمارک کی بساط 1890ء میں لپیٹ دی گئی اور اُس کی جگہ قیصر ولیم دوم نے اپنے مقاصد و خواہشات سے ہم آہنگ حکومت تشکیل دے دی۔

اب جرمنی کے توسیع پسندانہ رجحان نے اس ملک کو اپنے اُن ہمسایوں اور دیگر یورپی ممالک سے سخت بدظن کر دیا جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ جرمن قوم کو براعظم میں اپنے اردگرد بیشتر ممالک دشمن لگنے لگے تھے۔ جبھی چانسلر کو کہنا پڑا کہ ہر ملک پر نظر رکھنی ہے اُس کا راستہ ماپنا ہے اور کسی کو نقصان بھی نہیں پہنچانا۔

اِن حالات میں یورپی ممالک توسیع کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جس کے لیے کمزور ممالک ہی تر نوالہ بن سکتے تھے۔ جبکہ طاقت ور ممالک اپنے ملک کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھنے دیتے تھے۔ کیونکہ کمزور ممالک پر تسلط کے لیے ہر یورپی ملک خواہاں تھا۔ لہٰذا ہر ملک دوسرے ملک سے نالاں اور رنجیدہ تھا۔ نوآبادیات میں اضافہ بہترین تجارت و پیداواری صلاحیتوں کے حصول کے مترادف تھا۔ جو معاشی استحکام کے لیے انتہائی ضروری امر تھا۔

تلخیص

اقوامِ یورپ پر صنعتی انقلاب اور سیاسی منظرنامے میں تبدیلی کے واضح اثرات ہوئے تھے۔ دنیا بھر میں صفِ اول میں کھڑے ہونے اور زیرِ دست قوموں کی تقدیر کے فیصلے کرنے کے تسکین بخش مراحل کے دوران باہمی ناچاقی اور چپقلش کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ اور اِن عوامل سے بخوبی نمٹنے کے لیے تمام یورپی اقوام سفارتی، سیاسی، بری، بحری اور فضائی بالادستی کے حصول میں سرگرداں تھیں۔

اسلحہ کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا میدانِ جنگ میں بھرپور افادہ حاصل کرنے کے لیے نت نئی تحقیق اور بعد ازاں وسیع پیمانے پر تیاری کے مدارج طے ہو رہے تھے۔ افواج میں اضافہ اور جدید اسلحہ کی فراوانی کے ساتھ ساتھ جدید ذرائع ابلاغ و رسل و ترسیل کے نظام بنائے جا رہے تھے۔

دوسری طرف معاشی و اقتصادی ترقی اور دیگر ممالک پر سبقت لے جانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جا رہے تھے۔ جدید صنعت سازی نے قومی معیشت اور اقتصادی ترقی کے معیار بدل کر رکھ دیے تھے۔ زرعی ممالک صنعتی ترقی کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ جبکہ شعبہ زراعت میں جدت بھی لائی جا رہی تھی۔ بین الاقوامی تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری کی ضرورت و اہمت بھی اقوامِ یورپ پر واضح ہو چکی تھی۔ اِس طرح ہر یورپی ملک معاشی و اقتصادی ترقی و استحکام کے لیے ہمسایہ ممالک کو پیچھے چھوڑ جانا چاہتا تھا۔

اسلحہ کی دوڑ اور معاشی ترقی و استحکام کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ دیرینہ جنگوں کے باعث مغربی اقوام کے مابین پیدا ہونے والی رقابتیں بھی ایک لاوے کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ اور کسی بھی وقت اچانک پھٹ پڑنے کو تیار تھیں۔ گزشتہ صدی میں یورپی اقوام ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہی تھیں۔ اور اِن جنگوں میں شکست خوردہ ممالک اپنی شکست کی ذلت دھونے اور مقبوضہ علاقے چھڑوانے کے لیے اندر ہی اندر موقع کی تلاش میں تھے۔ اور دشمن ملک کو

زیر کرنے کے لیے حالات وواقعات کی تیاری میں مصروف تھے۔

یورپ میں کئی قومیں آباد ہونے کے باعث اُن کے رہن سہن، زبان ومکان، انداز واطوار، صورت وسیرت، فکر وگفتار اور تہذیب وتمدن علیحدہ علیحدہ تھے۔ ہر قوم خود کے یکتا اور اعلیٰ و ارفع سمجھتی تھی۔ جبکہ دیگر ممالک اور اُن کی اقوام اُن کے نزدیک فضول تھے۔ وہ اپنی زبان اور تہذیب پر کسی قسم کا کوئی کمپرومائز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اِسی لیے ہر قوم دوسری قوم کی بالادستی تسلیم کرنے لیے تیار نہ تھی اور ایک دوسرے سے مفاہمت اور پرامن بقائے باہمی کے جذبے سے عاری ہونے کے باعث اپنی اپنی حیثیت میں علیحدہ ملک/سلطنت قائم کرنے کی خواہاں تھی۔ اِس طرح قومی تعصبات بھی اپنے عروج پر تھے۔

انہی حالات میں چند ممالک نے اپنے ہمسایہ ممالک کے عزائم جارحانہ اور توسیع پسندانہ جانتے ہوئے دیگر ممالک سے دفاعی معاہدات کرنے شروع کر دیے۔ اِس طرح یورپ کے کسی ایک ملک سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں پورا یورپ اِس کی لپیٹ میں آجاتا۔ جبکہ دوسری طرف کے گروہ نے بھی اسی طرح کی اتحادی سیاست کے باعث چند ممالک کو اپنے اردگرد بطور حصار کھڑا کیا۔

اتحادی سیاست کے لیے ضروری فکری وعلمی استعداد سے عاری حکمرانوں نے اپنے غیر ذمہ دارانہ رویہ اور جلد بازی سے یورپ بلکہ پوری دنیا کو تباہی کے اُس عظیم منظر سے آشنا کیا جو قبل ازیں تاریخ عالم کی جہاندیدہ نگاہ سے نہ گزرا تھا۔ اس وقت کے حکمرانوں کی سوچ اور اس کے نتیجے میں بننے والی پالیسیوں میں سطحیت اور لااُبالی پن مترشح ہوتا ہے۔

جدید پارلیمانی جمہوری نظام اور قدیم طرزِ بادشاہت کے درمیان نزاع کی کیفیت اپنے آخری لبوں پر تھی۔ دنیا بھر میں ایک نئی سوچ رائج کرنے اور پرانی طرزِ حکومت کے خاتمے کے لیے کئی ممالک پسِ پردہ بادشاہت کے نظام پر کاربند ممالک سے شدید مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ جبکہ پرانی وضع کی حکومت کرنے والے اُس طرزِ زندگی کی بھرپور حمایت کر رہے تھے۔ اکثر و بیشتر ممالک میں قدامت اور جدت کے مسئلے پر فسادات ہونے شروع ہو چکے تھے اور اُن کی حکومتوں کے لیے دِن بدن حالات مشکل ہوتے چلے جا رہے تھے۔

یورپ کے اکثر ممالک نے ایشیائی اور افریقی ممالک میں اپنی نوآبادیات قائم رکھی تھیں۔ نوآبادیات کے نظام میں بالادستی کے لیے دور دراز سمندری علاقوں تک دسترس ضروری تھی جس کے لیے بحری عظیم قوت درکار تھی۔ بحری قوت کے حصول کے لیے سرمائے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ تکنیکی صلاحیت اور تجربہ اور مثبت راہنمائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اِس سلسلہ میں اقدامات کرنے سے بحری قوتوں کے حامل ممالک کھٹک جاتے تھے اور اس طرف بڑھنے والے ممالک کے خلاف محاذ کھڑے کر لیتے تھے۔

غرض یورپ کے ممالک انیسویں صدی کے آخری ربع سے ہی جنگِ عظیم اول کے اسباب و وجوہات پیدا کر چکے تھے۔

حصہ دوم

احوالِ جنگ
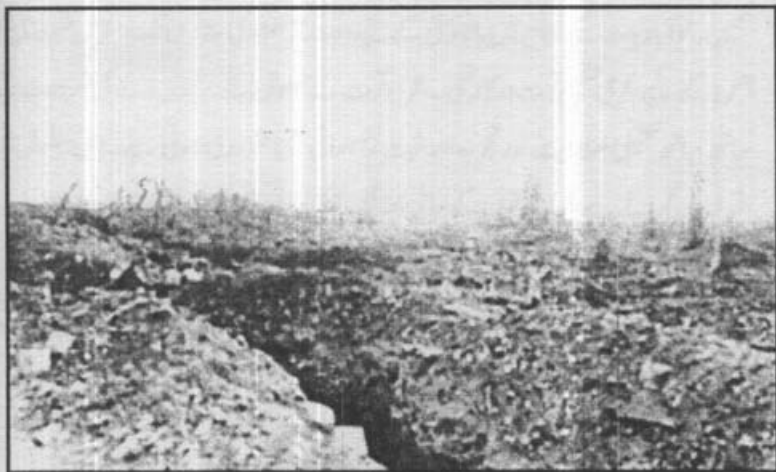
(جنگِ عظیم اول ایک نظر میں)

4

1914ء کے دوران جنگ کی صورتِ حال

سال 1914ء تاریخِ عالم میں تباہی اور بربادی کی الم ناک داستان کے آغاز کا سال تھا۔
اہلِ یورپ جو اُس وقت تک دیگر اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے باعث جدید اسلحہ اور تباہ کار مادوں سے پوری طرح لیس تھے، باہمی انتشار اور خونریزی کی دردناک داستان رقم کرنے کے لیے کسی چنگاری کی تلاش میں تھے جو بالآخر 28 جون 1914ء کو میسر آئی جب آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری بادشاہت کے شہزادے اور ولی عہد آرک ڈیوک فرینز فرڈیننڈ اور اُس کی اہلیہ صوفیہ کو سراجیو کے مقام پر سربیائی قومیت پرست گیوریلو پرنسپ نامی شخص نے جس کا تعلق دہشت گرد تنظیم بلیک ہینڈ (Black Hand) سے تھا، قتل کر دیا۔

سربیا اور آسٹریا۔ ہنگری کے تعلقات پہلے ہی انتہائی خراب تھے۔ سربیا روس کی ایما پر آسٹریا۔ ہنگری کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتا رہتا تھا اور اب عظیم سربیائی سلطنت کے قیام کے ایجنڈے پر روسی افواج کے بل بوتے پر سربیائی حکومت نے آسٹریا۔ ہنگری کے ولی عہد اور اس کی اہلیہ کو ایک دہشت گرد تنظیم کے ہاتھوں مروا کر آسٹریا۔ ہنگری کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے اور اِس طرح آسٹریا۔ ہنگری کے سربیائی علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد

کیا۔ جس کے نتیجے میں جنگِ عظیم اوّل کے حالات پیدا ہوئے۔
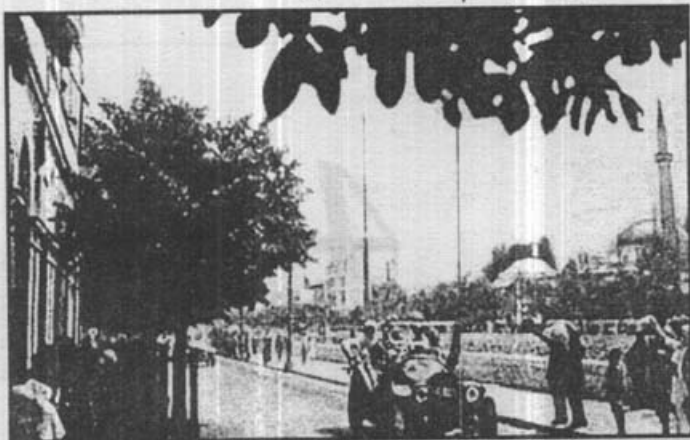
(تصویر آرک ڈیوک فرینز فرڈینینڈ اور اُس کی اہلیہ کی گاڑی قتل سے چند لمحے پہلے)

(تصویر آرک ڈیوک فرینز فرڈینینڈ اور اُس کی اہلیہ)

اتحادی سیاست کے باعث یورپ کے ممالک دو (2) واضح دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ برطانیہ، روس اور فرانس جیسے چیدہ چیدہ ممالک پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا دھڑا جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور ترکی پر مشتمل تھا۔ اِن بڑے ممالک کے جغرافیہ سے متعلق چھوٹے چھوٹے ممالک بھی جنگ کے شعلوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ کچھ ممالک کی جغرافیائی اہمیت ہی اُنہیں جنگ میں گھسیٹنے کا باعث بنی جبکہ کچھ ممالک کے مفادات اور بعد از جنگ مراعات کے وعدوں نے

جنگ کے لیے ایندھن کا کام کیا۔

سربیا اور روس کے درمیان دفاعی معاہدے کے تحت سربیا پر کسی ملک کے حملے کی صورت میں روس اُس کی ہر ممکن مدد کرنے کا پابند تھا۔ جبکہ دوسری طرف آسٹریا۔ ہنگری اور جرمنی ایک دفاعی معاہدے (اتحادِ ثلاثہ 1882ء) کے تحت کسی ایک پر حملے کی صورت میں دوسرا ہر صورت جنگ میں کودنے کا ذمہ دار تھا۔ تیسری طرف برطانیہ نے بیلجیم کو ایک دیرینہ معاہدہ کے تحت غیر جانبدار رہنے پر اُس کے دفاع کا ذمہ لیا ہوا تھا۔ ایک اور کڑی برطانیہ روس اور فرانس کے معاہدہ ثلاثہ بھی تھی جس کے تحت معاہدین میں سے کسی بھی ملک پر حملے کی صورت میں دیگر ممالک بھرپور مدد کریں گے۔

اِس طرح برطانیہ اور فرانس میں بیٹھے ہوئے جنگِ عظیم اوّل کے ماسٹر مائنڈ ایک منصوبہ تیار کر چکے تھے جس کے تحت ایسے حالات پیدا کرنے مقصود تھے جن میں چاروناچار آسٹریا۔ ہنگری یا جرمنی دوسرے گروہ کے کسی ملک پر حملہ آور ہوں اور اِس طرح برطانیہ روس اور فرانس کو اُن پر حملہ کرنے کا موقع مل جائے۔ جرمنی ایک طاقتور حریف ہونے کے باعث اتحادی ممالک کے لیے ایک بہت ہی مشکل شکار تھا۔ جبکہ آسٹریا۔ ہنگری ایک کمزور حکومت اور سلطنت ہونے کے ساتھ ساتھ کئی اقوام کا ملک تھا جو ہمہ وقت بیشتر لسانی اور تہذیبی، فکری اور عملی بحرانوں کا شکار رہتا تھا۔ اور اسی لیے اتحادی ممالک کے عزائم کے پورا ہونے کے لیے بہترین مقام تھا جہاں سے جنگ کے آغاز کے لیے محرک پیدا کیا جاسکے۔

سربیا اور آسٹریا۔ ہنگری کے باہمی تضاد اور عناد کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بن گیا۔ اور منصوبہ سازوں نے ان دو (2) ممالک کو بنیاد بنالیا۔ روسی آشیرباد کے تحت سربیا نے اس قدر جرأت کی کہ آسٹریا۔ ہنگری کے ولی عہد کو اُس کی اہلیہ سمیت قتل کروادیا۔ بعد میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ اِس قتل کی ذمہ دار سربیا کی حکومت تھی اور گیوریلو پرنسپ جس کا تعلق بلیک ہینڈ نامی دہشت گرد تنظیم سے تھا، حکومتی ایماء پر آرک ڈیوک فرنز فرڈیننڈ اور اُس کی اہلیہ صوفیہ کے قتل کے لیے آیا تھا۔

آسٹریا۔ ہنگری کی حکومت سربیائی اقدام کے پیچھے چھپے منصوبے سے آگاہ ہو چکی تھی۔ بادشاہ فرینز جوزف روس، برطانیہ اور فرانس کے عزائم سے واقف ہونے کے باعث پس

و پیش کر رہا تھا۔ وہ سربیا سے جنگ کے آغاز سے قبل اس جنگ کے اثرات کا گہرا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اور روس کی مداخلت کے نتیجے میں تر نوالہ بننے کی بجائے جرمنی کی مداخلت کی یقین دہانی چاہتا تھا۔ جبکہ جنرل فرینز کونریڈ فوری طور پر سربیا پر حملہ کرنے کے حق میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صرف اِس قدر وقت انتظار کیا جائے جتنا وقت افواج کو حملے کے لیے درکار ہو۔

مورخہ 05 جولائی 1914ء کو فرینز جوزف کے سفیر نے قیصر ولیم دوم سے ملاقات کی جس میں قیصر ولیم نے آسٹریا۔ ہنگری کی بھرپور حمایت اور روسی حملے کی صورت میں روس سے جنگ کی یقین دہانی کرائی۔ 07 جولائی کو آسٹریا۔ ہنگری کی مجلسِ وزراء نے ایک الٹی میٹم کا خاکہ تیار کیا جس میں واقعات کی تحقیقات کے لیے آسٹریا۔ ہنگری اپنے آفیسران کو سربیا بھیجنا اور ثابت ہونے پر سزا کے معاملات وہیں مکمل کروانا چاہتا تھا۔

حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ ہر ہر لمحہ انتہائی اہمیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وقت کی باگیں ان دیکھے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھیں۔ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ منصوبہ سازی کے وقت منصوبہ ساز اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق منصوبے کے خدوخال وضع کرتے ہیں مگر ایک بار منصوبے کے شروع ہونے پر حالات و واقعات پر منصوبہ کے مطابق مکمل گرفت نہیں رہتی۔ اور حالات و واقعات اپنی ڈگر کا تعین از خود کرتے ہیں۔ یورپ کے لیے یہ چند دن انتہائی اہمیت کے حامل تھے جنہیں روز بروز کے بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں دیکھنے سے ہی مطالعہ کرنے والے اصل حقائق سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

15 جولائی کو فرانسیسی صدر اور وزیرِ اعظم کے دورہ روس اور فصلوں کی کٹائی کی تکمیل کے لیے الٹی میٹم میں تاخیر کی گئی اور مورخہ 23 جولائی 1914ء کو آسٹریا۔ ہنگری کی جانب سے سربیا کو الٹی میٹم دیا گیا جس کے تحت 48 گھنٹے کے اندر اندر تمام شقوں کو ماننے بصورتِ دیگر جنگ کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ سربیا نے روسی ایماء اپنی چھوٹی سی فوج کو متحرک کیا اور الٹی میٹم کی مدت کے اختتام پر مورخہ 25 جولائی کو سفارتی طور پر آسٹریا۔ ہنگری کے جانب سے جاری شدہ شرائط میں سے چند ایک کو تسلیم کرنے کا عندیہ دیا۔

اِس موقع پر مناسب ہوگا کہ ہم جرمنی اور اتحادیوں کے منصوبہ ہائے جنگ کا مطالعہ کر لیں تا کہ اس کے بعد کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا جا سکے۔

جنگ کے منصوبے

یورپ میں تناؤ کی فضاء کے پیدا ہوتے ہی متحارب ممالک نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ کے لیے منصوبہ بندی شروع کردی تھی۔ اِن منصوبہ بندیوں میں سب سے اہم منصوبہ جرمنی کے چیف آف سٹاف ایلفر ڈوان شیلفن کا تھا جو 1905ء میں موصوف نے اپنی ریٹائرمنٹ پر مرتب کیا تھا۔ شیلفن اپنی فطرت کے لحاظ سے اُن افراد سے تعلق رکھتے تھے جو دشمن کی صرف شکست پر ہی کارروائی کو موقوف نہیں کرتے۔ بلکہ دشمن کو نیست و نابود کردینا چاہتے تھے۔ اسی لیے موصوف نے ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جو جنگِ عظیم اوّل کا واحد کامیاب ترین منصوبہ تھا۔ اور جرمنی کو ابتدائی طور پر حاصل ہونے والی کامیابیوں کی وجہ بھی یہی منصوبہ تھا۔

شیلفن پلان

جنرل شیلفن کے منصوبے کی بنیاد یہ یقین تھا کہ فرانسیسی افواج اپنے چھنے ہوئے علاقوں کی واپسی کے لیے ہر حالت میں جرمنی سے متصادم ہونگی۔ اِس مقصد کے لیے فرانسیسی افواج الساس اور لورین کے نزدیک ترین بارڈر پر اپنی توجہ مرکوز کریں گی اس صورت میں جرمنی بیلجیم کے ذریعے فرانس کے دفاعی لحاظ سے کمزور ترین حصے مابین مزریز اور ڈونکرک پر حملہ کر کے فرانس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھائے گا اور پیرس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

اِس مقصد کے لیے فوجی صف آرائی بھی بڑی منصوبہ بندی سے کی گئی تھی۔ دائیں بازو کی افواج کی مضبوطی کے لیے تمام ممکن کوششیں کی گئی تھیں اور وہاں پہلی اور دوسری آرمی کو صف آراء کیا گیا تھا۔ اِن افواج کو بیلجیم اور جنوبی نیدرلینڈ سے ہوتے ہوئے فرانس میں داخل ہونا تھا۔ الساس اور لورین کے دفاع کے لیے پانچویں اور چھٹی فوج صف آراء تھی جس کا مقصد فرانسیسی افواج کو چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے ذریعے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے اشتعال دلانا اور بالآخر پہلی اور دوسری آرمی کو اُن کی پشت پر پہنچ جانے کا موقعہ دینا تھا تاکہ دشمن کی رسد و کمک کا راستہ مسدود کردیا جائے۔

اس وقت پانچویں اور چھٹی آرمی دفاعی انداز سے لڑنے کی بجائے فوراً جارحانہ انداز سے حملے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جبکہ اُس کی پشت پر محفوظ دستوں کو بڑے منظم انداز سے دفاعی پوزیشن سنبھالنے کے لیے تیار رکھا گیا تھا۔ اِس طرح فرانسیسی افواج کو ایک دائرے کی شکل میں مقید کر لینے کے بعد اُن کے مکمل طور پر خاتمے کے لیے منصوبہ بندی کی گئی تھی۔
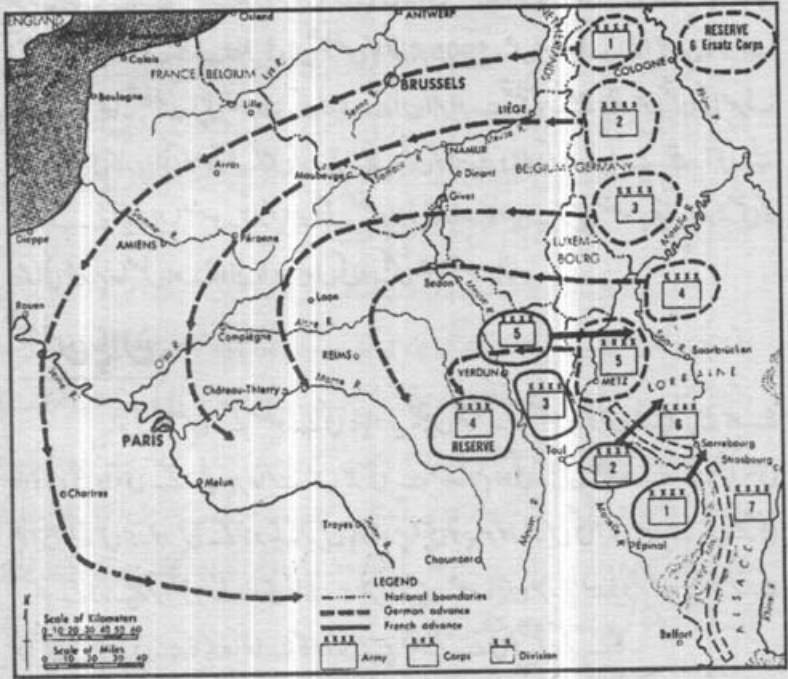
(نقشہ شیلفن پلان)

اِس منصوبے میں جرمن افواج کی بنیادی توجہ فرانس کی طرف تھی۔ اِس کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دائیں بازو کے لیے 7:1 کا تناسب تھا۔ جبکہ روس سے مقابلے کے لیے باقی ماندہ فوج جو بہت زیادہ زور آور نہیں تھی، مختص تھی۔ اِس کی وجہ اُس وقت کے روس کی کمزور معاشی و فوجی حالت تھی۔

یہ منصوبہ 1905ء میں بنایا گیا تھا۔ ایلفرڈ وان شیلفن اسی سال ریٹائر ہوا اور اُس کی جگہ جنرل ہیلموتھ وان مولٹک نے لی۔ ابتدائی طور پر تو یہ منصوبہ مولٹک کو بھی پسند تھا مگر بعد میں بین

الاقوامی بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اُسے اِس منصوبے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ایک طرف تو روس 1905ء میں جاپان سے شکست کھانے کے بعد فوجی اصلاحات میں مصروف ہو گیا تھا۔ اور اب وہ پہلا سا کمزور روس نہیں رہ گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ جرمنی کے لیے سرحدی پٹی کے نزدیک سار میں کوئلے کی کانیں اور رائین لینڈ کی صنعتی ریاست انتہائی اہم ہو گئے تھے وطن کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنا انتہائی احمقانہ حرکت ہوتی۔

اِس لیے 1912ء شیلفن نے از خود اِس منصوبے میں ترمیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور مشرقی محاذ پر بیلفورٹ سے سمندر تک کی سرحد پر فوجی صف آرائی کو مضبوط بنانے کی ضرورت اور بیک وقت مشرقی اور مغربی محاذ پر بائیں اور دائیں بازو کی افواج کو مضبوط کرنے پر زور دیا۔ مولٹک نے شیلفن پلان میں ترمیم کرتے ہوئے نیدر لینڈ کی غیر جانبدارانہ حیثیت کو چھیڑنے سے مکمل طور پر گریز کیا۔

اِس طرح سیاسی اور اخلاقی فوائد تو حاصل ہوئے لیکن فوجی لحاظ سے دائیں بازو کی دو افواج کا گزر بیلجیم کی تنگ گزرگاہ سے ہو کر ہی جانا تھا جو افواج کی برق رفتاری میں رکاوٹ بنتا تھا۔ مزید یہ کہ مولٹک نے مغربی محاذ پر افواج کا تناسب 7:1 سے کم کر کے 4:1 کر دیا اور سار اور رائین لینڈ کے دفاع پر خصوصی توجہ دی۔

اِس طرح شیلفن پلان کی اصل روح کہ "دائیں بازو کو مضبوط ترین کیا جائے" بوقتِ عمل مفقود ہو چکی تھی اور مولٹک بائیں بازو پر افواج کو اسی تناسب سے مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ جرمنی کو بیک وقت دو محاذوں پر بخیر و خوبی کامیابی سے ہمکنار کر سکے۔

منصوبہ نمبر 17

دوسری طرف فرانس اور دیگر اتحادیوں نے منصوبہ بندی تو کر رکھی تھی مگر اُن منصوبوں میں وہ پختگی اور کاملیت نہیں تھی جو جرمن شیلفن پلان میں تھی۔ بیلجیم اپنے غیر جانبدارانہ موقف پر سختی سے کاربند تھا۔ تاہم برطانیہ اور فرانس کے مابین 1911ء سے قریبی تعلقات تھے اور یہ طے پا چکا تھا کہ جرمنی سے مقابلے کے لیے برطانیہ اپنی مہماتی فوج کو براعظم میں فرانس کے بائیں طرف حربی کارروائیوں کے لیے بھیجے گا۔ 1-1870ء کی جنگ میں پروشیاء سے شکست کھانے اور

اپنے صوبے الساس اور لورین کھو جانے کے بعد فرانس میں اِن علاقوں کے حصول کے لیے انتہائی شدید جذبات تھے۔ اِن جذبات کے زیرِ اثر فرانس کے اعلیٰ فوجی حکام منصوبہ جات بناتے اور ان کا بار بار جائزہ لیتے رہتے تھے۔

1911ء میں منصوبہ نمبر 16 الساس اور لورین کے صوبوں میں جارحیت کے لیے بنایا گیا تھا۔ جنرل آگسٹن ایڈیورڈ منصوبہ نمبر 16 کو فرانس کی سالمیت کے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جرمن الساس اور لورین کے دشوار گزار راستوں کی بجائے بیلجیم کے راستے فرانس پر حملہ کریں گے۔ اس نے تجویز دی کہ جرمنی کے بیلجیم کے راستے متوقع حملے سے بچنے کے لیے بیلجیم کی سرحد کے ساتھ دفاع کو مضبوط کیا جائے اور افواج کو از سرِ نو منظم کر کے جرمنی کے حملہ آور دستوں پر جارحانہ حملے کرتے ہوئے اُنہیں بیلجیم سے نکال باہر کیا جائے۔

اِس منصوبے پر عمل درآمد سے ایک تو فرانس کی پوری فوج کی از سرِ نو ترتیب اور صف آرائی کرنی پڑتی۔ دوسرے اِس منصوبے کے دوران فرانس بیلجیم کی غیر جانب دارانہ حیثیت کو خراب کرنے کا مرتکب ہوتا۔ لہٰذا جنرل آگسٹن کے منصوبے کو مسترد کرتے ہوئے اُس کی جگہ جنرل جوزف جوفر کو چیف آف سٹاف کے عہدے پر متمکن کر دیا گیا، جو بعد میں مارشل کے عہدے پر بھی فائز رہا۔

جنرل جوزف نے ایک غیر واضح اور نامکمل منصوبہ دیا جس میں اُن جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی جہاں دشمن کے حملے متوقع تھے اور جہاں سے دشمن پر حملے کیے جانے مقصود تھے۔ اِس منصوبے کو منصوبہ نمبر 17 کا نام دیا گیا۔ اِس منصوبے کی اساس یہ خیال تھا کہ جرمن افواج مقبوضہ علاقوں الساس اور لورین کی فرانس سے ملحقہ سرحد سے حملہ آور ہوں گی۔ تاہم اِس منصوبے میں جرمن افواج کے بیلجیم کے ذریعے حملے کو بھی متوقع سمجھتے ہوئے کسی قدر انتظامات کیے گئے تھے۔

اِس منصوبے کے تحت فرانس کی پہلی، دوسری، تیسری اور پانچویں آرمی دائیں سے بائیں الساس اور لورین کے علاقوں سے جرمن افواج کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھیں۔ جرمنی کے بیلجیم کے راستے حملے کی صورت میں محفوظ چوتھی آرمی کو بائیں طرف حرکت کرنا تھی اور پانچویں آرمی کی جگہ لینا تھی جبکہ پانچویں آرمی کو بیلجیم کے راستے داخل ہونے والی جرمن افواج کو روکنے کے لیے مزید بائیں جانب حرکت کرنا تھی۔ بصورتِ دیگر چوتھی آرمی کو ہدایت کی گئی تھی کہ

وہ تیسری آرمی کے دائیں طرف سے الساس اور لورین کے علاقوں میں موجود جرمن افواج پر حملہ کرے۔

اِس منصوبے میں باقاعدہ طور پر برطانوی مہماتی فوج کے لیے کوئی اشارہ نہیں تھا تاہم پانچویں آرمی کے بائیں طرف بہت بڑی سرحدی لائن اِسی لیے فرانسیسی افواج سے خالی رکھی گئی تھیں کہ وہاں برطانیہ کی مہماتی فوج صف آراء ہو کر جرمن افواج کا مقابلہ کرے گی۔ اِس صورت میں برطانیہ اور فرانس کی افواج دو (2) بڑے حملے کرنے کا منصوبہ رکھتی تھیں تاہم کس وقت اور کتنی افواج کے ساتھ اور دیگر ضروری جزیات وغیرہ منصوبے میں بیان نہیں کی گئی تھیں۔ اِسی لیے یہ منصوبہ ادھورا اور غیر جامع تھا۔ اِس منصوبے کے مطابق فرانس کی افواج نے بالکل وہی کیا جس کی جرمن شیلفن پلان میں توقع کی گئی تھی۔

بری اور بحری حملے

28 جولائی 1914ء کو آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ اگلے ہی دِن روس نے حسبِ منصوبہ اپنی افواج کو آسٹریا۔ ہنگری پر حملہ کرنے کے لیے کوچ کا حکم دے دیا۔ 31 جولائی کو جرمنی نے روس سے افواج کی حرکت روکنے کی استدعا کی مگر روس نے جرمنی کی درخواست رد کر دی۔ جس پر یکم اگست 1914ء کو جرمنی نے روس سے اعلانِ جنگ کر دیا اور روس کے اتحادی فرانس سے غیر جانبدار رہنے کی درخواست کی جو فرانس کی وزارتِ خارجہ نے مسترد کر دی اور اپنی افواج کو متحرک ہونے کے احکامات جاری کیے۔

اسی روز جرمنی اور عثمانی ترکی کے درمیان اتحاد کے خفیہ معاہدے پر دستخط کیے گئے، جس کے تحت دونوں ممالک ایک دوسرے کی فوجی امداد کرنے پر راضی اور کسی ایک سے جنگ چھڑ جانے پر دوسرے کی مداخلت کے پابند تھے۔ اٹلی نے اتحادِ ثلاثہ کا رکن ہونے کے باوجود غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا۔

02 اگست کو جرمنی نے بیلجیم سے گزارش کی کہ فرانس کی افواج حملہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جس سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ جرمنی اپنی افواج کو بیلجیم میں داخل کرے۔ تاہم اس

امر کی یقین دہانی کرائی گئی کہ بیلجیم کی غیر جانب دارانہ حیثیت برقرار رکھی جائے گی اگر بیلجیم کی افواج مزاحمت کریں گی تو اِسے حملہ تصور کیا جائے گا۔ اِس الٹی میٹم کی مدت 12 گھنٹے تھی۔

مورخہ 03 اگست کو بیلجیم نے جرمنی کو نفی میں جواب دیا۔ اسی دِن جرمنی نے فرانس کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اگلے دِن جرمنی کی برق رفتا افواج بیلجیم میں داخل ہو گئیں۔ بادشاہ البرٹ نے بیلجیم کے غیر جانب دار رہنے سے متعلق معاہدے کے دستخط کنندگان سے مدد کی اپیل کی جس پر برطانیہ نے برلن کو بیلجیم سے واپسی کا الٹی میٹم دیا۔ نصف شب کو الٹی میٹم کی مدت مکمل ہو گئی اور برلن کی جانب سے لندن میں کوئی جواب موصول نہ ہونے پر برطانیہ نے 05 اگست کو جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ ادھر مونٹی نیگرو نے آسٹریا۔ ہنگری کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

اسی روز جرمن افواج نے بیلجیم کی قلعہ بندیوں پر حملہ کر دیا اور 16 اگست تک تمام قلعہ بندیاں فتح کر لیں۔ دوسری طرف آسٹریا۔ ہنگری نے 06 اگست کو روسی افواج کے حملے کے پیشِ نظر روس سے اعلانِ جنگ کر دیا۔ جبکہ سربیا نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ 07 اگست کو برطانوی مہماتی فوج فرانس پہنچی۔ اور 09 اگست کو مونٹی نیگرو نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

10 اگست کو آسٹریا۔ ہنگری نے روس کے زیرِ قبضہ پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ جبکہ 11 اور 12 اگست کو فرانس اور برطانیہ نے بالترتیب آسٹریا۔ ہنگری سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ یوں تو جنگِ عظیم اوّل 1914ء سے 1918ء تک جاری رہی اور اِس دوران جنگ میں شریک ممالک کے لیے ہر لمحہ حالتِ جنگ کا لمحہ تھا تاہم مختلف محاذوں پر مختلف لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں سے کچھ کی شہرت اور اہمیت اپنی مثال آپ ہے۔

مغربی محاذ

جرمنی کو میدانِ جنگ میں بنیادی طور پر دوطرفہ جنگ کی سی کیفیت کا سامنا تھا۔ مغرب میں فرانس اور برطانوی افواج کے علاوہ بیلجیم کی افواج برسرِ پیکار تھیں جبکہ مشرق میں روس کی دیو ہیکل افواج مشرقی پروشیاء پر دھاوا بول رہی تھیں۔ محاذِ جنگ کی صحیح صورتِ حال سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مشرقی، مغربی اور آسٹریا۔ ہنگری کے جنوبی محاذ کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہوئے آگے

بڑھتے چلیں تا کہ مکمل طور پر جنگ کا نقشہ اور احوال ذہن نشین کیا جا سکے۔

سرحدی لڑائیاں

05 اگست کو جرمن افواج بلجیم پر حملہ آور ہو چکی تھیں۔ بلجیم کی قلیل فوج قلعہ بندیوں میں رہتے ہوئے جرمن افواج کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جرمن پہلی اور دوسری آرمی یکے بعد دیگرے بلجیم کی قلعہ بندیوں پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ بلجیم کے بادشاہ البرٹ نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ قلعہ بندیوں میں جرمن افواج کو روکنے اور دوسرا حصہ جرمن افواج کے قلعہ بندیاں سر کر کے پیش قدمی کی صورت میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ دریائے میوز کے تنگ اور دشوار راستے کو لیج کی قلعہ بندیوں نے مزید دشوار بنا دیا تھا چونکہ لیج کی قلعہ بندیاں پورے یورپ میں سب سے مضبوط تصور کی جاتی تھیں۔ جبکہ نیمور بھی اپنی قلعہ بندیوں کے باعث مشہور تھا۔
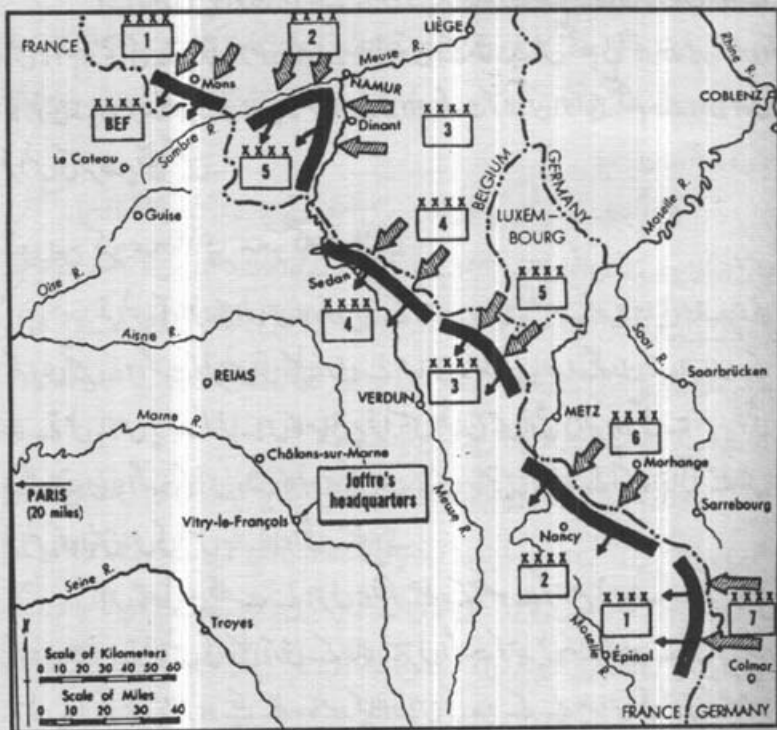
(نقشہ سرحدی لڑائیاں)

لیج اور نیمور میں موجود بیلجیم کی افواج نے بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ مگر عددی اور تکنیکی برتری کی حامل جرمنی کی پہلی اور دوسری آرمی کے ہمراہ اُس وقت تک کا سب سے بھاری توپ خانہ تھا جس کے بھاری 42 سینٹی میٹر ہووٹزرز کے مقابلے میں 21 سینٹی میٹر والے اس کے گولوں کا مقابلہ کرنے والی قلعہ بندیاں بالآخر ریزہ ریزہ ہو گئیں۔

اب جرمن افواج کے سامنے بیلجیم کی محفوظ گشتی فوج کی رکاوٹ تھی۔ جرمنی اپنی متوقع رفتار کو برقرار نہ رکھ سکا تھا۔ بیلجیم کے محاذ پر اسے شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔ جرمن پہلی اور دوسری آرمی نے اپنی مکمل نقل و حرکت سے قبل ہی حملہ کر دیا تھا اِس لیے بھی جرمن افواج کو فوری فتح میں تاخیر کا سامنا کرنا پڑا اور صرف لیج اور نیمور سے آگے بڑھنے میں 11 دِن صرف کرنے پڑے۔ اِس طرح جرمن افواج 16 اگست کو لیج اور نیمور کو فتح کر سکیں۔

اب بیلجیم کی گشتی فوج مزاحمت کر رہی تھی۔ جو چند دِن تک جرمنی کی راہ میں رکاوٹ رہی تاہم جرمنی کی برق رفتار، آزمودہ کار اور مشاق فوج کے مقابلے میں بیلجیم کی مختصر اور غیر آزمودہ کار فوج زیادہ عرصہ ٹھہر نہ سکی اور بالآخر کار مورخہ 20 اگست کو جرمن افواج بیلجیم سے ہوتی ہوئی فرانس کی سرحد پر پہنچ گئیں۔

لورین کے محاذ پر معرکہ آرائی:

فرانس کی افواج الساس اور لورین کے محاذ پر بمطابق منصوبہ نمبر 17 اپنی صف بندی کر رہی تھیں۔ 7 اگست کو فرانس کی پہلی آرمی نے الساس پر حملہ کر دیا اور اگلے دن تک الساس کے علاقے مل ہاؤس پر قبضہ کر لیا۔ اِس کامیابی پر فرانسیسی افواج میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تاہم یہ خوشی اگلے ہی دِن 9 اگست کو اُس وقت کافور ہو گئی جب جرمن ساتویں آرمی نے ایک جوابی حملے میں فرانس کو واپس اس کی اصل جائے روانگی پر پہنچا دیا۔

اِس چھوٹی سی شکست نے جنرل جوفر کو حملے کے منصوبے کو از سرِ نو مرتب کرنے پر مجبور کر دیا۔ جوفر نے فرانس کی پہلی آرمی کے سالار جنرل اگست کو تبدیل کرتے ہوئے اُس کی جگہ جنرل پاول کو جو ریٹائر ہو چکے تھے، مامور کیا اور اِس کی مدد کے لیے الساس کی آرمی کو مستعد کر دیا تا کہ وہ اس کے دائیں ہاتھ شانہ بشانہ متحرک ہو۔

منصوبہ نمبر 17 کی بابت تفصیلات مورخہ 8 اگست کو جنرل جوفر کی جانب سے جاری کی گئیں۔ جس کے مطابق فرانس کی پہلی اور دوسری آرمی کو الساس اور لورین کے شمال مغربی جانب جارحانہ کارروائی کرنی تھی۔ اِن افواج کے ذمے سار برگ کے علاقے کو فتح کرتے ہوئے جرمن افواج کو سٹریس برگ کی طرف دھکیلنا تھا۔

جرمنی کی طرف سے الساس اور لورین کے محاذ پر چھٹی آرمی جنرل جوسیاس وان ہیرنگن کی قیادت میں جبکہ ساتویں آرمی شہزادہ روپرٹ کی برائے نام قیادت اور دراصل جنرل کونارڈ کرافٹ وان ڈیلمن سنجن کی زیرک راہنمائی میں مقابلہ پر تھیں۔

جرمن فوجی منصوبے کے تحت چھٹی اور ساتویں آرمی کو فرانس کی افواج کے مقابلے پر لڑتے ہوئے پسپا ہوتے ہوئے دشمن کو مورہنگ، سار برگ اور ووسگس کے علاقوں کی پٹی پر اندر کی طرف لاتے ہوئے پہاڑی علاقے میں پھنسانا تھا۔ جہاں جرمن افواج نے پسپائی ترک کر کے ایک دم سے شدید جارحانہ حملے شروع کرنے تھے اور فرانس کی افواج کو گھیر کر بُری طرح تباہ کرنا تھا۔ میدانِ جنگ میں بالکل جرمن منصوبے کے مطابق فرانسیسی افواج نے عمل کیا اور شدید بھاری جانی و مالی نقصان اُٹھایا

14 اگست سے فرانس کی پہلی اور دوسری آرمی نے جارحانہ حملوں کا آغاز کیا۔ مسلسل چار (4) دِن تک جرمن افواج حسبِ منصوبہ ہلکے توپ خانے اور محافظ دستوں کی فائرنگ کے ساتھ پیچھے ہٹتی رہیں۔ اور فرانس کی فوج کو اپنی مطلوبہ پٹی تک لے آئیں۔ فرانس کے جرنیلوں کو جرمنی کی جانب سے شدید جوابی حملے کا خدشہ تو تھا مگر وہ پر اعتماد تھے کہ جرمن افواج کے حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے اُن کی فوج بھرپور طور پر تیار ہے۔

20 اگست کو جرمنی کی جانب سے شدید جوابی حملہ کیا گیا اور فرانس کی افواج کو بری طرح پسپا ہو کر اپنی اصل جگہ پر آنا پڑا۔ اِس پسپائی کے دوران پہلی آرمی کے دو (2) کور جن میں جنرل فوش کا المشہور "لوہے کا کور" بھی شامل تھا۔ بری طرح دشمن کے نرغے میں آ گیا اور اگلے پانچ (5) دِنوں تک فرانسیسی افواج دستبردار ہوتے ہوئے نینسی کی مضبوط قلعہ بندی کے پیچھے جا چھپیں۔

جرمنی کے جنرل ڈیلمن نے فرانسیسی افواج کی پسپائی اور شکست پر چیف آف سٹاف

جنرل مولٹک کو مجبور کیا کہ وہ شیلفن پلان کے برعکس اُسے نینسی کی قلعہ بندیوں پر حملہ کرنے کی اجازت دے۔ جنرل ڈیلمن نے مولٹک کو یقین دلایا تھا کہ فرانسیسی افواج انتہائی کمزور پڑ چکی ہیں اور اُن پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے یہ ایک بہترین وقت ہے۔

اُس کے خیال کے مطابق دائیں بازو اور بائیں بازو (شمالی اور جنوبی) کی افواج فرانس کی افواج کو اپنے نرغے میں لے لیں گی اور اِس طرح دشمن کو زیر کیا جاسکے گا۔ اِس پر جنرل مولٹک نے شیلفن کی سخت تنبیہ، کہ بائیں بازو کی افواج کے حملے کے لیے جغرافیائی اور فوجی نقطہ نظر سے درست صورت حال نہ ہے، کے باوجود جنرل ڈیلمن کو جارحانہ انداز سے نینسی کی قلعہ بندیوں میں موجود فرانس کی پہلی، دوسری اور الساس کی آرمی پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔

جرمن چھٹی اور ساتویں فوج کے دستے تیزی سے نینسی کی طرف بڑھے مگر فرانس کی جانب سے شدید مزاحمت ہوتی رہی اور جرمن افواج کو بھاری جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ مزید جرمن افواج کو دائیں بازو (اپنی شمالی فوج) کی افواج میں کمی کر کے بائیں بازو (جنوبی افواج) میں اضافہ کرنا پڑا جس سے شمالی محاذ میں جرمنی کی برتری میں کمزوری آئی۔ اور شیلفن منصوبے کی اصل روح "دائیں بازو کو مضبوط ترین کیا جائے" غائب ہو جانے کے باعث منصوبے کے مطابق ثمرات بھی حاصل نہ ہو سکے۔

اِس طرح معمولی فائدے اور وقتی فتح کے باوجود جرمن افواج اپنے اہداف کے حصول میں بری طرح ناکام ہو گئیں۔ اور فرانس کی لورین میں شکست دراصل فرانس ہی کے حق میں گئی جس کے باعث جنرل ڈیلمن کے کہنے پر جنرل مولٹک نے وہ تاریخی غلطی کی جس کے باعث پیرس پر جرمنی قبضہ نہ کر سکا۔

آرڈینیس کی لڑائی:

جنرل جوفر کی عمومی ہدایات کے مطابق فرانس کی پہلی اور دوسری آرمی کے لورین پر حملے کے دوران تیسری، چوتھی اور پانچویں آرمی کو شمال کی جانب آرڈینیس سے ہوتے ہوئے پیش قدمی کرنا تھی۔ اِس منصوبے کی بنیاد جنرل فوش کا یہ مفروضہ تھا کہ جرمنی کے پاس دریائے میوز کے مشرقی علاقوں میں پیش قدمی کرنے کے لیے فوج میسر نہیں ہو گی۔

تاہم پانچویں آرمی کا سالار جنرل چارلس اِس امر سے بخوبی واقف تھا کہ جرمنی کے پاس اچھے خاصے محفوظ دستے موجود ہیں جو اچھی طرح تربیت یافتہ بھی ہیں اسی لیے وہ جنرل جوفر سے پوری فوج کو دریائے میوز کے جنوب اور شمال میں بلجیم کے راستے فرانس میں داخل ہونے والی جرمن افواج جو ایک دائرے کی شکل میں فرانس کی افواج کو گھیرنا چاہتی تھیں، کو روکنے کے لیے زور دے رہا تھا۔

15 اگست کو جرمن افواج نے ڈینٹ پر ایک زوردار حملہ کر کے وہاں سے ذرائع ابلاغ و ترسیل منقطع کرنے کی کوشش کی تو جنرل جوفر کو جنرل چارلس کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہی بنی اور اس نے جنرل چارلس کو دریائے میوز اور سیمبر کے درمیان بننے والے زاویے میں پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ جبکہ چوتھی آرمی تیسری ارمی کے بائیں جانب متحرک کی گئی جہاں پہلے پانچویں آرمی صف آرا تھی۔

اِس طرح نئی صف بندی سے فرانس کی فوج کے آرڈینیس پر حملے کے لیے قوت میں کمی واقع ہوگئی۔ اور حملہ آور افواج تین کی بجائے دو رہ گئیں۔ اس نئی صورت حال میں جوفر نے تیسری آرمی کو دائیں جانب جرمنی کی قلعہ بندیوں کے علاقے میٹز سے حملے کے پیشِ نظر محفوظ دستوں پر مشتمل نئی تشکیل شدہ لورین کی آرمی سے مدد دی جس کے تمام فوجی غیر مشاق اور غیر تربیت یافتہ تھے۔

جرمن افواج ایک پہیے کی طرح فرانس کی افواج پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ جس کے بیرونی محیط پر جرمن جبکہ مرکز میں فرانس کی افواج کو لپیٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اور اُن کی پیش قدمی کی رفتار انتہائی مناسب تھی جس میں وہ پہلی اور دوسری آرمی کے ذریعے فرانس کی افواج کو کچلنے اور چوتھی اور پانچویں آرمی کے ذریعے جملہ ذرائع کو قبضہ میں لیتے جا رہے تھے۔ اُن کی پیش قدمی کا رخ اُن کے فرانس کی تیسری اور چوتھی آرمی سے ٹکراؤ کا عندیہ دے رہا تھا۔

لورین کی عظیم لڑائی کے صرف دو (2) دن بعد مورخہ 22 اگست کو جنگلوں میں گھرے ہوئے علاقے میں آخر کار یہ آمنا سامنا ہوگیا۔ تین دن تک گھمسان کا رن پڑتا رہا۔ فرانس کی افواج بھرپور جارحانہ انداز سے حملے کرتی رہیں۔ اِس وجہ سے انہیں بھاری جانی و مالی نقصان بھی اُٹھانے پڑے۔ تیسرے دن جرمن افواج کے زوردار حملے کے نتیجے میں فرانس کی افواج کو پسپا

ہو کر اپنی اپنی پہلی جگہوں تک واپس آنا پڑا۔

اگلے ہی روز نئی تشکیل شدہ لورین کی آرمی ختم کر دی گئی۔ اور جرمن ہیڈ کوارٹر میں فرانس کی تیسری اور چوتھی آرمی کی شکست اور بھاری جانی و مالی نقصان کی خبر پر خوشیاں منائی گئیں۔ جرمن حکام نے یہ محسوس کر لیا کہ اب وہ فاتح کی حیثیت سے پیرس میں داخل ہو جائیں گے۔

سیمبر کی لڑائی:

جنرل جوفر کے 15 اگست کے احکام کی تعمیل میں فرانس کی پانچویں آرمی دریائے میوز اور سیمبر کے درمیانی زاویے میں 20 اگست کو گشت کر رہی تھی۔ جنرل چارلس کو اپنے اصل مشن کو سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ اسے ہدایت دی گئی تھی کہ اُسے جرمن افواج کی پیش قدمی کے مطابق جواباً شمال میں سیمبر اور مشرق میں میوز کی طرف جرمنی بڑھنے والی افواج پر حملہ کرنا ہے۔ لیکن 21 اگست کی دوپہر تک جنرل چارلس جرمن افواج کے پوزیشن اور جگہ کا تعین کرنے میں ناکام رہا اور کوئی حرکت نہ کر سکا۔ اُس نے جوفر سے احکامات طلب کیے تو اُس نے جواب دیا کہ حملہ کرنے کے مناسب موقعہ کا تعین کرنے کی ذمہ داری جنرل چارلس کی ہے۔

جنرل کارل وان بُولو کی قیادت میں جرمنی کی دوسری آرمی اپنی پیش قدمی کے دوران میوز اور سیمبر کے درمیانی زاویے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں جنرل چارلس کی قیادت میں فرانس کی پانچویں آرمی مورچہ بند تھی۔ اسی دن دوپہر کو جنرل کارل وان بُولو کی قیادت میں دوسری آرمی دریائے سیمبر تک پہنچ گئی جہاں پانچویں آرمی کے فرانسیسی دستوں سے مقابلہ شروع ہوا۔

رات بھر خونریز لڑائی جاری رہی۔ آخر جرمن افواج دریائے سیمبر کے جنوب میں اپنے پاؤں جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب انہیں جنرل بارون میکس وان ہوسین کی قیادت میں آنے والی تیسری آرمی کا انتظار تھا۔ دوسری طرف فرانس کی پانچویں آرمی کے آفیسران نے اگلے روز جرمن افواج پر جوابی حملہ کرنے کی تجویز دی جسے جنرل چارلس نے بغیر کوئی تبصرہ کیے سُنا۔

23 اگست کو فرانس کی پانچویں آرمی کے حملوں کو جرمنی کی دوسری آرمی نے بڑی کامیابی سے پسپا کر دیا اور اِس دوران کافی جانی و مالی نقصان بھی پہنچایا۔ اِس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے

جنرل کارل وان بُولو نے محسوس کیا کہ وہ اکیلے دشمن کی افواج کو شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسے جنرل ہوسین کی تیسری آرمی کی کمک کی ضرورت نہیں تو اُس نے شام ہونے تک فرانس کی افواج پر شدید حملے کر کے انہیں جنوب کی طرف کئی کلومیٹر تک پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

جنرل چارلس نے پلٹ کر جرمن دوسری آرمی پر شمال کی جانب سے حملہ کرنے کے لیے میوز کے پلوں کی حفاظت پر مامور پہلے کور کو شمال کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔ اور اُن کی جگہ محفوظ فوج کو پلوں کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دی۔ جیسے ہی پہلے کور نے جرمن افواج پر حملے کا موقعہ پایا اُسی وقت کمانڈر جنرل لوئس فرینچٹ ڈی ایسپرے کو اطلاع ملی کہ جرمن تیسری آرمی دریائے میوز پر موجود محفوظ دستوں کو پسپا کر کے جنوب کی طرف فرانس کی پانچویں آرمی کے عقب میں پہنچنے والی ہے۔ تو جنرل فرینچٹ نے بغیر احکامات کا انتظار کیے اپنے دستوں کو تیزی سے واپسی کا حکم دیا اور بروقت دریائے میوز پر پہنچ کر جرمن تیسری آرمی کے ہراول دستے کو پیچھے دھکیل کر حالات کو وقتی طور پر بگڑنے سے بچا لیا۔

اسی روز بلجیم کی فوج نے نیمور سے شہر چھوڑ کر فرانس کی پانچویں آرمی کے عقب میں پناہ لی۔ اسی دوران جنرل چارلس نے اپنی آرمی کی مخدوش صورتِ حال کے پیشِ نظر دست برداری کے لیے جنرل جوفر کو استدعا کی جس نے فوراً ہی منظوری دے دی۔ دوسری طرف جرمنی کی تیسری فوج نے جنوب کی جانب سے میوز اور سیمبر کے درمیانی زاویے میں متوقع فرانس کی پانچویں آرمی پر حملے کے لیے پیش قدمی کی تو انہیں وہاں فرانس کی فوج نہ ملی۔

اس لڑائی کو بعض اوقات چارلیروئی کی لڑائی یا نیمور کی لڑائی بھی کہتے ہیں۔ اِس جنگ میں جرمن افواج کو دیگر جنگوں کی طرح فتح حاصل ہوئی۔ تاہم فرانس کی پانچویں آرمی بالکل تباہی کا شکار نہ ہو سکی اگرچہ اسے بھاری جانی و مالی نقصانات اُٹھانا پڑے۔

جرمنی کی فتح کے باوجود متوقع نتائج حاصل نہ ہونے کی وجہ منصوبے کی ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ جس کے مطابق جرمنی کی پہلی آرمی کو دوسری آرمی کے ماتحت رکھا گیا تھا۔ جنرل بُولو پروشیاء کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اسی لیے اُس کو جرمن اعلیٰ حکام کی پشت پناہی حاصل تھی۔

جنرل بولو پورے محاذِ جنگ پر نظر رکھنے کی بجائے صرف اپنی آرمی کی کامیابی کے لیے

پہلی اور تیسری آرمی کو طلب کرتا رہا۔ حالانکہ تیسری آرمی اُس کے ماتحت نہ تھی۔ پھر بھی اُس کے اثر رسوخ کے باعث پہلی اور تیسری آرمی اپنے محاذوں سے ہٹ کر دوسری آرمی کے طلب کرنے پر اُس کی حفاظت کرنے پر مامور ہو جاتی تھیں۔ اور اِس وجہ سے جرمن افواج کو فرانس کی پانچویں آرمی کی شکست کے باوجود بھی خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔

مونز کی لڑائی

برطانیہ کی مہماتی فوج 14 اگست کو ہی فرانس کے سرحدی علاقوں پر لنگر انداز ہو چکی تھی اور اب اسے میدانِ جنگ میں آنے کے لیے تیاری کا بھی بھرپور موقعہ مل گیا تھا۔ برطانیہ کی مہماتی فوج کے ذمے وہاں کے اعلیٰ حکام کی جانب سے جرمنی کی افواج کو بیلجیم سے دھکیل باہر کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ جان فرینچ کی قیادت میں برطانوی 70,000 فوجی انتہائی سرعت اور خاموشی سے لاکیٹاؤ کے علاقے پر اپنے قدم جما چکے تھے اور اب بیلجیم میں داخل ہو کر جرمنی کی جارحیت کو روکنا چاہتے تھے۔

دوسری طرف مولٹک نے 20 اگست کو جرمن دوسری آرمی کے کمانڈر جنرل بُولو کو خبردار کیا کہ برطانوی مہماتی فوج لیل کے علاقے میں موجود جرمن افواج کے خلاء میں مورچہ بند ہو رہی ہے۔ جنرل بُولو نے پہلی آرمی کے جنرل کلاک کو جو جنوب مغربی سمت میں پیش قدمی کر رہا تھا، فوری طور پر جنوب کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم دیا تھا تا کہ جنگِ سیمبر میں اُس کی دوسری آرمی کو مکمل تحفظ حاصل رہے۔

لیکن یہ فیصلہ غیر دانشمندانہ تھا۔ اِس طرح جنرل کلاک کی پہلی آرمی برطانوی مہماتی فوج سے مونز کے مقام پر متصادم ہوئی۔ بصورتِ دیگر جنرل کلاک کی پہلی آرمی برطانوی فوج سے بائیں پہلو سے دائروی شکل میں متصادم ہو کر دشمن کے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

جنرل جان فرینچ کو برطانوی اعلیٰ حکام کی جانب سے ہدایت تھی کہ وہ فرانس کی افواج سے بھرپور تعاون کرے اور اپنے منصوبہ جات فرانسیسی کمانڈروں سے باہم مشاورت سے ترتیب دیں۔ اس لیے جان فرینچ نے جنرل جوفر اور چارلس سے ملاقات کی۔ آخر الذکر جرنیلوں کو پے در پے شکستوں نے بدل کر دیا تھا۔ اُن کی گفتگو اور منصوبوں نے جان فرینچ کو بہت مایوس کیا اور

باہمی تضاد اور دوری کی بنیادیں قائم ہو گئیں۔ اسی وجہ سے ہر دو حلیف کمانڈروں میں دوری اور عدم رابطہ کی فضاء قائم ہو گئی۔

تاہم برطانوی فوج نے 22 اگست کی رات موزن کے مقام پر پوزیشن سنبھال لی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ برطانوی فوج کے دائیں پہلو اور فرانس کی پانچویں آرمی کے بائیں پہلو کے درمیان کئی کلومیٹر کا خلاء بن گیا۔ جرمنی کی پہلی آرمی جنرل کلاک کی قیادت میں تیزی سے موزن کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ 23 اگست کو جرمن اور برطانوی افواج کا شدید مقابلہ شروع ہوا۔ جرمن افواج پے در پے حملے کر رہی تھیں جبکہ برطانوی افواج ان کا بھرپور جواب دیتی رہیں۔

تاہم جرمن افواج تعداد اور مہارت میں برتری کے باعث کئی مقامات پر برطانوی افواج کو کئی کئی کلومیٹر تک پیچھے دھکیلنے میں کامیاب رہیں۔ دوسری جانب فرانس کی پانچویں آرمی کے جنرل چارلس نے جنگ کی صورت حال اور جرمن افواج کی واضح برتری دیکھتے ہوئے پسپائی کا اعلان کر دیا۔ برطانوی افواج میں فرانس کی پانچویں آرمی کے اِس فیصلے سے بددلی اور بیزاری کی کیفیت پیدا ہوئی۔ جس کے باعث برطانیہ کے وزیرِ جنگ نے برطانوی افواج کو دریائے مارن تک پسپا ہونے کا حکم دیا۔

اِس جنگ میں برطانیہ کی جانب سے پلوں کو گرانے کے مشن پر مامور 5 افراد کو وکٹوریہ کراس دیا گیا۔

مندرجہ بالا 4 محاذوں کو سرحدی لڑائیوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اِن میں فرانس کے مجموعی طور پر 3 لاکھ سپاہی مارے گئے۔ اور ہر طرف سے فرانس کی افواج خصوصاً اور برطانوی افواج عموماً پسپا ہوئیں۔ فرانس کے باقی ماندہ سپاہی پے در پے شکست کھانے کے باوجود دشمن سے لڑنے اور مرنے کے لیے تیار تھے۔ جنرل جوفر اور اُس کا منصوبہ ساز جنرل ہنری ایم برتھی لاٹ اب بھی اپنی فتح پر یقین رکھتے تھے۔ اب جا کر انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ جرمن پلان کیا ہے۔

اِس لیے اب فرانسیسی ہائی کمان شمالی اور جنوبی (دائیں اور بائیں بازو کے) محاذوں میں سے جنوبی محاذ کو نسبتاً محفوظ سمجھتے ہوئے وہاں سے کچھ دستوں کو نکال کر ایک نئی آرمی (چھٹی آرمی) بنا کر اسے شمالی محاذ پر پہلے سے موجود مفلوک الحال آرمی کی کمک کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔

25 اگست کو جنرل جوفر نے اپنی جاری شدہ دوسری ہدایات میں نئی تشکیل شدہ چھٹی

آرمی کو ایمینز کے مقام پر صف آرا کیا گیا۔ جبکہ برطانوی مہماتی فوج، فرانس کی تیسری، چوتھی اور پانچویں آرمی کو دریائے سوم کے کنارے کنارے وارڈن تک پھیلی ہوئی لائن پر پسپا ہونے کا حکم دیا گیا۔ جہاں اپنی پوزیشن مضبوط کرتے ہوئے دشمن پر پوری قوت سے ازسرِ نو بھرپور حملے کیے جانے تھے۔

دوسری طرف مولٹک ابتدائی فتوحات کو دشمن کی مکمل ناکامی سمجھتے ہوئے فتح کے نشے میں چور ہو رہا تھا۔ جبکہ مشرقی محاذ سے روس کی افواج کے مشرقی پروشیاء پر قابض ہونے کی حوصلہ شکن خبریں آ رہی تھیں جن کی بنیاد پر مولٹک نے مغربی محاذ پر لڑنے والی افواج کے کل 16 کوروں میں سے 5 کور مشرقی محاذ پر بھجوا دیے۔ اِس طرح اِس محاذ پر جرمن افواج کی قوت پہلے سے کافی کمزور ہو گئی۔ جبکہ پہلی آرمی کے تمام کور بیلجیم اور فرانس کے شمال مغربی علاقوں میں موجود قلعہ بندیوں کو سر کرنے کی مہم میں مصروف تھے اِس طرح پہلی آرمی مکمل طور پر مصروف تھی اور فرانس کی نو مجتمع افواج اور برطانوی مہماتی فوج کے جوابی حملوں کی صورت میں دوسری اور تیسری آرمی کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

شیلفن پلان کے مطابق پہلی، دوسری اور تیسری آرمی کو حملے کرتے ہوئے پیش قدمی کرتے جانا تھا جبکہ قلعہ بندیوں کو سر کرنے اور مفتوحہ علاقوں میں فوجی انتظامات سنبھالنے کے لیے محفوظ دستوں کو تیار رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ جبکہ مولٹک نے محفوظ دستوں کو جرمنی کے اندر تک ہی محدود رکھا تھا اور باقاعدہ آرمی ہی تمام امور کی انجام دہی کی ذمہ دار تھی۔ اِس طرح محاذِ جنگ میں قوت کی کمی واقع ہو چکی تھی۔

27 اگست کو مولٹک نے بھرپور پیش قدمی کرنے کے احکامات دیے۔ جن کے مطابق پہلی آرمی کو پیرس کے جنوب میں پیش قدمی کا حکم دیا گیا تھا۔ دوسری آرمی کو پیرس کی طرف، تیسری، چوتھی اور پانچویں آرمی کو شہر کے مشرق کی طرف پیش قدمی کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ بائیں بازو کی افواج (جنوبی محاذ) چھٹی اور ساتویں آرمی کو بجائے دفاعی پوزیشن میں مورچہ بند ہونے اور دیگر حملہ آور افواج کی کمک کے آگے بڑھنے اور دریائے موسل کے کنارے محاذ قائم کرتے ہوئے فرانس اور برطانوی افواج کو چاروں طرف سے دھکیلتے ہوئے ایک بند گلی میں بند کرنے کی ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

لاکیٹاؤ اور گوئز کی لڑائیاں

مولٹک کی 27 اگست کی جاری شدہ ہدایات کے مطابق پیش قدمی کرتے ہوئے جرمنی کی دوسری آرمی کو فرانس کی پانچویں آرمی سے خاصی مزاحمت کا سامنا تھا۔ گو کہ فرانس کی پانچویں آرمی پسپا ہو رہی تھی مگر پسپائی کی متوقع رفتار نہ تھی اور مزاحمت بھی انتہائی شدید تھی۔ دوسری طرف جرمنی کی پہلی آرمی جنرل کلاک کی قیادت سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند برطانوی افواج کو تیزی سے پسپا کیے جا رہی تھی۔

لاکیٹاؤ کی لڑائی:

جرمن پہلی آرمی کا جنرل کلاک برطانوی افواج کو مغربی پہلو سے کمزور کرتے ہوئے انہیں ایک دائرے میں لینا چاہتا تھا۔ اور مسلسل حملے کرتے ہوئے برطانوی دوسرے کور کو اپنے بیس سے علیحدہ کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ دوسرے کور کے تھکے ہارے فوجی تین دن اور تین رات سے مسلسل حالتِ جنگ میں تھے اور جرمنی کی کوہ شکن افواج کے پے در پے حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے پیچھے ہٹتے چلے جا رہے تھے۔ تیسرے روز دوسرے کور کی مدد کے لیے پہلے کور کو بھیجا گیا۔ یہ کور اب تک جنگ کی شدت سے محفوظ اور تازہ دم تھا۔ یہ لاکیٹاؤ کے مقام پر دوسرے کور سے ملا جہاں جرمن افواج بہت نزدیک تھیں۔

دوسرے کور کے جنرل سمتھ ڈورن نے اپنی فوج کے مکمل طور پر تھکے ماندے ہونے کی بنا پر فیصلہ کیا کہ وہ فوری طور پر پسپا ہو جائے اور اُس کی جگہ پہلے کور کی تازہ دم افواج لے لیں۔ لیکن جرمن پہلی آرمی کے ہراول دستے پیش قدمی کرتے ہوئے دوسرے کور سے مزاحم ہو گئے۔ دوسری طرف پہلے کور کے جنرل ہیگ نے بھی اپنی افواج کو پسپا ہوتے ہوئے اپنے قدم جمانے کی ہدایت کی۔ اِس طرح دوسرے کور کا دایاں پہلو دشمن کے سامنے بے نقاب ہو گیا اور دوسرے کور کو مشرق اور شمال ہر دو طرف سے دشمن کی افواج کا سامنا کرنا پڑا۔

مقدمۃ الجیش (مرکزی فوج) مضبوط ہونے کے باوجود دوسرا کور اپنے دائیں پہلو اور سامنے سے دشمن کے نرغے میں آ گیا اور ہتھیار ڈال دیے۔ اِس صورتِ حال سے دوسرے کور کا بائیاں پہلو اور مرکز مکمل طور پر جرمن افواج کے نرغے میں آ گئے۔ اور برطانوی افواج کو شدید جانی

و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

اِس سے پہلے کہ دوسرا کور مکمل طور پر تباہ برباد ہو جاتا برطانوی توپ خانے نے جنوب مغربی جانب سے جرمن افواج پر حملہ کر کے اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی اور دوسرے کور کے بچے کھچے سپاہیوں کو مکمل طور پر پسپائی کا موقعہ مل گیا۔

دوسری طرف فرانس کی پانچویں آرمی جرمنی کی دوسری آرمی کو روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہی تھی۔ اِس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جرمنی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی افواج کی رفتار کو آہستہ کیا جائے۔ اِس طرح فرانس کی پانچویں آرمی قربانیوں کے عظیم سلسلے کے باوجود دشمن کی رفتار کو بہت حد تک سست کرنے میں کامیاب رہی تھی جبکہ اِس کا نقصان 20 فیصد رہا تھا۔

اسی دوران جنرل جوفر کو برطانوی حکام کی جانب سے مدد کی اپیل کی گئی۔ اسے بتایا گیا کہ برطانوی افواج کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور وہ مکمل طور پر تباہی کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ انہیں تباہی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ فرانس کی افواج اُن کی مدد کو آئیں اور جرمنی کی افواج کو اپنی طرف متوجہ کر کے برطانوی افواج کو سنبھلنے کا موقعہ دیں۔

اِس اطلاع پر جنرل جوفر نے پانچویں آرمی کو ہدایت کی کہ وہ جنوب کی جانب سے جرمن پہلی آرمی کے پہلو پر حملہ آور ہوں تا کہ پہلی آرمی کی توجہ سامنے موجود برطانوی افواج سے ہٹ جائے۔ جنرل چارلس کی پانچویں آرمی پہلے ہی اپنے سے دوگنا طاقتور اور لیس دشمن کی دوسری آرمی کی پیش قدمی روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اب نئے احکامات کی روشنی میں اسے جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے پر اپنے دائیں پہلو کو جنرل بُولو کے رحم و کرم پر چھوڑنا پڑتا۔ لہٰذا اُس نے اپنی آرمی کے دو (2) کور جنوب کی جانب پیش قدمی کرنے کے لیے روانہ کیے۔ ایک کور جنرل بُولو کے مقابلے کے لیے جبکہ ایک کور کو بطور محافظ فوج رہنے دیا۔

فرانس کی افواج کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ برطانوی افواج سے آپریشن کے دوران معاونت کریں جبکہ برطانوی افواج شمال کی جانب تھوڑی سی پیش قدمی کر کے آنے والے دو (2) کوروں کو اپنے قدم جمانے کا موقعہ دیں۔ لیکن برطانوی افواج نے فرانس کی تجویز مسترد کر دی۔

اِس طرح پہلے سے تناؤ کی کیفیت میں مزید اضافہ ہوا اور فرانسیسی افواج جو اپنی جانب سے برطانوی افواج کی مدد کے لیے آئی تھیں سخت بد دل ہوئیں۔

29 اگست کو جنرل بُولو کی دوسری آرمی نے شمال کی جانب سے حملہ کر دیا۔ جنرل چارلس کی پانچویں آرمی کا مغربی جانب سے کیا گیا حملہ بھی ناکام ہو چکا تھا۔ کیونکہ شمال کی جانب دو (2) کور ہٹ جانے کے باعث مرکزی کور کا کمانڈر دائیں طرف سے مکمل طور پر دشمن کے نرغے میں آچکا تھا اور دن کے پچھلے پہر پسپا ہوتے ہوئے دریائے اویز کے دوسری طرف جا کر قدم جمائے۔

پانچویں آرمی کے بالکل سامنے شمال کی سمت ایک بہت بڑی جنگ ہوئی۔ یہاں جرمنی کے دو (2) کور فرانس کی افواج کو بُری طرح دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ فرانس کی جانب سے محفوظ فوج کا پہلا کور بطور کمک پانچویں آرمی کی مدد کو آیا۔ اِس کمک سے فرانس کی افواج کے اُکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور تھوڑی ہی دیر میں فرانس کی جانب سے جوابی حملہ کیا گیا اور جرمن افواج کو اندھیرا ہونے تک پیچھے دھکیل دیا گیا۔

اِس مختصر کامیابی نے فرانس کی افواج کے حوصلے بلند کر دیے۔ حالانکہ پانچویں آرمی کا جنوب کی جانب حملہ بُری طرح ناکام ہو گیا تھا مگر شمال سے جرمنی کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے گئے تھے۔ جنرل چارلس نے ہیڈکوارٹر سے اپنے کوروں کی واپسی کے احکامات لے لیے تھے اور بڑی تیزی سے اپنی آرمی کو مجتمع کرتے ہوئے ازسرِ نو صف آراء کر لیا تھا۔ جنرل بُولو کی آرمی دشمن کی جانب سے ہونے والی شدید مزاحمت سے سخت خائف تھی اور ڈیڑھ دن تک برطانوی افواج اور اُن کے ساتھ فرانس کی افواج کو بلا روک ٹوک پسپا ہونے میں کوئی مزاحمت نہ کر سکی۔

گو کہ جنگ سے جنرل جوفر کے متوقع نتائج 100 فیصد حاصل نہ ہوئے تھے۔ تاہم وہ بہت حد تک اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک بڑی وجہ جرمنی کی پہلی آرمی کی جنوب مغرب کی جانب پیش قدمی بھی تھی جو اسے اِس محاذ سے کسی قدر دُور کر رہی تھی۔

مارن کی لڑائی

26 اگست کی لاکیٹاؤ کی لڑائی کے بعد مولٹک کی ہدایات کے مطابق جنرل کلاک اپنی آرمی کو جنوب مغرب کی جانب لے جا رہا تھا۔ 30 اگست کو جنرل کلاک کو جنرل بُولو کی جانب سے .

ایک پیغام ملا جس میں اسے بتایا گیا تھا کہ فرانس کی فوج کو بری طرح شکست ہو چکی ہے اور دشمن کو قدم جمانے سے روکنے کے لیے ایک شدید حملے کی ضرورت ہے جس کے لیے اُس کی پہلی آرمی مدد کر کے جنگ کا خاتمہ کرے۔

جنرل کلاک جو جنگ کے آغاز میں جنرل بُولو کا ماتحت تھا چند دن پہلے ہی ماتحتی ختم کر کے مطلق العنان جنرل بنا دیا گیا تھا۔ اُس نے بہتر یہ سمجھا کہ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے ہدایات لے۔ مگر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ بہت تاخیر کا باعث بنا۔ کئی دن کے انتظار کے بعد جب کوئی جواب نہ آیا تو کلاک نے فیصلہ کیا کہ وہ جنرل بُولو کے فیصلے کے مطابق عمل کرے گا۔

31 اگست کو جب جنرل کلاک کو یہ معلوم ہوا کہ جنرل بُولو بجائے گرتے ہوئے دشمن پر آخری ضرب لگانے کے ایک ہی مقام پر ایک دن سے زائد عرصے تک پڑاؤ ڈالے رہا ہے تو اُس نے سوچا کہ اِس بہترین موقعہ سے اگر جنرل بُولو فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا تو نہ اُٹھائے۔ اُسے تو بہر حال فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ لہٰذا اُس نے جنوب مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کی پانچویں آرمی دبانے اور پیرس کے مشرق میں پہنچنے کے لیے اپنی فوج کو پیش قدمی کرنے کی ہدایت کی۔

لیگزمبرگ میں مولٹک اپنی مغربی افواج سے مکمل طور پر کٹا ہوا تھا۔ فرانس کی پانچویں آرمی میں ہونے والی کمی کو پورا کرنے کے لیے تیسری اور چوتھی افواج متحرک ہو چکی تھیں۔ اور یہ تمام افواج ایک جگہ مجتمع ہو کر جرمن افواج پر ایک زوردار جوابی حملہ کرنے کے لیے تیاری پکڑ رہی تھی۔ مولٹک ابتدائی طور پر فرانس کی افواج کی پسپائی کو بھرپور شکست سمجھ چکا تھا اور یہ سوچنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا کہ جنرل جوفر کسی منصوبے کے تحت بھی اپنی افواج کو پسپائی اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔

مزید یہ کہ جنرل مولٹک اپنی میدانِ جنگ میں مصروف افواج خصوصاً پہلی اور دوسری آرمی کو یہ معلومات دینے سے بھی قاصر رہا تھا کہ فرانس کی تازہ دم افواج بذریعہ ٹرین میدانِ کارزار میں پہنچ رہی ہیں اور دوسری طرف پیرس کے اردگرد قلعہ بندیوں کا کام تیزی سے جاری ہے۔ جس کے مطابق میدان میں موجود افواج اپنی منصوبہ بندی کرتیں۔

(نقشہ مارن کی طرف جرمن پیش قدمی)
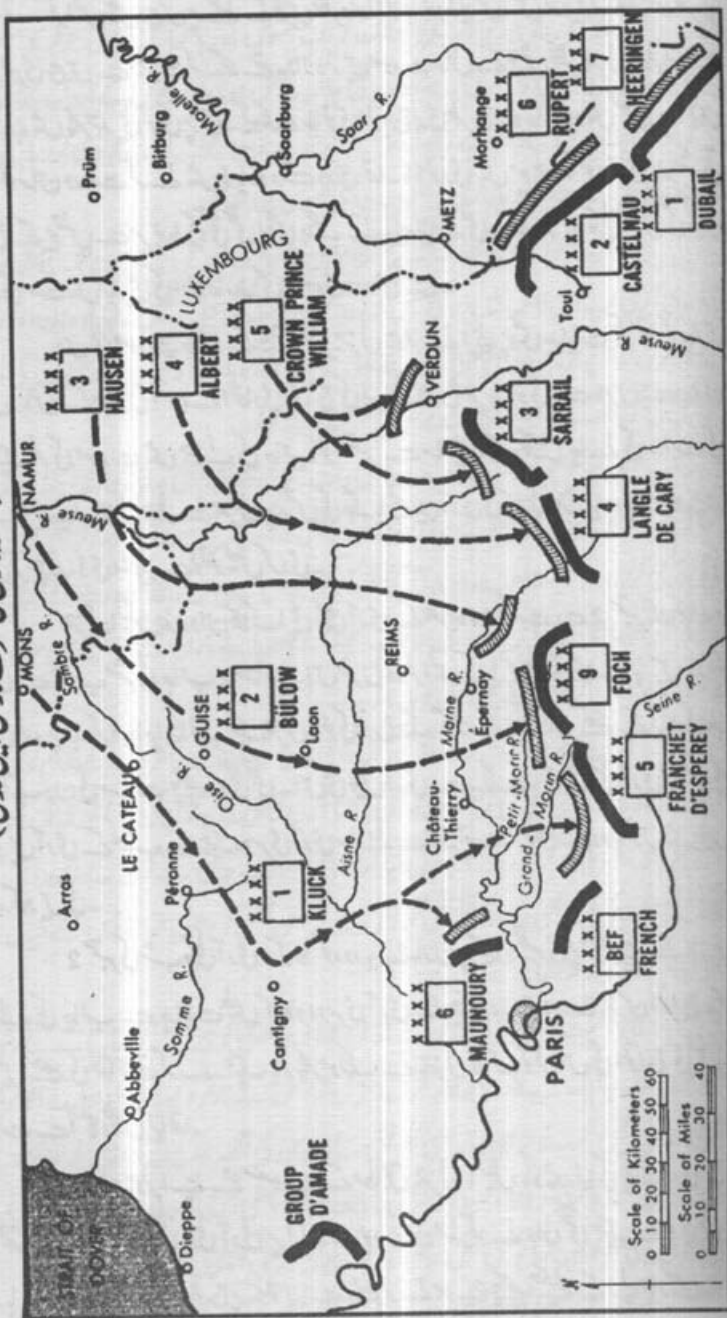
فرانس میں پیرس پر حملے کے پیشِ نظر دارالخلافہ بورڈیوکس منتقل کر دیا گیا تھا۔ اور تقریباً 5 لاکھ شہری پیرس سے ہجرت کر گئے تھے۔ تازہ ترین صورت حال کے پیشِ نظر جنرل جوفر کو اپنے منصوبے میں پھر تبدیلی کرنی پڑی۔ کیونکہ برطانوی افواج بری طرح تباہ حال ہو چکی تھیں اور انہیں اپنے اوسان درست کرنے میں زیادہ وقت درکار تھا۔ ماؤنوری میں موجود چھٹی آرمی جو مشرقی افواج کے یونٹس سے مربوط کی گئی تھی ابھی جنگ کے لیے تیار نہ تھی۔ جبکہ جرمن پہلی آرمی کی پیش قدمی کی سمت میں تبدیلی کی اطلاعات بھی موصول ہو رہی تھیں۔

اس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر جنرل جوفر نے اپنی چوتھی ہدایات یکم ستمبر کو جاری کیں۔ جن کے مطابق اُس نے اتحادی افواج کی پسپائی کا رخ مزید جنوبی سمت پیرس سے ورڈن اور ایک خم کی صورت میں جنوب کی جانب تو جینٹر سے سائین تک پھیل جانے کی ہدایت کی تھی۔ مزید یہ کہ جنرل جوفر نے جنرل چارلس کی جگہ پانچویں آرمی کی کمانڈ نسبتاً زیادہ جارحیت پسند جنرل فرینچٹ ڈی ایسپیرے کو تفویض کر دی۔

جنرل الیگزینڈر روان کلاک اپنی پہلی آرمی کے ہمراہ 31 اگست سے 2 ستمبر تک نہایت تیزی سے جنوب مشرقی جانب بڑھتا رہا۔ اِس طرح وہ فرانس کی پانچویں آرمی کے بائیں بازو کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہتا تھا۔ جبکہ جنرل بُولو کی فوج جنگِ گویز کے بعد 36 گھنٹے کے قیام کی وجہ سے ایک دِن کی مسافت پیچھے رہ گئی تھی۔ اِس نئی پیش قدمی سے یہ لگ رہا تھا کہ پہلی آرمی فرانس کی پانچویں آرمی کے عقب سے جبکہ دوسری آرمی سامنے سے حملہ آور ہو کر چکی کے دو پاٹوں میں پیس کر رکھ دیں گی۔

2 ستمبر کی شب پہلی آرمی کے 9 کور دریائے مارن پر کیٹاؤ تھیری پر پہنچ چکے تھے۔ اسے مولٹک کی جانب سے ہدایات ملیں کہ وہ دوسری آرمی کے پیچھے رہتے ہوئے جرمن افواج کے دائیں حصے کی حفاظت کرے۔ ایک بار پھر مولٹک نے جنرل کلاک کو فرانس کی افواج کی نقل و حرکت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

جنرل جوفر اپنے نئے منصوبے کے مطابق جنرل مائیکل ماؤنوری کی چھٹی آرمی کے ساتھ 6 ستمبر کو جرمنی کی پہلی آرمی پر ایک بھرپور جوابی حملہ کرنے والی تھی جبکہ برطانوی فوج اور پانچویں آرمی بھی جرمن فوج پر پہلوؤں سے حملے کرتے ہوئے پیچھے دھکیلنے کے لیے تیار تھیں۔

جرمنی کے ہیڈکوارٹر میں مولٹک کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ جنرل جوفر کا منصوبہ کیا ہے۔ فرانس کی افواج کا مشرق سے جنوب کی جانب منتقل ہونا، اور پیرس کے اردگرد بھاری فوجی نقل و حمل اسے احساس دلا رہے تھے کہ جنرل جوفر شدید جوابی حملے کے لیے تیاری کر رہا ہے۔ اب اسے نئے سرے سے منصوبہ بندی کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب شیلفن پلان کا متبادل زیرِ عمل لانا پڑے گا۔ کیونکہ پہلی اور دوسری آرمی اب اس قابل نہیں رہ گئی تھیں کہ وہ دشمن پر فیصلہ کن حملہ کر سکیں۔ لہٰذا وہ ان دو آرمیوں سے مشرقی محاذ پر فرانس کی افواج کو روکتے ہوئے باقی ماندہ پانچ آرمیوں سے جنوب کی جانب فرانس کی مجتمع ہونے والی افواج سے برسرِ پیکار کرنا چاہتا تھا۔

5 ستمبر کو مولٹک کی جانب سے اُس وقت جنرل کلاک کو نئی ہدایات ملیں جب وہ زمینی حقائق کے لحاظ سے نئے منصوبے پر درست طور پر عمل درآمد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ انتہائی تیزی سے پیش قدمی کرتا ہوا اُس مقام سے بہت آگے نکل آیا تھا جہاں سے اِس نئے منصوبے کے مطابق عمل درآمد ممکن تھا۔ اِس لیے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ دریائے مارن کے جنوب میں مزید آگے بڑھتا رہے اور فرانس کی پانچویں آرمی کو جا پکڑے۔

جنرل جوفر 2 اگست سے 6 ستمبر تک اپنی فوج کی کمانڈ اور کنٹرول کے نظام کو سختی سے درست کرتا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے تین (3) آرمی کمانڈروں، دس (10) کور کمانڈروں اور اڑتیس (38) ڈویژن کمانڈروں کو تبدیل کیا تھا۔ اِس صورتِ حال سے فوج کے اندر اُس کے خلاف مخالفت کی فضا بھی پیدا ہو چکی تھی مگر اُس نے ہر اُس شخص کو ہٹا دیا تھا جو اُس کے خیال کے مطابق اہلیت نہیں رکھتا تھا۔

26 اگست کو ہی جنرل جوفر نے جنرل جوزف گیلینی کو پیرس کے دفاع کے لیے گورنر مقرر کر دیا تھا۔ یہ ایک تجربہ کار، ماہر اور متحرک جنرل تھا جس نے جوفر کو پسپائی کی بجائے افواج کو مشرقی جانب مجتمع کرنے پر ابھارا۔ اسی جرنیل نے پیرس کی قلعہ بندیوں کا ازسرِ نو جائزہ لیتے ہوئے انہیں مضبوط کیا اور 30 اگست کو جنرل مائونوری کی چھٹی آرمی کو وہاں قلعہ بند ہو کر دیا۔ 3 ستمبر کو فرانس کی حکومت بورڈیوکس منتقل ہو گئی اور پورا پیرس جنرل گیلینی کے حوالے کر دیا گیا۔

جنرل جوفر نے اپنی چھٹی ہدایت میں فرانس کی چھٹی آرمی کو اپنی خندقوں سے نکل کر

شمال کی جانب دریائے آرک کو عبور کرتے ہوئے 6 ستمبر کی صبح دشمن پر حملہ آور ہونا تھا۔ ٹھیک اسی وقت برطانوی فوج اور فرانس کی پانچویں آرمی نے اپنے اپنے سامنے موجود دشمن سے بھڑ جانا تھا۔ جوفر کو یہ معلوم تھا کہ اگر اس حملے میں نتائج توقع کے برعکس رہے تو فرانس کے لیے ذلت آمیز شکست کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ اسی لیے اُس نے پہلی بار اپنے تمام جوانوں سے بلاواسطہ اپیل کی جس میں انہیں ملکی سالمیت کی اِس جنگ میں مزید پسپائی کے لیے کوئی جگہ نہ ہونے کی بابت بتایا۔

آرک کی لڑائی:

چھٹی آرمی 5 ستمبر کو دریائے آرک کو پار کرنے کے لیے بڑھ رہی تھی۔ اسی دوران جنرل ہینز کی قیادت میں جرمن پہلی آرمی کا چوتھا محفوظ کور جنوب کی جانب بڑھتے ہوئے دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ مارچ کر رہا تھا۔ اس وقت جنرل ہینز نے فرانسیسی افواج کی بھاری نقل و حرکت کی اطلاعات ملنے پر اپنی کمزور صورتِ حال کے باوجود فرانس کی فوج کے عزائم جاننے کے لیے ایک ہی طریقہ اختیار کیا کہ اُن پر حملہ کر دیا جائے۔

اِس اچانک حملے کے لیے چھٹی آرمی بالکل ہی تیار نہ تھی۔ جرمن افواج کامیابی سے فرانس کی چھٹی آرمی کو دھکیلتی رہیں۔ تاہم شام ہونے تک جنرل ہنز کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنے سے کئی گنا بھاری دشمن سے نبرد آزما ہے لہٰذا اُس نے اپنی افواج کو خاموشی سے پیچھے ہٹ کر ایک محفوظ دفاعی مقام پر صف آرا کر لیا۔

کلاک نے مطلع ہونے پر ایک کور مزید بھیج دیا۔ 6 ستمبر کا پورا دن چھٹی آرمی جرمنی کے دو (2) کورز کے ساتھ دریائے آرک کے کنارے برسرِ پیکار رہی۔ جرمن کور کمانڈر بار بار جنرل کلاک کو مدد کے لیے اپیل کرتے رہے لیکن جنرل کلاک اس جنگ کی اہمیت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ اگلے دِن جب فرانس کے مفتوحہ کیمپس میں سے جنرل جوفر کے ہدایت نامے کی نقل ملی تو اُس نے اپنے دو محفوظ کور مارن کے شمال سے آرک کی جانب روانہ کیے جن کی آمد سے جرمن پہلی اور دوسری آرمی کے درمیان پہلے سے پیدا شدہ فاصلہ کم ہو گیا۔

جنرل کلاک یہ سمجھ رہا تھا کہ برطانوی افواج اب مزاحمت کے قابل نہ ہیں۔ اس لیے

وہ ان سے کچھ زیادہ خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف جنرل ماؤنوری کو جنرل گیلینی کی طرف سے مسلسل کمک اور حوصلہ مل رہا تھا۔ اس نے 7 اور 8 ستمبر کو بھرپور حملے کیے۔ جنرل گیلینی نے کمک کے لیے ٹیکسیوں کو استعمال میں لاتے ہوئے دو (2) رجمنٹس کمک کے لیے بھیجیں۔ جنرل کلاک نے 9 ستمبر کو ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کا حکم دیا۔

دوسری طرف جنرل ماؤنوری نے اپنے اعلیٰ حکام سے قدم بقدم پیرس کی طرف پسپائی کا منصوبہ بنانے کی اپیل کی۔ اِس طرح فرانس کی افواج کے پیچھے مزید آگے بڑھنے پر جرمن پہلی اور دوسری آرمی کے درمیان 50 کلومیٹر کا فاصلہ پیدا ہو جاتا۔ اگر اِس لمحے جنرل بُولو کی آرمی مغربی سمت میں پیش قدمی کرتی تو یہ فاصلہ پیدا نہ ہوتا۔ جرمن افواج میں باہمی ربط کا فقدان مشاہدہ میں آتا ہے۔ اکثر اوقات ہیڈ کوارٹر سے رابطہ میں تاخیر، نامکمل معلومات اور ہدایات اور انفرادی کوششیں کسی بہتر نتیجے کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہیں۔

مارن کی دوسری لڑائی:

جنرل فرینچٹ ڈی ایسپیرے کی پانچویں آرمی 6 ستمبر کو اپنے منصوبے کے مطابق آگے بڑھ رہی تھی۔ اسے کلاک کی پہلی آرمی کے دو (2) کوروں سے مارن کے جنوب میں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور رات تک لڑائی جاری رہی۔ جب جنرل کلاک نے دریائے آرک کی لڑائی کے لیے اپنے دو (2) کوروں کو طلب کر لیا تو پانچویں آرمی کے دائیں کور نے پیش قدمی کرتے ہوئے بلا مزاحمت آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ لیکن اپنے متعین مقام پر پہنچنے سے پہلے اس کا جنرل بُولو کے ایک کور سے تصادم ہو گیا۔

جنرل فرینچٹ نے 7 ستمبر کو ایک عام حملے کا حکم دیا۔ جنرل بُولو اپنے دائیں بازو کے غیر محفوظ ہونے پر پیچھے ہٹ گیا اور حکم دیا کہ دریائے پیٹٹ۔ مارن کے دوسرے کنارے صف بندی کی جائے۔ 8 ستمبر کو فرانس کی افواج نے دوسری آرمی کا پیچھا کرتے ہوئے اُس پر دریا کے دوسری جانب حملے جاری رکھے مگر کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ سہ پہر کو جنرل بُولو نے ایک ناکام حملہ کیا جس میں اُس کی قوت میں کمی کا احساس ہونے پر جنرل فرینچٹ نے رات کے عمل میں ایک فیصلہ کن حملہ کیا جس میں فرانس کی افواج کو کامیابی ہوئی اور جنرل بُولو کی آرمی 6 میل تک پسپا ہو گئی۔

(نقشہ جنگِ مارن)
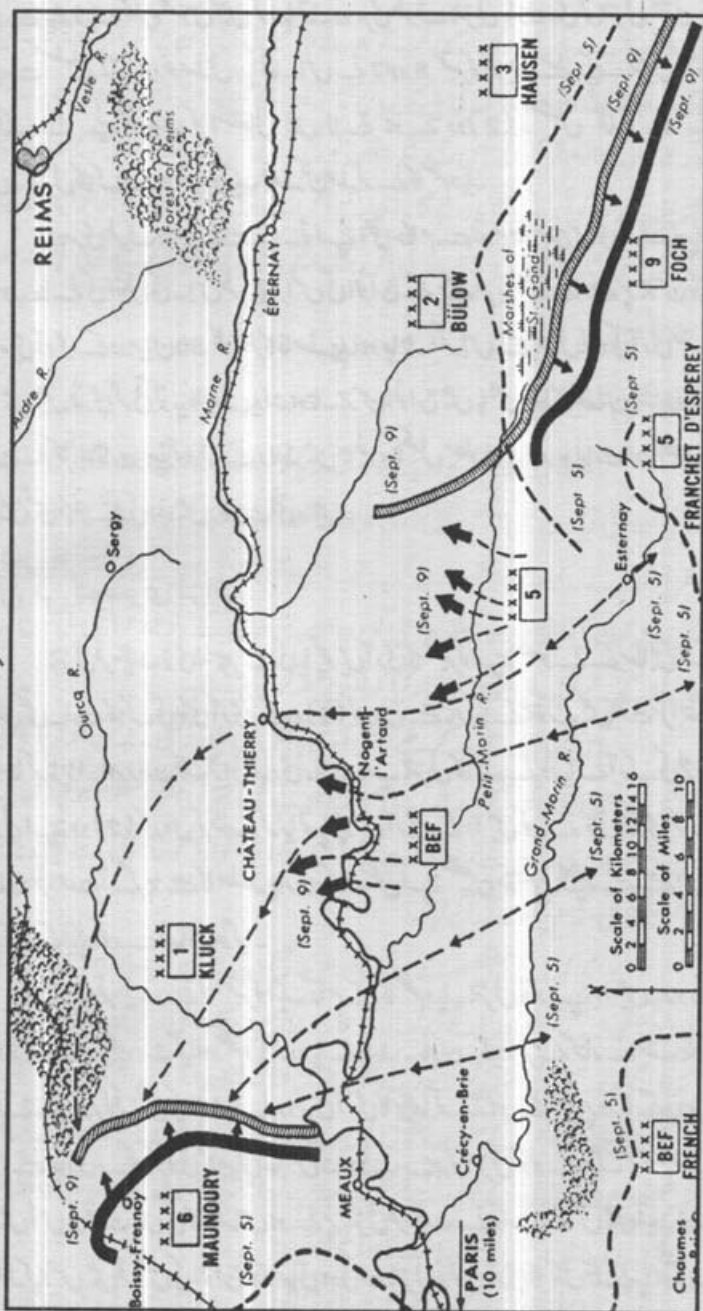
اِس حملے کے نتیجے میں پہلی اور دوسری آرمی کے درمیان ایک بہت بڑا فاصلہ پیدا ہوگیا۔صرف توپ خانے کے دو(2) کور جو بمشکل تمام 10,000 فوجیوں پر مشتمل تھے اِس فاصلے کی حفاظت کے لیے مامور تھے۔ برطانوی فوج جواب تک کوئی خاص کارکردگی نہ دکھا سکی تھی اب جوابی حملے کے لیے تیار ہورہی تھی۔اور اِس فاصلے میں گھس کر ہر دو آرمیوں کو ایک دوسرے سے کاٹنے کے لیے آگے بڑھنے لگی۔

ان کی رفتار انتہائی سست تھی جبکہ دوسری طرف جرمن محفوظ دستوں نے بھرپور مزاحمت کی اور تین دن تک برطانوی فوج صرف 25 میل تک ہی پیش قدمی کر سکی۔ اِس پیش قدمی کی وجہ بھی یہ تھی کہ محاذِ جنگ سے جرمن پہلی آرمی کے دو کور دریائے آرک کی طرف بڑھ گئے تھے اور پیچھے برطانوی فوج کی مزاحمت کے لیے کوئی خاص فوج نہیں رہ گئی تھی۔

اب جرمن افواج کے لیے صورتِ حال انتہائی نازک ہو چکی تھی۔ برطانوی فوج درمیانی فاصلے میں سے ہوتے ہوئے جرمن پہلی آرمی کے عقب میں پہنچ سکتی تھیں۔ جبکہ فرانس کی پانچویں آرمی جرمنی کی دوسری آرمی کے دائیں بازو پر بھرپور حملہ کر سکتی تھی۔ مگر اِس کے لیے ضروری تھا کہ ایک طرف تو جنرل مانویوری پہلی آرمی کے سامنے ڈٹا رہے۔ دوسری طرف جنرل فوش اپنی نویں آرمی کو جرمن دوسری آرمی کے بائیں بازو اور جنرل ہوسین کی تیسری آرمی کے مخالف الجھائے رکھے۔

سینٹ گانڈ کے دلدلی علاقوں کی لڑائیاں

جنرل مولٹک کے نئے منصوبے کے مطابق جنرل بُولو اور جنرل ہوسین کو پیرس کی طرف بڑھنا تھا۔ اِس کاوش کے دوران دونوں کو فرانس کی نئی تشکیل شدہ نویں آرمی جس کی کمان جنرل فوش کر رہا تھا، کو چیرتے ہوئے گزرنا تھا۔ 6 ستمبر کو جنرل فوش اپنے دائیں بائیں اور سامنے سے دشمن کی دو(2) افواج کے انتہائی زوردار حملوں کا سامنا کر رہا تھا۔ جنرل فوش اپنی آرمی کے مرکز کو بچاتے ہوئے دلدلوں کے جنوب کی طرف ہٹنے پر مجبور ہوگیا۔

جنرل ہوسین نے دشمن کی جانب سے سخت مزاحمت کے پیشِ نظر رات کی تاریکی میں ایک منفرد حملے کو ترتیب دیا جس کے تحت 8 ستمبر کی رات 3 بجے چاند کی روشنی میں انتہائی ہلکے

ہتھیاروں کے ساتھ اُس نے فرانس کی نویں آرمی پر شدید حملہ کیا جس میں بہت کامیابی ہوئی اور دشمن کی افواج تین (3) کلومیٹر تک پیچھے دھکیل دیں۔ جنرل فوش نے اپنی باقی ماندہ فوج کے لیے ایمرجینسی کا اعلان کرتے ہوئے حملے کا حکم دیا۔ اس سے فوج کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اب پسپائی نہیں ہوگی بلکہ صرف حملے ہی ہونگے۔ اِس صورتِ حال نے جرمنی کی دوسری آرمی کے جرنیل بُولو کو متحیر کر دیا اور جرمن افواج دو (2) روز کی شدید مزاحمت سے عاجز آگئیں۔

9 ستمبر کو جنرل ہوسین کی آرمی نے متواتر سخت ترین حملے شروع کر دیے۔ قریب تھا کہ فرانس کی نویں آرمی پیچھے ہٹتے ہٹتے پیرس کے اردگرد جنگ حصار کی جانب بڑھنے لگے۔ مغربی محاذ سے آنے والی حوصلہ شکن خبروں نے جرمن افواج کے مورال کو گرا دیا۔ فرانس کی پانچویں آرمی سے ایک کور بھی جنرل فوش کی مدد کے لیے آگیا اور جرمن اعلیٰ حکام کی جانب سے پیرس پر حملے سے دستبرداری کا حکم بھی آگیا۔ اِس طرح جنرل فوش کے باہمت اقدام نے جنگ کی شکست کو فتح میں بدل دیا۔ اور جنگ کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

جنوبی محاذ پر لڑائی:

فرانس کی چوتھی آرمی جنگِ آرڈینیس کے بعد قدم بقدم پسپا ہو رہی تھی۔ 5 ستمبر کو اسے جنرل جوفر کے نئے منصوبے کا فرمان ملا۔ اِس وقت یہ آرمی نویں اور تیسری آرمی کے درمیان ایک بہت بڑے فاصلے میں موجود تھی۔ اِس کا بنیادی مقصد جرمن افواج کو اِس فاصلے میں داخل ہو کر فرانس کی افواج پر حملہ کرنے کا موقع ختم کرنا اور وہاں مزاحمت کر کے دشمن کی نقل و حرکت روکنا تھا۔ اس کے مدِ مقابل جرمنی کی چوتھی آرمی تھی۔ جس کی کمان شہزادہ البرٹ ڈیوک کر رہا تھا۔ اِس آرمی کے مشرق میں جرمنی کی پانچویں آرمی شہزادہ ولیم کی کمان میں صف آرا تھی۔

ابتدائی طور پر جرمن چوتھی آرمی فرانس کی چوتھی آرمی پر حملے کرتی رہی جو کامیابی سے رد کر دیے جاتے رہے۔ تاہم فرانس کی چوتھی آرمی کے دائیں اور بائیں جانب کافی فاصلے تک فرانس کی افواج نہ تھیں۔ جرمنی کے دونوں شہزادوں میں تکرار رہا کہ کس طرف سے بڑھ کر حملہ کرتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جایا جائے۔ آخر کار مولٹک سے مدد لی گئی لیکن اُس نے دونوں شہزادوں کے درمیان آنے سے احتراز کیا۔

فرانس کی چوتھی آرمی کی مدد کے لیے کمک آنے سے اس کی پوزیشن مضبوط ہوگئی اور وہ کامیابی سے جرمن چوتھی آرمی کے حملوں کا دفاع کرتی رہی۔ اسی دوران فرانس کی چوتھی آرمی نے بڑھ کر زوردار حملوں سے جرمنی کی چوتھی آرمی کو شمال کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جبکہ دوسری طرف جرمنی کی پانچویں آرمی فرانس کی تیسری آرمی سے مدِ مقابل تھی۔ پانچویں آرمی کے کمانڈر شہزادہ ولیم نے 4 دنوں میں متعدد بار کوشش کی کہ وہ تیسری اور چوتھی آرمی کے درمیانی فاصلے میں قدم جما کر دشمن کی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کر دے مگر ناکام رہا۔ 10 ستمبر کو آخر کار اسے شمال کی جانب پسپا ہونا پڑا۔

فرانس کی پہلی اور دوسری آرمی جرمن افواج سے جنگ کے آغاز سے جنگِ مارن تک مسلسل برسرِ پیکار رہیں۔ 24 اگست کو لورین کی لڑائی سے پسپائی کے بعد جرمن افواج آہستہ آہستہ فرانس میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ تاہم فرانس کی پہلی اور دوسری آرمی جلد ہی مجتمع ہو کر مستحکم ہو چکی تھیں۔ جرمن افواج جن کے عزائم تھے کہ وہ موسل تک بڑھتے ہوئے فرانس کی دفاعی لائن کو کمزور کر کے رکھ دیں گے، اپنے سامنے انتہائی سخت مزاحمت پا رہی تھیں۔ حالانکہ جنرل جوفر اس محاذ سے کئی دستے اور کور بائیں طرف کے محاذوں پر منتقل کر چکا تھا۔ 3 ستمبر سے 10 ستمبر تک جرمن افواج کی جانب سے انتہائی سخت حملے کیے گئے۔ لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اب مولٹک کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ شیلفن کا اندازہ درست تھا کہ لورین کے علاقے کسی بڑے اور بہتر حملے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اِس لیے اُس نے مزید حملے روکتے ہوئے آئزن کی طرف بڑھنے کی ہدایت کی۔

جنرل مولٹک نے اپنے خاص انٹیلی جینس کمانڈر کو جنگ کی صورتِ حال جاننے کے لیے روانہ کیا جس نے محاذِ جنگ کے تمام اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ 10 ستمبر کی سہ پہر کو پیش کی جس کے بعد جنرل مولٹک نے از خود محاذ کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ جائزہ لینے پر حالات حوصلہ شکن پائے اور حکم دیا کہ جرمن افواج پسپا ہوتی ہوئی نویون۔ واردن کی لائن پر دفاعی پوزیشن میں صف آرا ہو جائیں۔ 14 ستمبر تک جرمن افواج اپنی نئی دفاعی پٹی پر صف آرا ہو چکی تھیں۔ اور مارن کی لڑائی اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔

اسی روز جنرل مولٹک کو برطرف کرتے ہوئے اُس کی جگہ جنرل ایرک وان فالکن

ہینٹن کو چیف آف سٹاف بنا دیا گیا۔ تاہم اِس خبر کو فوج کے مورال گرنے کے ڈر سے خفیہ رکھا گیا۔ اور جنرل مولٹک کو ہیڈ کوارٹر میں رہنے کا پابند رکھا گیا۔ اِس خبر کا باقاعدہ اعلان یکم نومبر کو کیا گیا۔

آئزن کی پہلی لڑائی:

جرمن افواج پسپا ہوتی ہوئی دریائے آئزن کے دوسری طرف جا کر ازسرِ نو صف آرا ہوئی تھیں۔ اُن کی پوزیشن دریا سے دو میل شمال میں بلندی پر تھی۔ 13 ستمبر کو اتحادی افواج نے معمولی مزاحمت کا سامنا کرتے ہوئے دریا پار کر لیا اور اگلے ہی روز حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو 18 ستمبر تک جاری رہا۔ حملوں کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہونے پر جنرل جوفر نے مزید حملے روکنے کا حکم دیا۔

اِس جنگ سے فرانس کی افواج کو حوصلہ ہوا کیونکہ قبل ازیں وہ پسپا ہوتے ہوئے دفاعی انداز سے لڑ رہے تھے جبکہ اِس جنگ میں پہلی بار وہ دشمن پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ دوسری طرف جرمن افواج جو پے در پے فتوحات کے بعد اپنے خیال میں دشمن کی کمر توڑ چکی تھیں، اچانک دشمن کو اپنے مدِ مقابل انتہائی زور آور اور مضبوط پا رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے اُن کے مورال پست ہو گئے تھے۔

پہلی جنگ تھی جو خندقوں میں لڑی گئی۔ جرمن افواج اپنے مورال پست ہونے کے باوجود ایک بار پھر سنبھل کر میدانِ جنگ میں دفاعی انداز سے لڑ رہی تھیں۔ اُن کی مدتوں سے کی گئی دفاع کی تربیت اب کام دکھا رہی تھی۔ جرمن توپ خانے کے لیے اِس انداز کی جنگ ایک بہترین میدانِ عمل ثابت ہو رہی تھی۔ اِس جنگ میں ہوائی جہازوں کا استعمال بھی کیا گیا۔

اب جنگ کی صورتِ حال پہلے سے مختلف ہوتی جا رہی تھی۔ جرمن اور فرانسیسی افواج میٹز سے نویون تک ایک لمبی پٹی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھیں۔ اسی دوران اتحادیوں نے شمال کی جانب سے دشمن کے دائیں پہلو کو نرغے میں لیکر دشمن کو کمزور کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اِس طرح شمال کی جانب سمندر کی طرف ایک دوسرے پر مناسب جگہ سے حملہ کرنے کی ایک دوڑ کا آغاز ہو گیا۔
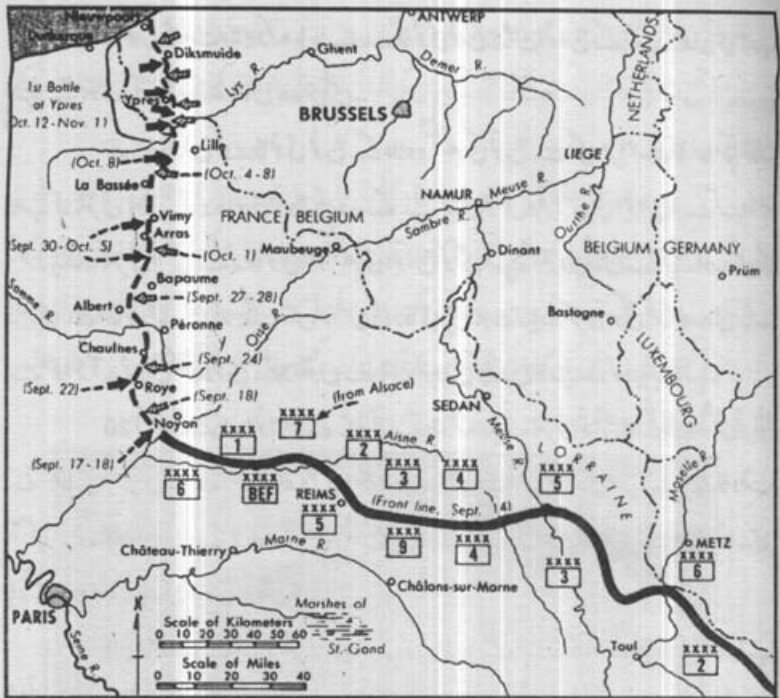
(نقشہ جنگ آئزن اور شمال میں لڑائیوں کا سلسلہ)

شمال کی جانب دشمن کے پہلو سے حملہ کر کے کمزور کرنے کی کوشش میں لڑائیوں کا یہ سلسلہ ماہ ستمبر تا اکتوبر جاری رہا۔ اور ہر دو فریقین نے اپنی افواج کو مشرق سے مغرب کی طرف منتقل کر کے دشمن پر حملوں کی کوشش کی مگر کسی ایک کو بھی کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ تاہم اِس سلسلہ میں کئی خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اِن تمام لڑائیوں میں سب سے مشہور لڑائی یپرس کی پہلی لڑائی ہے۔

یپرس کی پہلی لڑائی:

12 اکتوبر کو جرمن جنرل فالکن ہائن نے بیلجیم کے ایک قصبے یپرس پر برطانوی مہماتی فوج کو کمزور پا کر اپنی پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ حملے کا مقصد یہ تھا کہ اِس مقام سے دشمن کی صفوں میں شگاف ڈال کر آگے بڑھا جائے اور دشمن کی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے انہیں

دو سمتوں سے گھیر کر نیست و نابود کر دیا جائے۔ برطانوی فوج جرمن افواج کے شدید حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے آئے روز نڈھال ہو رہی تھی۔

جرمن افواج کو برطانوی فوج کے علاوہ بیلجیم کی فوج سے بھی مزاحمت کا سامنا تھا۔ جب کہ جنرل جوفر نے برطانوی فوج کی مدد کے لیے جنرل فوش کو فرانس کی افواج دے کر روانہ کر دیا تھا۔ جنرل فوش نے برطانوی اور بیلجیم کی افواج کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اور دشمن کا دلیری سے مقابلہ کیا۔ کئی بار جنگ میں فرانس کی دفاعی پٹی بہت زیادہ کمزور ہو گئی مگر اندرونِ ملک سے متواتر آنے والی محفوظ فوج کے دستوں سے اِس کمزوری کو فوری طور پر دور کر دیا جاتا رہا۔

20 اکتوبر کو جرمن افواج نے حملے کرنے بند کر دیے۔ جنرل فوش اور فیلڈ مارشل فرینچ نے سمجھا کہ دشمن کی حالت انتہائی مخدوش ہو چکی ہے۔ اِس لیے اُس پر کاری ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے بڑھ کر جرمن افواج پر حملہ کر دیا۔ کیونکہ موسم انتہائی سرد ہو چکا تھا۔ تیز بارشیں اور برف باری شروع ہو چکی تھی۔

اِن حالات کے پیشِ نظر جرمن جنرل نے مزید حملے کرنے کا ارادہ ملتوی کیا تھا۔ اب فرانس اور برطانوی افواج کی جانب سے حملے ہونے پر جرمن افواج نے بھرپور جوابی حملے کیے جس پر اتحادی افواج کو شدید نقصان اُٹھانے پڑے۔ آخر 28 اکتوبر کو جنرل فوش نے نقصانات کی زیادتی کے باعث حملے بند کر دیے۔

جنرل فالکن ہائن نے اگلے روز جوابی حملوں کا آغاز کر دیا۔ اِن حملوں کے تیسرے روز برطانوی دفاعی لائن انتہائی کمزور ہو گئی۔ قریب تھا کہ جرمن اِس لائن میں شگاف بنا کر اتحادی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے۔ مگر تمام محفوظ دستوں کو جنگ میں جھونک دینے پر ہی برطانوی افواج اپنی دفاعی لائن مضبوط کر سکیں۔ جنرل فالکن ہائن نے 11 نومبر تک حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر کوئی خاص فتح حاصل نہ ہو سکی۔

یپرس کی لڑائی میں برطانوی دفاع بری طرح ناکام ہو گیا تھا۔ برطانوی فوج کے 75000 جوان کام آئے تھے۔ جبکہ بیلجیم کی فوج کا 35 فیصد جانی نقصان ہوا تھا۔ فرانس کی فوج کو بھی اسی قدر نقصانات اُٹھانا پڑے تھے۔ تاہم جرمنی کے 135000 جوان بھی اِس جنگ میں مارے گئے۔ جرمن افواج یپرس کے اردگرد پہاڑوں پر صف آرا ہونے کے باعث اس قصبے میں

اتحادی افواج کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتی رہتی تھیں۔ اِس طرح عددی اور پوزیشن کی برتری کے باوجود متوقع نتائج حاصل نہ ہو سکے تھے۔ یپرس کی لڑائی اتحادی افواج کی مزاحمت کی علامت کے طور پر مشہور ہوئی۔

1914ء میں مغربی محاذ پر یپرس کی پہلی لڑائی سب سے آخری اہم لڑائی تھی۔ دونوں اطراف نے گہری خندقیں کھود کر دشمن کے مقابلے کا طریقہ کار اختیار کر لیا تھا جو اگلے چار (4) سال تک جاری رہا۔ کئی مقامات پر دو خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ ایک خندق محاذ جنگ پر جسے محاذ کی لائن کہتے تھے۔ اِس کی گہرائی قدِ آدم کے لگ بھگ رکھی جاتی تھی۔ جبکہ دوسری خندق عقب میں کھودی جاتی تھی جسے سپورٹ لائن کا نام دیا گیا تھا۔

(اتحادی سپاہی خندقوں میں)

خندقوں کی اِس لڑائی کی ابتدائی سردیاں ہر دو فریقین کے لیے سخت ترین تھیں۔ کیونکہ کوئی بھی خندقوں میں رہ کر جنگ کرنے میں صحیح طور پر مہارت نہیں رکھتا تھا۔ تاہم آنے والے

سالوں میں خندقوں میں رہنے والی افواج کی زندگی اس قدر بری نہیں رہ گئی تھی۔

1914ء کے اختتام پر فرانس کے 380000 جوان مارے گئے تھے جبکہ 6 لاکھ زخمی، قیدی کا لاپتہ تھے۔ دوسری طرف جرمنی کی افواج کا نقصان نسبتاً کافی کم تھا۔ جنگِ مارن جرمنی کی بڑھتی ہوئی فتح کے لیے دیوارِ چین ثابت ہوئی تھی۔ مغربی محاذ پر اتحادی افواج کی شکست فتح میں تبدیل ہو گئی تھی اور جرمن افواج کی ابتدائی فتوحات بھی چار (4) سال بعد بالآخر شکست میں بدل رہی تھیں۔

مشرقی محاذ

مشرقی محاذ پر روس اور جرمنی کے درمیان ایک بہت وسیع میدانِ جنگ تھا جس کے درمیان میں پولینڈ کا 230 میل لمبا اور 240 میل چوڑا ابھاروں والا علاقہ تھا۔ وارسا کا قلعہ بند شہر دریائے وِسٹولا کے کنارے واقع تھا جو اِس ابھار والے علاقے سے گزرتا ہے۔

روس کو وارسا کے راستے جرمنی پر حملہ کرنے میں شمال کی جانب مشرقی پروشیا اور جنوب کی گلیشیا سے خطرہ تھا۔ اِس لیے روسی افواج کے لیے پہلے مشرقی پروشیا یا گلیشیا پر قبضہ کرنا بہت اہم تھا۔ کیونکہ شمال سے مشرقی پروشیا اور جنوب سے آسٹریا۔ ہنگری کے گلیشیا کی جانب سے متواتر حملے روسی افواج کو دریا کی تقسیم کے مطابق دو حصوں میں تقسیم کر کے بری طرح ہلاک کر سکتے تھے۔

اِس صورتِ حال سے بچنے کے لیے روس نے ہر دو طرف مضبوط قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں۔ اور اِن علاقوں میں اپنی افواج کو وارسا کے جنوب میں نہیں رکھا تھا۔ اِس علاقے میں نہ ہی ریلوے لائن تھی اور نہ ہی سڑکوں کا کوئی مناسب نظام تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ جرمن افواج کے حملے کی صورت میں انہیں نقل و حمل میں شدید دشواری ہو۔

دوسری طرف جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری نے اپنے علاقے بچانے کے لیے قلعہ بندیاں کر رکھی تھیں۔ جرمنی نے 17 ریلوے لائنیں بچھا رکھی تھیں جبکہ آسٹریا۔ ہنگری نے 7۔ اِس طرح جرمنی بالخصوص اور آسٹریا۔ ہنگری بالعموم اعلانِ جنگ کے چند ہی دنوں میں بہت بڑی افواج کو اپنے جملہ ساز و سامان کے ساتھ سرحد پر لا سکتا تھا۔ جبکہ دوسری طرف روس کے ذرائع نقل و حمل انتہائی پسماندہ اور خستہ حال تھے۔ جہاں افواج کو کمک اور شب خون مارنے کے لیے نقل مکانی

کرنے میں شدید دشواری اور مشکلات کا سامنا تھا۔

1890ء میں جرمنی کے فیلڈ مارشل کاؤنٹ ہیلمتھ وان مولٹک کے منصوبے کے مطابق جرمنی فرانس پر حملہ کرنے سے پہلے مشرقی محاذ پر روس کو نیست ونابود کرے گا۔ جبکہ کاؤنٹ الفریڈ وان شیلفن نے اِس کے بالکل برعکس پہلے فرانس کے خلاف جنگ میں پوری قوت صرف کرنے اور بعدازاں روس سے مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کے مطابق جرمنی کے تمام افواج مغربی محاذ پر 6 ہفتے کے اندر اندر فرانس کو شکست دے کر روس کی طرف متوجہ ہو جائیں گی۔ اِس دوران روس اپنی سست نقل وحرکت کے باعث جرمنی پر حملہ نہیں کر سکے گا۔

روس اور آسٹریا۔ ہنگری جنگ کے دو منصوبے رکھتے تھے۔ روس کا پہلا منصوبہ اِس خیال کے پیشِ نظر تھا کہ جرمنی پہلے مشرقی محاذ پر روس سے جنگ کرے گا۔ اِس منصوبے کے مطابق روس کی افواج کو دفاعی انداز سے لڑتے ہوئے ابتدائی طور پر پسپا ہوتے ہوئے جرمن افواج کو ایک نسبتاً بہتر مقام تک لانا تھا جہاں سے شدید جوابی حملوں کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے شدید نقصان پہنچانا تھا۔

جبکہ دوسرا اور اصل منصوبہ اِس خیال کے تحت بنایا گیا تھا کہ جرمن افواج فرانس پر حملہ کرنے کے لیے اپنی پوری قوت مغربی محاذ پر صرف کریں گی۔ اِس طرح روسی افواج جارحانہ انداز سے حملہ کرتے ہوئے مشرقی پروشیا کو اپنے قدموں تلے روندتی ہوئی برلن کی طرف بلا روک ٹوک پیش قدمی کریں گی۔

آسٹریا۔ ہنگری کا پہلا منصوبہ روس کے جنگ سے لاتعلق رہنے کے مفروضے کی بنیاد پر تھا۔ اِس صورت میں سربیا پر آسٹریا۔ ہنگری کی تین (3) افواج حملہ کرتیں جبکہ بقیہ تین (3) افواج روس کی سرحد پر حفاظت کے لیے کھڑی رہتی۔ دوسرا منصوبہ بیک وقت سربیا اور روس سے جنگ کی صورت میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اور یہی منصوبہ زیرِ عمل لایا گیا۔ اِس منصوبے کے تحت دو (2) افواج سربیا پر حملہ آور ہونا تھیں جبکہ بقیہ چار (4) آرمیز کو روس کے خلاف جنگ کریں گی۔

ٹیننبرگ کا محاذ

روس اپنے اتحادی فرانس کی خوشنودی اور اپنے دیرینہ دشمن جرمنی پر حملہ کرنے کے لیے

جنگ کے آغاز سے ہی بے چین تھا۔ جنگ چھڑتے ہی روسی جنرل آف سٹاف کو معلوم ہو گیا تھا کہ جرمنی فرانس پر حملہ کر چکا ہے۔ اِس صورتِ حال میں دوسرا منصوبہ عمل میں لایا گیا۔ جس کے تحت 20 لاکھ فوج جو روس کی کُل فوج کا ایک تہائی تھا، جرمنی کی سرحد پر صف آرا کر دی گئی۔

مشرقی پروشیا پر مشرق اور جنوب مشرق سے حملہ کرنے کے لیے پہلی آرمی جنرل پاول رینن کیمپف اور دوسری آرمی جنرل الیگزینڈر سام سونو کی قیادت میں روانہ کی گئی۔ اِن دو آرمیز کی کمان جنرل آئیوان ژیلین سکا ئیکے ذمے تھی۔ جو وارسا سے اِن کی نگرانی اور کمک و رسد کا انتظام کر رہا تھا۔

جنرل ژیلین سکائی نے اپنے دونوں افواج کو تیزی سے سرحدوں کی طرف بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ 17 اگست کو جنرل رینن کیمپف کی پہلی آرمی نے سرحد پار کی۔ منصوبے کے مطابق جنرل سام سونو کو 5 دِن بعد سرحد عبور کرنا تھی۔ جنرل رینن کیمپف نے جرمن افواج کو شمال اور مشرق میں منتشر کرنا تھا جبکہ جنرل سام سونو نے آگے بڑھ کر اُن کے عقب سے حملہ آور ہو کر کاٹتے ہوئے پہلی آرمی سے آن ملنا تھا۔

جرمن مشرقی محاذ کے کمانڈر جنرل میکس وان پریٹ ویٹز نے روس کی پہلی آرمی کو مشرقی پروشیاء میں داخل ہو کر آگے بڑھنے کا موقع دینے اور پھر اچانک اُس پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے سرحد پار دھکیل دینے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اِس کے پہلی کور کے سرگرم کمانڈر جنرل ہرمن وان فرینکوئز نے از خود آگے بڑھ کر روس کی پہلی آرمی کا راستہ روک دیا۔ اور روسی افواج کو بھاری جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ جنرل فرینکوئز کا یہ عمل ایک مستحسن اقدام تھا مگر دوسری طرف جنرل پریٹ وٹز کے منصوبے کے منافی تھا۔

جنرل پریٹ وٹز کے لیے وقت بہت قیمتی تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ 5 دِن بعد جنرل سام سونو اپنی دوسری آرمی کے ہمراہ سرحد عبور کر لے گا۔ اس لیے اسے 5 دِن سے پہلے پہلے روس کی پہلی آرمی سے فیصلہ کن جنگ کر کے اسے انتہائی لاغر کرتے ہوئے سرحد پار دھکیلنا اور جنوب میں آنے والی پہلی آرمی کے لیے صف آرا ہونا تھا۔ خوش قسمتی سے جنرل رینن کیمپف کو کسی بڑے خطرے کا احساس ہی نہ ہوا اور وہ جنرل فرینکوائز کے اچانک پیچھے ہٹ جانے کے باوجود مسلسل دو (2) دِن تک آگے بڑھتا رہا۔

(نقشہ ٹینن برگ کی لڑائی)
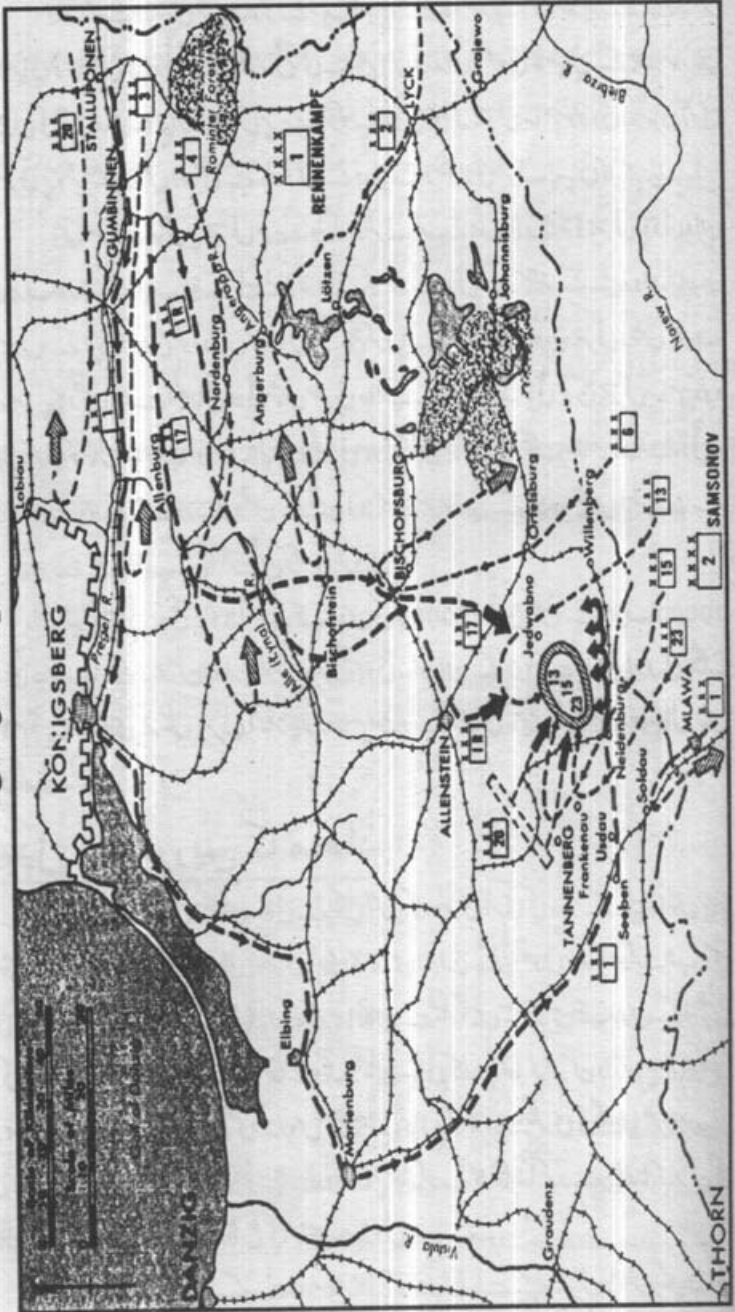
20 اگست کو جنرل پر یٹ وٹز نے ایک بھرپور حملے کا حکم دیا۔ اِس شدید حملے سے خاطر خواہ کامیابی تو حاصل نہ ہوئی مگر کسی قدر فتح ملی۔ تاہم اِس ابتدائی معمولی کامیابی کے بعد صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ اسی روز جنرل پر یٹ وٹز کو یہ اطلاع ملی کہ جنرل سام سونووکی دوسری آرمی بھی مشرقی پروشیا میں داخل ہو چکی ہے۔ تو اُس نے دریائے وسٹولا کی طرف پسپائی کا حکم دیا۔

اِس صورتِ حال پر جنرل پر یٹ وٹز کو برطرف کرتے ہوئے ریٹائرڈ جنرل پاؤل وان ہنڈن برگ اور جنرل ایرک ایف ڈبلیو لیوڈنڈروف کو صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے روانہ کیا۔ ہر دو جرنیلوں نے اپنی افواج کو دونوں محاذوں پر تقسیم کر دیا۔ اِس طرح جو فوج جنرل رینن کیمپف سے برسرِ پیکار تھی وہ اسے الجھاتی ہوئی شمال مغربی جانب لے گئی۔ جبکہ باقی فوج جنرل سام سونوو کی پہلی آرمی کو شمال، جنوب اور سامنے سے گھیرتی ہوئی ٹینن برگ کے تنگ مقام تک لے آئی۔ یہاں جرمن فوج کے پہلے کور نے دشمن کے تین (3) کور جو عقب کے علاوہ تینوں اطراف سے گھرے ہوئے تھے، عقب میں آ کر دشمن کو محصور کر دیا۔

شدید لڑائی ہوئی۔ 31 اگست تک روس کی 150000 فوج میں سے صرف 10000 فوجی ہی جان بچا سکے۔ جرمن افواج کو شاندار فتح ہوئی۔ اور ان کے 10 سے 15 ہزار فوجی جنگ میں کام آئے۔ روسی جرنیل جنرل الیگزینڈر سام سونوو نے انتہائی مایوس کن صورتِ حال میں خودکشی کر لی۔

جھیل میسورین کا محاذ

روس کے جرنیل زھیلن سکائی نے پہلی آرمی کو دوسری آرمی کی مدد کے لیے واپس بلایا مگر پہلی آرمی کے پہنچنے سے قبل ہی دوسری آرمی کا جرمن افواج کے ہاتھوں صفایا ہو گیا۔ تب پہلی آرمی نے واپس اپنے محاذ کا رخ کیا۔ اب بحیرہ بالکان سے لیکر جھیل میسورین تک روس کے اولین محاذ کی پٹی پر پہلی آرمی کو صف آرا ہونا تھا۔ کیونکہ زھیلن سکائی سمجھ رہا تھا کہ جرمن وارسا پر ضرور حملہ آور ہوں گے۔ اِس کی وجہ یہ بھی تھی کہ روس کے جنوبی محاذ پر آسٹریا۔ ہنگری کی گلیشیا میں صورتِ حال بہت نازک تھی اور وہ جرمن افواج سے وارسا پر حملہ کرنے کا تقاضا کر رہے تھے تا کہ دشمن کی توجہ گلیشیا سے ہٹ کر وارسا کے دفاع کی جانب مبذول ہو جائے۔

لیکن جرمن افواج کے لیے وارسا پر حملہ آور ہونے سے پہلے جنرل رہینن کیمپف کی

آرمی کو ختم کرنا اہم تھا۔ 10-9 ستمبر کو جرمن پہلے کور نے لائک کے قریب روس کے دوسرے کور کو شدید لڑائی کے بعد پسپا کر دیا۔ جنرل رہینن کیمپف نے ایک اور ٹینن برگ کے خوف سے فوراً ہی اپنی افواج کو دستبردار ہوتے ہوئے پسپائی کا حکم دیا۔

لیکن چونکہ ابھی روسی افواج پوری طرح زیرِ وزبر نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں دم خم باقی تھا۔ اس لیے جنرل رہینن کیمپف نے جرمن حملے کے خدشے کے پیشِ نظر ایک جوابی حملہ کیا۔ جس میں جرمن افواج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ تاہم روس کی پہلی آرمی کو 50 گھنٹے میں 55 کلومیٹر پسپا ہو کر روس کی سرحد میں داخل ہونا پڑا۔ اس مرتبہ جنرل رہینن کیمپف کی پہلی آرمی دوسری آرمی کی طرح مکمل طور پر گھیرے میں نہ آسکی۔ پھر بھی جرمن افواج روس کی پہلی آرمی کو شدید نقصانات پہنچانے میں کامیاب رہیں۔
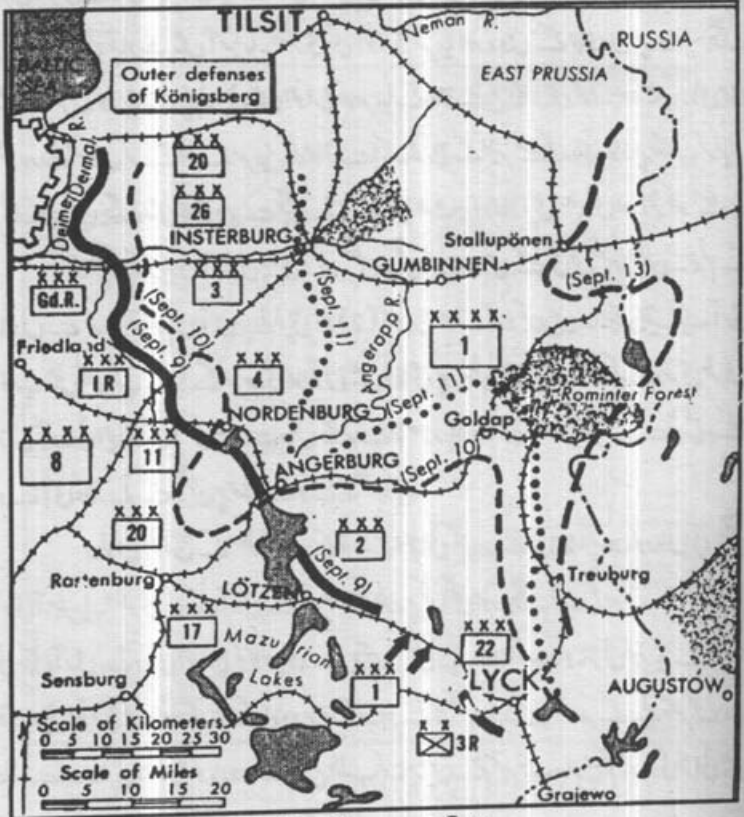
(نقشہ جھیل میسورین کی لڑائی)

اِس طرح صرف تین ہفتوں میں ہنڈن برگ، لیوڈنڈروف اور فرینکوئز نے مشرقی پروشیا کو دشمن کے قبضے سے نہ صرف چھڑا لیا بلکہ دشمن کو شدید نقصانات بھی پہنچائے۔ دوسری جانب جنرل زہیلین سکائی جو روسی ہیڈ کوارٹر میں جنرل رینین کیمپف کے نااہل ہونے کی شکایات کر رہا تھا، 17 ستمبر کو برطرف کر دیا گیا اور اُس کی جگہ جنوب میں گلیشیا کے محاذ پر کامیابیوں سے ہم کنار ہونے والے جرنیل نیکولائی روسکی کو کمانڈر مقرر کیا گیا۔

گلیشیا اور پولینڈ کے محاذ

جب جنرل زہیلن سکائی کی افواج مشرقی پروشیا سے پسپا ہو رہی تھیں، روس کی دیگر افواج جنرل نیکولائی ایوانو کی قیادت میں آسٹریائی گلیشیا میں برسرِ پیکار تھیں۔ ان کے مدِ مقابل جنرل کونریڈ کی قیادت میں آسٹریا۔ ہنگری کی افواج سربیا اور روس کے محاذوں پر برسرِ جنگ تھیں۔ جنرل کونریڈ نے پہلے اپنی تین افواج کو سربیا کے مقابلے پر لگائے رکھا۔ بعد میں روسی محاذ پر ضرورت محسوس کرتے ہوئے سربیا کے محاذ سے ایک فوج کے کثیر حصے کو روسی محاذ پر طلب کر لیا۔ یہ کمک میدانِ جنگ میں کافی دیر سے پہنچی۔ جس کے باعث ہر دو محاذ اپنی مضبوطی اور اثر کھو بیٹھے۔

جنرل کونریڈ کی دوسری بڑی جنگی غلطی یہ تھی کہ وہ روسی حملے کی توقع ریبلن۔ خولم کے علاقوں سے کر رہا تھا وہاں اُس نے اپنی دو (2) افواج صف آرا کر دیں۔ جبکہ بقیہ ایک آرمی جنوب میں لیمبرگ سے آگے سرحدی علاقوں میں دفاعی پوزیشن میں صف آرا کی۔ دوسری طرف جنرل نیکولائی ایوانو بھی اصل صورتِ حال سمجھنے سے قاصر رہا اور دشمن کا حملہ لیمبرگ سے توقع رکھتے ہوئے اِسی علاقے سے دشمن پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔

دونوں افواج کے معلومات کے ذرائع انتہائی کمزور تھے۔ 23 اگست کو روس کی چوتھی آرمی آسٹریا۔ ہنگری کی پہلی آرمی سے غیر متوقع طور پر ٹکرا گئی اور جنگ شروع ہو گئی۔ جنرل کونریڈ کی پہلی آرمی نے روسی افواج کو کامیابی سے پیچھے دھکیل دیا۔ 25 اگست کو جنرل کونریڈ نے قبل از وقت اپنی افواج کو زیموسک اور کومارو و پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ اِس مقصد کے لیے لیمبرگ کے محاذ سے اسے اپنی افواج کو مارو و کے محاذ پر طلب کرنا پڑیں۔ یکم ستمبر تک جاری کو مارو و کی لڑائی میں آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کو معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

26 اگست سے روسی افواج نے لیمبرگ پر بھرپور حملے شروع کردیے تھے۔ گنیلا لیپا (موجودہ گنیلا یالیپا) کی لڑائی میں پسپائی کے بعد جنرل کونریڈ نے ہڑبڑاہٹ میں میدان چھوڑ کر فوجوں کی مجموعی پسپائی کا حکم دیا۔ حالانکہ اُس وقت آسٹریائی افواج دشمن کے پہلو پر حملہ کر کے اس کی صفوں میں شگاف ڈالتے ہوئے بہت بڑی کامیابی حاصل کر سکتی تھیں۔ 8 ستمبر تک پہلی آرمی کراسنک تک پیچھے ہٹ چکی تھی۔ جبکہ دوسری، تیسری اور چوتھی افواج لیمبرگ کے محاذ پر اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھیں۔

لیکن پہلی آرمی اور دیگر افواج کے درمیانی بہت بڑے فاصلے سے روس کی پانچویں آرمی پیش قدمی کرتے ہوئے راوا رسکا کی لڑائی کے بعد اپنے قدم جما چکی تھی۔ اور 26 ستمبر تک آسٹریا۔ہنگری کی افواج 100 میل تک پسپا ہو چکی تھیں جبکہ 350000 فوجی مارے جا چکے تھے۔

(نقشہ گلیشیا کی لڑائیاں؛ کومارو کی لڑائی، کیراسنک اور گنیلا لیپا کی لڑائیاں)

جنرل ایوانوو کی گلیشیا میں شاندار کامیابی کے بعد روسی افواج کے لیے گلیشیا سے ملحقہ

جرمنی کے علاقے سیلیسیا میں داخلے کے راستے صاف ہو چکے تھے۔ اس وقت تک جرمن حکام مغربی محاذ پر مارن کی پہلی لڑائی میں شکست کھانے کے بعد افواج کی مشرقی محاذ پر منتقلی کے قابل نہیں رہے تھے۔ تاہم جنرل ہینڈن برگ کو آسٹریائی حلیفوں کی مدد کے لیے فوج روانہ کرنے کے سختی سے احکام مل چکے تھے۔ 28 ستمبر کو کمک کے لیے نئی نویں آرمی تشکیل دی گئی۔

روسی افواج کے کریکو پر حملے کے خدشے کے پیشِ نظر فوری جارحانہ اقدامات کیے جانے ضروری تھے۔ اس مقصد کے لیے جنرل ہینڈن برگ نے روسی حملے کو روکنے کے لیے وارسا پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 9 اکتوبر کو نویں آرمی دریائے وسٹولا پر پہنچ گئی۔ جہاں جنرل نیکولائی آیوونوو کے وائرلیس پیغام کی بابت معلومات ملنے پر روسی افواج کے جرمن افواج پر بائیں پہلو سے حملے کی مکمل تصویر حاصل ہو گئی۔ تاہم جرمن نویں آرمی نے اپنی وارسا کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

(نقشہ جرمن نویں آرمی پولینڈ میں)

نصف اکتوبر تک جرمن نویں آرمی وارسا سے صرف 12 کلو میٹر کے فاصلے پر پہنچ گئی۔ تاہم وارسا کے دروازوں پر مضبوط روسی افواج، آسٹریا۔ ہنگری کی کمزوری اور جرمن افواج کے مغربی محاذ پر حوصلہ شکن حالات نے یکم نومبر 1914ء کو وارسا کے حملے سے دستبردار ہو کر اپنی 28 ستمبر والی پوزیشن پر واپس آنے پر مجبور کر دیا۔

اسی اثناء میں فرانس نے روس سے وارسا اور پوزن کی طرف سے جرمنی پر حملہ کرنے کی استدعا کی تاکہ جرمنی کی مغربی محاذ میں مصروف قوت میں کمی واقع ہو۔ کیونکہ وارسا کی معدنیات اور صنعتی ترقی کا حامل علاقہ جرمنی کے لیے انتہائی اہم تھا۔ جنرل ہینڈن برگ نے نویں آرمی کو بروقت متحرک کرتے ہوئے پوزن۔ تھورن کے علاقے نہ صف آرا کر دیا۔ اب وہ روسی حملے سے پیشتر روسی افواج پر حملہ کر کے روس کے منصوبے کو ناکام کرنا چاہتا تھا۔

11 نومبر کو جرمن افواج جنرل آگسٹ میکنسنز کی قیادت میں لوڈز پر شمال کی جانب سے حملہ آور ہوئیں۔ چار (4) دنوں میں جرمن فوج 50 میل آگے بڑھ گئی۔ 14 نومبر تک روسی افواج سلیسیا پر حملہ نہ کر سکی تھیں۔ جبکہ 16 نومبر کو انہیں معلوم ہوا کہ اُن کی دوسری آرمی لوڈز کے مقام پر جرمن افواج کے نرغے میں آچکی ہے۔ اب روسی افواج کو بجائے حملہ کرنے کے اپنی افواج کو دشمن کے نرغے سے زندہ واپس نکالنے کی فکر لاحق ہوئی۔ بالآخر جنرل ایوونو بڑی مشکل اور تردد سے اپنی نرغے میں پھنسی افواج کو نکال سکا۔ تاہم بھاری جانی و مالی نقصان اور لوڈز شہر گنوانے کے بعد روسی افواج نے سلیسیا پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بلقان کے محاذ

شہزادے آرک ڈیوک فرینز فرڈینینڈ اور اُس کی اہلیہ کے قتل کے بعد آسٹریا۔ ہنگری اور سربیا کے تضادات کو جنگ کا بہانہ مل گیا۔ آسٹریا۔ ہنگری نے 1914ء میں سربیا پر تین بڑے حملے کیے جو سربیا کی افواج نے بہادری سے ناکام بنا دیے۔

جنگ کی ابتدا میں بلغاریہ غیر جانب دار تھا۔ تاہم اس نے 14 اکتوبر 1914ء کو جنگ میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ اِس سے قبل آسٹریا۔ ہنگری کے لیے سربیا پر حملے کے لیے صرف شمالی اور مغربی سرحدی علاقے ہی تھے۔ جہاں تین وسیع و عریض دریا، دریائے ڈینوب، ساوا اور

ڈرینا بہتے تھے۔ اِن دریاؤں کے اُس پار پہاڑوں کا ایک بڑا سلسلہ تھا جو حملہ کرنے والی افواج کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ بنتا تھا۔

سربیا کے جنرل سٹاف جنرل ریڈومیر پوٹنک نے دفاعی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور دریاؤں کو اپنے اولین محاذ بناتے ہوئے اصل قوت والجیوو کے مشرق میں مجتمع کی۔ اِس کی فوج عددی، تکنیکی اور جدید اسلحہ کے لحاظ سے کمزور، جنگِ بلقان اول و دوم کی تھکی ہاری لیکن اکثریت انفرادی طور پر سخت اور ثابت قدم تھی۔

12 اگست کو 19 ڈویژنز پر مشتمل آسٹریا۔ ہنگری کی تین افواج نے سربیا پر حملے کا آغاز کیا۔ دوسری آرمی شمال سے جبکہ پانچویں اور چھٹی آرمی مغرب سے حملہ آور ہوئیں۔ ان کے مقابلے میں جنرل پوٹنک کے پاس صرف 12.5 ڈویژنز پر مشتمل تین افواج تھیں۔ آسٹریا۔ ہنگری کی دوسری آرمی کے ایک کور نے 15 اگست تک سیبک پر قبضہ کرلیا۔ جبکہ پانچویں آرمی نے سربیائی افواج کو دریائے جاڈر تک پیچھے دھکیل دیا۔

لیکن اگلے ہی دن جنرل پوٹنک نے شدید جوابی حملہ کر کے آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کو واپس سرحد کے پار دھکیل دیا۔ جس سے آسٹریا۔ ہنگری کو اپنی شکست کے آثار نظر آنے لگے۔ جنرل آسکر وان پوٹیورک اپنی افواج کی قیادت اور ان کو مربوط رکھنے میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ وہ اپنے 19 ڈویژنوں میں سے صرف 8 ڈویژن میدان میں لاسکا تھا۔ مزید یہ کہ آسٹریا۔ ہنگری کے منصوبہ سازوں کے اندازے کے برعکس سربیا مضبوط اور روسی افواج تیز واقع ہوئی تھیں۔ روسی تیز رفتاری کے باعث ابتدائی طور پر نصف اور بعد ازاں پوری دوسری آرمی سربیائی محاذ سے روسی محاذ پر منتقل کر دی گئی۔

8 ستمبر کو جنرل پوٹیورک نے ایک اور حملہ ترتیب دیا جس میں اُس کی افواج ڈرینا اور ساوا سے سربیا میں داخل ہوگئیں۔ ابتدائی طور پر جنرل پوٹیورک کو کامیابی حاصل ہوئی مگر 16 ستمبر کو سربیا کی جانب سے بھرپور جوابی حملے میں آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کو فوری طور پر اپنی سرحدوں میں واپس آنا پڑا۔ تاہم سربیا کی افواج ازخود وال جیوو کے بلند میدانوں تک پیچھے ہٹ گئیں۔ اور نئی دفاعی لائن ترتیب دے کر از سرِ نو صف آرا ہوگئیں۔
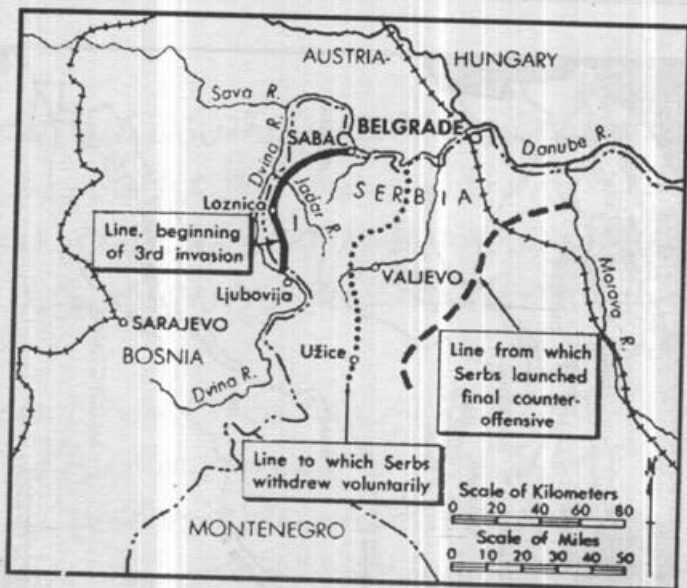
(نقشہ آسٹریا کی سربیا پر جارحیت)

5 نومبر کو جنرل پوٹیورک نے تیسری بار سربیا پر حملہ کیا اِس بار اسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ 15 نومبر تک وال جیوو پر جنرل پوٹیورک کا قبضہ ہو چکا تھا۔ 29 نومبر تک بلغراد پر آسٹریا۔ ہنگری کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ اور سربیا کی افواج وال جیوو کے مشرق میں 20 میل پیچھے تک دھکیل دی گئیں۔ تاہم اسی دوران پہلے بادشاہ پیٹر اوّل کی اپیل پر جس میں موصوف خود رائفل اور بارود کا بیگ اٹھائے وطنِ عزیز کی حفاظت کے لیے کمر بستہ ہونے کی درخواست کر رہا تھا، سربیا کی افواج نے ایک زوردار جوابی حملہ کر کے 3 دسمبر سے 9 دسمبر تک آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ 15 دسمبر تک آسٹریائی افواج اپنی سرحد تک پسپا ہو گئیں۔ لڑائیوں کا یہ سلسلہ انتہائی خونریز اور شدید تھا۔ سربیا کے 67 سالہ جنرل پیوٹنک نے میدانِ کارزار کی بجائے نقشوں اور خاکوں کی مدد سے تمام محاذوں پر صف آرائی اور حملوں کی منصوبہ بندی کی تھی۔

روسی افواج کے گلیشیا پر قبضے کے باعث وقتی طور پر آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا پر حملوں کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ تاہم سربیا سے پسپائی کے دوران ٹائفس کا متعدی مرض آسٹریا۔ ہنگری کی افواج سے سربیا کی افواج کو لاحق ہو گیا۔ 15 اپریل 1915ء تک 70,000 فوجی اور کئی سربیائی باشندے اِس مرض سے ہلاک ہو گئے۔

(نقشہ ترکی 1914ء میں)
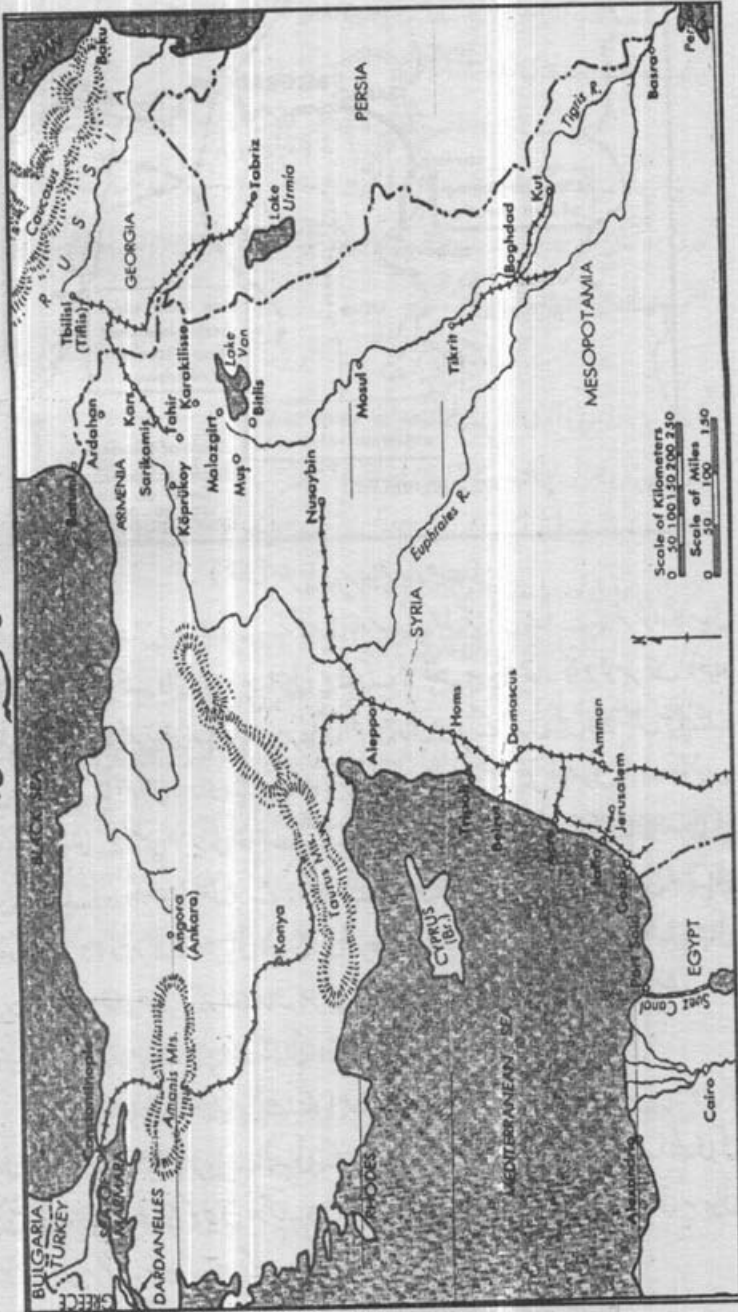
ترکی کے محاذ

2 اگست کے خفیہ معاہدے کے تحت ترکی، مرکزی قوتوں کی مدد کے لیے جنگ میں شریک ہونے کے لیے تیار تھا۔ ترکی کی جانب سے جنگِ عظیم اوّل میں شرکت کی وجہ برطانیہ کا خطیر رقم کے عوض بحری جہازوں کی بعد از تیاری عدم فراہمی بنا۔ اِس کمزور لمحے سے جرمنی نے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دو بحری جہازوں کی مدد دے کر ترکی کو جنگ میں مرکزی قوتوں کی حمایت میں لڑنے کے لیے آمادہ کر لیا۔

کاکیشیا کے محاذ پر ترکی کی افواج جنرل حسن عزت کی کمانڈ میں روسی افواج سے برسرِ پیکار ہوئیں۔ ترکی کا وزیرِ جنگ انور پاشا جنگی منصوبے بناتا تھا جبکہ ان منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے ہوئے جنرل حسن عزت کو اِن کی غلطیوں کو دور کرنا تھا۔ انور پاشا کے کاکیشیا کے محاذ پر جنگ کے منصوبے کے مطابق روسی افواج کو پہلے پیش قدمی کرنے کا موقعہ دیتے ہوئے ترکی کے علاقے میں آگے بڑھنے دینا تھا۔ اور فوراً بعد میں پلٹ کر جوابی حملہ کرنا اور اِس دوران ایک اور فوج کی مدد سے روسی فوج کا رابطہ اس کے بیس کیمپ سے منقطع کر کے مکمل طور پر اسے تباہ و برباد کر دینے کا تھا۔

ایسا منصوبہ گرمیوں کے موسم کے لیے تو مناسب تھا۔ تاہم سردیوں میں جب درجہ حرارت 20- درجے فارن ہائٹ تک گر جائے اور شدید برفانی طوفان راستہ روک لیں تو اِس صورت میں اِس منصوبے کے ناقابلِ عمل ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔

ترکی حکام 150000 فوجی میدانِ جنگ میں لا سکتے تھے۔ دوسری طرف روسی افواج کی تعداد 100000 تھی۔ جنرل حسن عزت صرف 95000 فوجی ہی میدانِ جنگ میں لا سکا۔ دونوں اطراف سے سخت ترین موت کی ہولی کھیلی گئی۔ زخمیوں کی حالت قابلِ رحم تھی اور علاج معالجہ کی مناسب اور بروقت سہولیات کی کمی کے باعث شرح اموات بڑھ رہی تھی۔

دورانِ جنگ دشوار گزار راستے، برفباری اور طوفانِ بادو باراں کے باعث ترک افواج کا ایک ڈویژن جو 8000 فوجیوں پر مشتمل تھا چار (4) دنوں میں پہاڑی علاقوں میں پیش قدمی کے دوران صرف 4000 فوجی ہی بچ سکے۔ جنرل حسن عزت کے 25000 جوان صرف صف

آرائی کے مرحلے میں ہی ہلاک ہو چکے تھے۔

29 دسمبر 1914ء کو روسی افواج کو فتح حاصل ہوئی۔ جنرل حسن عزت کی 95000 آرمی 15 جنوری 1915ء صرف 18000 رہ گئی۔ اِس جنگ میں ترکی کی افواج کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔

دوسری جانب میسوپوٹامیا میں برطانوی دخل اندازی اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ برطانیہ کے انڈین آفیسر نے اینگلو۔ پرشین آئل کمپنی کے تحفظ کے لیے برطانوی حکومت سے مدد کی درخواست کی جس پر ایک بریگیڈ فوج روانہ کی گئی۔ اِس فوج کے بحرین پہنچنے پر 23 اکتوبر کو برطانوی حکومت نے اسے بصرہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔

22 نومبر کو برطانیہ بصرہ شہر پر قابض ہو گیا اور اِس علاقے کی سب سے سخت اور مشکل لڑائی میں 489 ہندوستانی اور برطانوی افواج کی ہلاکت کے بعد بصرہ شہر ترکی سے چھین لیا گیا۔ یہاں سے برطانیہ پورے عرب ممالک کو اپنی مٹھی میں رکھتے ہوئے ترکی کے داخلی معاملات میں مداخلت اور اندرونی شورشوں کو ہوا دیتا رہا۔

بحری محاذ

جنگِ عظیم اوّل کی بڑی وجہ بحری برتری کی دوڑ تھی۔ برطانیہ جو ایک مدت سے بحری برتری کا حامل تھا اپنے قریب ہی بحری لحاظ سے مضبوط ہوتے ہوئے ملک جرمنی کو انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اِس طرح اسے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے بحری راستوں سے ہونے والی آمدن اور بحری جہازوں کے وسیع جال کے چھن جانے کا خطرہ تھا۔ جو لازمی طور پر پوری دنیا پر چھائی برطانوی بالادستی ختم کر دیتا۔ اِس طرح یہ جنگ ایک لحاظ سے بحری برتری کی جنگ بھی تھی۔

جنگِ عظیم اوّل کے آغاز سے ہی بحری لڑائیوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ سب سے پہلی بحری لڑائی واضح طور پر جرمن فتح تھی جو بحیرہ روم میں ہوئی۔ اِس لڑائی میں جرمن جنگی کروزر "گوئی بن" اور ہلکے کروزر "بریسلو" کے بحیرہ روم سے قسطنطنیہ تک بحفاظت پہنچانا تھا۔ کیونکہ برطانوی بحریہ نے جرمن بحریہ کی مکمل طور پر ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ دوسرے یہ کہ یہی وہ دو (2) بحری جہاز تھے

جس کی وجہ سے ترکی میدانِ جنگ میں مرکزی قوتوں کے حق میں اترا۔

ہولی گولینڈ کی لڑائی

28 اگست 1914ء کو برطانیہ کے ایڈمرل ڈیوڈ بیٹی نے جرمن بحریہ کو ایک بڑی سمندری لڑائی میں کھینچنے کے لیے ایک حملے کا منصوبہ بنایا۔ جس کے مطابق 5 جنگی کروزرز کو 25 ڈیسٹرائرز کے ساتھ جرمنی کی بندگاہ ہولی گولینڈ پر حملہ کر کے فوراً ہی واپس بھاگ آنا تھا۔ اِس لڑائی میں جرمنی کے تین (3) کروزرز تباہ ہوئے جبکہ برطانیہ کے کروزر ''اریتھوسا'' کو بہت زیادہ نقصان ہوا تاہم یہ واپس آنے میں کامیاب رہا۔ اِس طرح ''مارو۔اور۔بھاگ جاؤ'' کی طرز پر حملوں کا آغاز ہوا جو پوری جنگِ عظیم میں جاری رہا۔
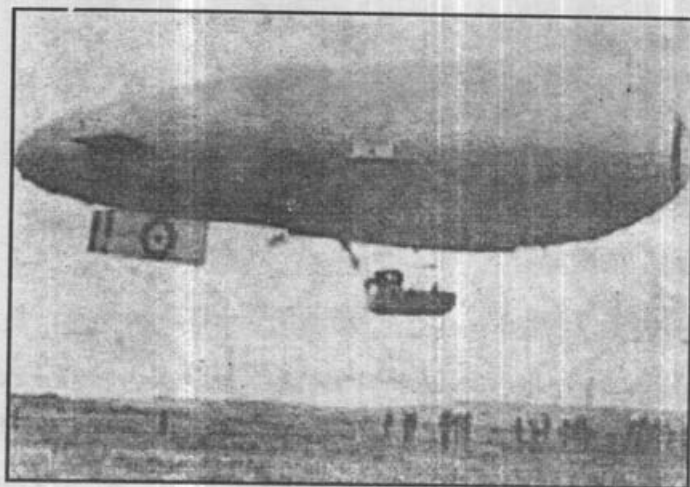
(برطانوی سمندری سکاؤٹ ایس ایس زیڈ 16)

22 ستمبر کو جرمن بحریہ نے جوابی حملہ کیا۔ اِس حملے میں برطانیہ کے تین (3) کروزرز غرق کر دیے۔ اِس حملے سے دونوں بحری طاقتوں کو اپنی اپنی بندرگاہوں پر بمبار توپیں نصب کرنے اور بحری بیڑے کو ساحل سے دور رکھنے کا سبق دیا۔

2 نومبر کو شمالی علاقے کو جنگ کا علاقہ قرار دے دیا گیا۔ اور تجارتی جہازوں کے لیے نئے اور مختلف راستے مختص کر دیے گئے۔ جرمنی کے مختلف جنگی بحری جہاز جو نوآبادیات پر لنگر انداز

تھے، جنگ کے آغاز پر برطانوی جہازوں کی تباہی کا باعث بنتے رہے۔ ''ایمڈن'' جو بحیرہ ہند کی نگرانی پر مامور تھا 15 برطانوی جہازوں کو غرق کر گیا۔ ''لارل سروہی'' ویسٹ انڈیز کے ساحل پر 17 جہازوں کو غرق کرنے کے بعد از خود اندرونی دھماکے سے پھٹ گیا۔

یکم نومبر کو جرمنی کے مشرقِ بعید کے بیڑے نے برطانیہ کے ایک چھوٹے بحری بیڑے پر حملہ کر کے اس کے دو (2) جنگی کروزر غرق کر دیے جبکہ بقیہ بیڑہ بھاگ نکلا۔ جرمن بحری کوڈز ایک مدت سے تبدیل نہیں کیے گئے تھے۔ جو برطانیہ نے آسانی سے ترجمہ کر لیے اور ہر طرح کی پیغام رسانی اور کمانڈ وغیرہ سے بروقت مطلع ہو جانے کی وجہ سے بعد میں جرمن بحریہ کی کارروائیاں اس قدر کارگر ثابت نہ ہو سکیں۔

دیگر اہم محاذ

اتحادی اور مرکزی ممالک کی سرحدوں اور سمندروں میں جنگ کے علاوہ جنگ میں شریک ممالک کے زیرِ تسلط نو آبادیات پر بھی چھینا جھپٹی کی سی کیفیت کا آغاز جنگ کے آغاز سے ہی ہو چکا تھا۔ اِن نو آبادیات پر تسلط قائم رکھنے سے ہی عالمی قیادت کا فیصلہ اور براعظم یورپ کی جنگ کے بڑھ کر پوری دنیا میں پھیل جانے کا انحصار تھا۔ اتحادی ممالک ہر محاذ پر نئی ابھرنے والی قوت کو کچل دینا چاہتے تھے۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی اور ہر محاذ پر مرکزی ممالک کو شکست دینے کے لیے بھرپور حملے کیے۔ اِن کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:۔

نو آبادیاتی محاذ

براعظم افریقہ میں جنگ کی صورتِ حال مختلف تھی۔ وہاں ذرائع نقل و حمل کی کمی، دلدلی علاقوں، جنگلوں، اور دشوار گزار پتھریلے راستوں کے باعث کارروائیوں کا سلسلہ دریاؤں تک محدود تھا جہاں دریاؤں کی مدد سے کشتیوں کے ذریعے نقل و حمل کرنا آسان تھا۔ جرمن نو آبادیات جنگِ عظیم اوّل کے آغاز تک کافی وسیع ہو چکی تھیں۔
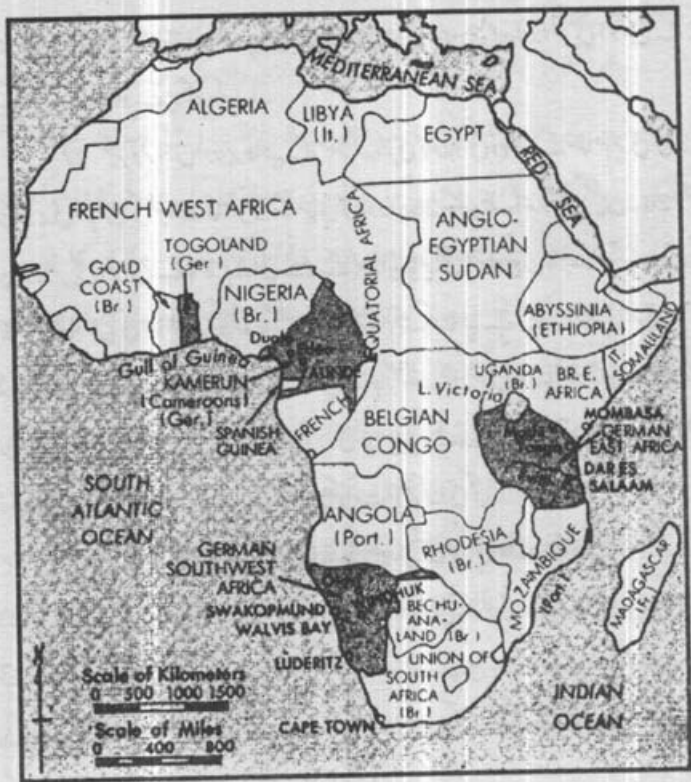
(نقشہ جرمن افریقی نوآبادیات)

ٹوگولینڈ (موجودہ گانا اور جمہوریہ ٹوگو میں منقسم علاقہ) میں جرمنی نے ایک مضبوط وائر لیس سسٹم نصب کر رکھا تھا۔ اور افریقہ کی دیگر نوآبادیات سے برلن کی جملہ رسل و ترسیل اسی مقام سے ہوتی تھی۔

7 اگست 1914ء کو ٹوگولینڈ پر برطانیہ نے مغرب اور فرانس نے مشرق سے حملہ کر دیا۔ 200 جرمن اور تقریباً 1000 افریقی فوجیوں پر مشتمل چھوٹے سے گروہ نے تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیے اور 26 اگست کو اتحادی افواج نے وائر لیس سٹیشن تباہ کر کے اپنی انتظامیہ قائم کر دی۔

کیمرون پر 20 اگست کو فرانس اور بیلجیم کی افواج جبکہ 27 اگست کو برطانوی افواج حملہ

آور ہوئیں۔ اِن افواج ابتدائی طور پر کسی قدر کامیابی ہوئی لیکن جرمن اور افریقی افواج کے جوابی حملے نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

27 ستمبر کو فرانس اور برطانیہ کے مشترکہ بحری کارروائی دوالا کے مقام پر لی گئی۔ بحری افواج کو بری افواج کی نسبت خاطر خواہ کامیابی ملی اور وہ 35 میل تک اندر گھس گئیں۔ 26 اکتوبر کو جرمن اور افریقی افواج کے ناکام جوابی حملے کے بعد ایڈیا پر بھی اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب یاؤنڈ اُن کا مرکز تھا جس کی حفاظت وہ جنگِ عظیم کے اختتام تک کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف اتحادی ہاؤنڈ پر فوری طور پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جابجا مختلف شورشوں اور ہاؤنڈ میں موجود دشمن کی افواج کی بھرپور مزاحمت کے باعث وہ فروری 1916ء تک کیمرون پر قبضہ نہ کر سکے۔ نصف فروری 1916ء کو فرانس اور برطانیہ کی مشترکہ حکومت قائم کر دی گئی۔

جرمن جنوب مغربی افریقہ جسے ابتدائی طور پر کسی یورپی ملک نے اپنے زیرِ کنٹرول رکھنا پسند نہ کیا۔ 1878ء میں برطانیہ نے اِس کی ایک بندرگاہ پر اپنی کالونی قائم کی تاہم 1884ء میں یہ علاقہ جرمنی کے قبضے میں آ گیا۔ بعد ازاں اِس علاقے سے ہیرے اور دیگر معدنیات دریافت ہونے پر یہ علاقہ فوری طور پر ترقی کر گیا۔ ریل روڈز اور دیگر ذرائع نقل و حمل قائم کیے گئے اور ونڈوک میں ایک مضبوط وائرلیس اسٹیشن قائم کیا گیا۔

جرمن جنوب مغربی افریقہ پر حملہ کرنے کے لیے ساؤتھ افریقہ کی ذمہ داری لگائی گئی۔ ابتدائی طور پر اِس حملے کا مقصد جرمن بحریہ کے زمینی ریڈاروں کی فراہمی کو معطل کرنا تھا۔ تاہم ساؤتھ افریقہ کے دو اعلیٰ آفیسران کے ایک دوسرے سے تناؤ کے باعث لیفٹیننٹ کرنل میرٹز نے جرمنی کے ساتھ مل کر ساؤتھ افریقہ سے بغاوت کر دی۔ 1915ء جنوری تک فوجی قلت کے باعث اِس علاقے پر حملے نہ کیے گئے۔ بعد ازاں حملوں کا آغاز ہوا۔

علاقائی قبائل جرمن افواج کے ناروا سلوک کے باعث اُن سے بدظن ہو چکے تھے۔ حملہ آوروں نے اِن حالات کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے جرمن فوج کو دھکیلنا شروع کر دیا۔ یکم جولائی 1915ء کو اوٹاوی کے مقام پر جرمن فوج نے اپنا آخری مورچہ بنایا۔ اور ایک بھرپور جنگ کے بعد 3500 جرمن فوجیوں نے 9 جولائی 1915ء کو ہتھیار ڈال دیے اور علاقہ جنوبی افریقہ کے

کنٹرول میں دے دیا گیا۔

جرمن مشرقی افریقہ نسبتاً زیادہ آبادی اور دولت والا ملک تھا۔ اِس پر حملے کے لیے برطانوی حکومت کے پاس فوج نہ تھی لہٰذا ہندوستان سے فوج طلب کی گئی۔ اور 8 اگست کو دارالسلام کی بندرگاہ اور وائرلیس اسٹیشن تباہ کردیا گیا۔ اِس کے بعد باہمی جنگ وجدل کا بازار گرم ہوگیا۔ جرمن افواج بھرپور مزاحمت کرتی رہیں۔ اور برطانوی افواج کو قدم جمانے کا موقع نہ ملا۔

1915ء کے اختتام تک جرمن افواج نے جارح برطانوی افواج کو نہ صرف ملک سے نکال باہر کیا بلکہ برطانوی مشرقی افریقہ کی پٹی پر بھی قبضہ کرلیا۔ دوسری طرف جولائی 1915ء کے اختتام پر جرمن جنوب مغربی افریقہ کی فتح کے بعد برطانوی افواج یہاں منتقل کردی گئیں۔ جنرل لاٹو کی قیادت میں جرمن افواج 9 مارچ 1916ء تک یوگانڈا ریلوے بیس پر قابض رہیں۔

بعد ازاں برطانوی افواج کی زیادتی اور ہندوستان سے تازہ دم افواج کی کمک کے باعث جنرل لاٹو نے گوریلا جنگ کا آغاز کردیا۔ اور برطانوی 300000 فوج کو اگلے دو (2) سال تک صرف 1300 افراد کے ساتھ مصروف اور تنگ رکھا۔ اِس جنگ میں برطانیہ کے 350 ملین پاؤنڈ صرف ہوئے اور تقریباً 700000 افراد مارے گئے۔ 25 نومبر 1918ء کو جنرل لاٹو نے ہتھیار ڈال دیے۔

کائیو چو چین کے صوبے شانٹونگ کا جزیرہ تھا جو جرمنی نے اپنے بحری مقاصد کے لیے نوآبادیات بنا رکھا تھا۔ 15 اگست کو جاپان نے ایک الٹی میٹم کے ذریعے اس جزیرے کو چھوڑنے بصورتِ دیگر جنگ کے لیے تیار ہونے کی دھمکی دی۔ 23 اگست کو جاپان نے جرمنی سے اعلانِ جنگ کردیا۔

2 ستمبر کو جاپانی افواج لنگ کو کے مقام پر اتریں 18 ستمبر کو مزید افواج مدد کے لیے اتریں۔ پانچ دِن بعد برطانوی افواج بھی کارروائی میں شریک ہوگئیں۔ اور ایک خونریز لڑائی کا آغاز ہوا۔ جرمنوں کے پاس افرادی قوت کی قلت تھی۔ اِس لیے سخت ترین لڑائی کے بعد 7 نومبر کو ہتھیار ڈالتے ہوئے جزیرہ جاپانی اور برطانوی افواج کے حوالے کردیا۔

مجموعی صورتِ حال

شہزادہ آرک ڈیوک فرینز فرڈیننڈ کے قتل کے بعد یورپ کی صورتِ حال انتہائی مخدوش اور غیر یقینی ہو گئی تھی۔ تمام ممالک کسی بھی قسم کی مخدوش حالت زار کی توقع کر رہے تھے۔ آسٹریا۔ہنگری کے حکام سربیا کو اُس کے کیے کی سزا بہر حالت دینا چاہتے تھے۔ مگر اِس طرح اُنہیں سربیا کی پشت پناہی پر روسی حملے کا خطرہ تھا۔ جس سے وہ تنہا عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ اِس مسئلے کے حل کے لیے وہ جرمنی کی طرف سے حوصلہ افزائی اور یقینی مدد کے طلب گار تھے۔

جرمنی روس کے ساتھ مڈھ بھیڑ ہونے کی صورت میں فرانس کی مداخلت اور اُس کی مدد میں برطانیہ کی جنگ میں شرکت کی توقع رکھتا تھا۔ اِس لیے یورپ کی بڑی قوت ہونے کے احساس کو زندہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ عدمِ جنگ کی خواہش بھی رکھتا تھا۔ قبل ازیں آٹو وان بسمارک کی اعلیٰ سفارت کارانہ صلاحیتیں ایسی مشکل صورتِ حال سے بخوبی عہدہ برآ ہوتی رہی تھیں۔ مگر اب جرمن حکام میں وہ دانشمندی، معاملہ فہمی اور سفارتکارانہ صلاحیتیں موجود نہیں تھیں۔ لہٰذا جنگ سے گریز کی خواہش کے باوجود قیصر ولیم دوم خارجہ امور پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکا۔

آسٹریا۔ہنگری کے سربیا کو دیے گئے الٹی میٹم کی مدت بلا کسی مثبت پیش رفت ختم ہونے پر 28 جولائی 1914ء کو اوّل الذکر نے آخر الذکر سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ جس پر حسب توقع اور طے شدہ خفیہ معاہدہ روسی افواج نے آسٹریا۔ہنگری کی سرحد کی طرف حرکت شروع کر دی۔ ایک طے شدہ طریقہ کار کے مطابق جرمنی اپنے حلیف آسٹریا۔ہنگری کے خلاف روسی عزائم پر میدانِ عمل میں کود گیا اور روس کو افواج کی حرکات بند کرنے کی ہدایت کی جو روس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے فوجی کارروائی کے لیے پیش قدمی جاری رکھی۔

یکم اگست 1914ء کو جرمنی نے روس سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ اِس اعلانِ جنگ پر فرانس نے اپنے حلیف روس کی مدد کے لیے افواج کو متحرک کیا۔ فرانس کے متوقع حملے کے پیشِ نظر جرمنی نے بیلجیم کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فرانس کی افواج کے حملے سے بچاؤ کے لیے بیلجیم کے راستے

اپنی افواج کو فرانس میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اُس کی افواج کو راستہ دیا جائے۔ بیلجیم نے اِس الٹی میٹم کو مسترد کر دیا اور جرمن افواج فرانس پر حملے کے لیے بیلجیم میں داخل ہو گئیں۔ اگلے دس (10) روز تک جرمن افواج بیلجیم میں مصروف رہیں۔

جرمنی کا بیلجیم کے ذریعے فرانس پر حملہ شیلفن پلان کے مطابق تھا جو 1905ء میں چیف آف سٹاف جنرل ایلفرڈ وان شیلفن نے ترتیب دیا تھا۔ اِس منصوبے کے مطابق جرمنی لورین اور الساس کے علاقوں پر فرانس کی افواج سے دفاعی جنگ لڑے گا جبکہ شدید جارحانہ حملہ بیلجیم کی جانب سے کیے جانے کا پروگرام تھا۔

دوسری طرف فرانس 1871ء کی شکست کے بعد سے اپنے مقبوضہ علاقے جرمنی سے واپس حاصل کرنے کے لیے منصوبے بنا رہا تھا۔ سب سے مشہور اور اہم منصوبہ، منصوبہ نمبر 17 کے نام سے موسوم ہے جس کے مطابق فرانس اپنے مقبوضہ علاقے الساس اور لورین کے راستے جرمنی پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

مغربی محاذ (فرانس سے لڑائی) کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ شمالی (دائیں بازو) اور جنوبی (بائیں بازو) محاذ۔ شمالی محاذ (دائیں بازو کا محاذ) بیلجیم کے راستے فرانس پر شدید حملے کرنے اور جنوبی (دائیں بازو کا محاذ) الساس اور لورین کے راستے فرانس کے حملوں کا کامیابی سے دفاع کرنے پر مشتمل تھا۔ دونوں محاذوں پر شدید لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اِن لڑائیوں کو سرحدی لڑائیوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ لڑائیاں 24 اگست تک جاری رہیں۔

لورین کے محاذ سے شروع ہو کر آرڈنیس، سیمبر اور مانز کے علاقوں میں لڑی گئی اِن لڑائیوں میں مجموعی طور پر جرمن افواج اپنی فتح کے پھریرے لہراتی ہوئی پیرس کی طرف پیش قدمی کرتی رہیں۔

لاکیٹاؤ اور گوئز کی لڑائیاں برطانوی مہماتی افواج سے لڑی گئیں اِن لڑائیوں میں جرمن افواج نے برطانوی افواج کو بری طرح گھائل کر کے رکھ دیا اور برطانوی افواج جرمن سیلاب کے آگے سیلِ رواں کی طرح بہتی گئیں۔ اِس دوران جرمن افواج مارن کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ 24 اگست سے 5 ستمبر تک مارن کی جانب اِس پیش قدمی میں جرمن فوج کو فرانس اور برطانیہ کی متحدہ

افواج کا متعدد بار سامنا کرنا پڑا۔

جنرل مولٹک کی جانب سے غیر مکمل معلومات، دشمن کی صحیح صورتِ حال سے عدم واقفیت اور غلط فہمیوں کے باعث جرمن افواج اپنی گزشتہ فتوحات کا سلسلہ برقرار نہ رکھ سکیں۔ مارن کے مقام پر لڑائی کے دوران فرانس کی افواج کے تعاقب میں جرمنی کی پہلی آرمی اور دوسری آرمی کے درمیان کافی فاصلہ پیدا ہو گیا جس کے باعث فرانس اور برطانوی افواج کو دوسری آرمی پر دو طرف سے حملے کرنے کا موقع مل گیا۔ یہی وہ فیصلہ کن لمحہ تھا جب فرانس اور برطانوی افواج کے درمیان پیدا شدہ فاصلہ کم ہو گیا اور فرانس کی بکھری ہوئی، تھکی ہاری فوج میں ایک نئی لہر دوڑ گئی اور وہ جنرل جوفر اور فوش کی قیادت میں از سرِ نو منظم ہو گئے۔

جرمن ہیڈ کوارٹر سے منصوبہ جنگ میں تبدیلی کی گئی کیونکہ فرانس کی جانب سے بھی تبدیلی کے بعد دفاعی لڑائی کے بجائے جارحانہ لڑائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ جنگِ مارن کے دوران فرانس نے اپنا دارالحکومت پیرس سے بارڈیوکس کی طرف منتقل کر لیا جبکہ 500000 فرانسیسی پیرس سے ہجرت کر گئے۔

مارن کی لڑائی کے فوراً بعد 6 ستمبر کو جنرل جوفر نے جرمن افواج پر شدید جوابی حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آرک کے کنارے جرمن افواج سے فرانس کی افواج کا سامنا ہونے پر جنگ ایک دِن قبل ہی شروع ہو گئی۔ اسی لڑائی میں ایک موقع پر قریب تھا کہ فرانس کی افواج کو شکست ہو جاتی۔ مگر جنرل گیلینی نے پیرس سے ٹیکسیوں کے ذریعے فوری طور پر کمک کے دستے میدانِ جنگ میں بھیج کر فرانس کو شکست سے بچا لیا۔ تاہم فرانس کی افواج پسپا ہونے لگیں۔

دوسری طرف مورن کی دوسری لڑائی میں جرمن افواج کے درمیان پیدا شدہ فاصلہ بڑھ کر 50 کلومیٹر تک پھیل گیا۔ اِس پر جرمن دوسری آرمی کی پسپائی نے پہلی آرمی کو مکمل طور پر دشمن کے نرغے میں چھوڑ دیا۔ جسے جنرل مولٹک نے مزید آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے دوسری آرمی کی طرف آنے کا حکم دیا۔

جنرل فوش اپنی نئی تشکیل شدہ نویں آرمی کے ساتھ سینٹ گونڈ کے دلدلی علاقوں میں جرمنی کی دوسری اور تیسری آرمی کو روکے ہوئے تھا۔ جنرل فوش نے جرمنی کے شدید حملوں کے

جواب میں پسپائی کی بجائے ڈٹے رہنے اور آخری گولی آخری جوان تک لڑنے مرنے کی وہ مثال قائم کی جس سے فرانس کی شکست خوردہ افواج میں ایک نئی روح بیدار ہوگئی۔ اور شکست کھا کر پسپائی کی عادی فوج نے ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔

جرمنی کی چوتھی اور پانچویں افواج کی کمان شہزادوں کے ہاتھ تھی جو جنگی معاملات میں اِس قدر مہارت نہ رکھتے تھے۔ اُن کے مقابلے پر فرانس کی چوتھی آرمی کے دونوں اطراف بہت سے فاصلے تھے جن کے ذریعے فرانس کی افواج کو گھیرے میں لے کر شکستِ فاش دی جا سکتی تھی۔ مگر ہر دو شہزادے ایک دوسرے کو پہل کرنے کے لیے کہتے رہے اور کاتبِ تقدیر نے یہ سنہری موقع اُن کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ اور دشمن کی کمک آنے پر جرمن افواج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

اب جرمن افواج اتحادی افواج کے تابڑ توڑ جوابی حملوں کے باعث مزید پیش قدمی نہیں کر سکتی تھیں۔ جنرل مولٹک نے جنگ کی بدلی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر پہلے اپنے نمائندے اور بعد میں از خود محاذ کا جائزہ لینے کے بعد افواج کو پسپا ہو کر نویون۔ وارڈن کی پٹی پر نیا محاذ بناتے ہوئے دفاع کرنے کی ہدایت کی۔ اِسی روز جنرل مولٹک کو اُس کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا جس کا باقاعدہ اعلان یکم نومبر کو کیا گیا۔

جرمن افواج کی نئی پوزیشن پر آئزن کی پہلی لڑائی لڑی گئی۔ 12 ستمبر سے 18 ستمبر تک جاری رہنے والی اِس جنگ میں فرانس کی افواج پہلی بار پسپائی اور دفاعی انداز کی بجائے جارحانہ اور سخت جوابی حملے کر رہی تھی۔ اگرچہ اِس لڑائی میں اتحادی افواج کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ مگر یہ لڑائی بہر حال جنگ کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی عکاس تھی۔

دوسری طرف بیلجیم کی 150000 فوج اینٹورپ کی قلعہ بندی میں محصور تھی۔ جو اتحادی افواج کے بار بار نئی فرنٹ لائن پر آنے کی درخواست پر 9 ستمبر کو برطانوی کمک کے دستوں کے ساتھ پیرس کی جانب پسپا ہوگئی اور شہر جرمن افواج کے حوالے کر دیا گیا۔

اب نئے اولین محاذ پر جرمن اور اتحادی افواج ایک دوسرے کے سامنے صف آرا تھیں۔ اسی دوران ہر دو فریقین ایک دوسرے کے شمالی پہلو پر حملہ کرتے ہوئے نرغے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ سلسلہ ماہ ستمبر اور اکتوبر میں جاری رہا۔ اس کوشش کے دوران فرنٹ لائن

شمال کی جانب پھیلتی چلی گئی۔ یپرس کی پہلی لڑائی 12 اکتوبر کو شروع ہوئی اور 11 نومبر تک جاری رہی اِس جنگ کے دوران اتحادی افواج نے جرمن افواج کے شدید حملوں کا کامیابی سے دفاع کیا اور انتہائی شدید حالات میں بھی یپرس کو دشمن کے قبضے میں نہ جانے دیا۔

نئی فرنٹ لائن اگلے چار (4) سال تک قائم رہی اور وہاں متحارب افواج میں آپس میں لڑائیاں اور حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اِس نئی فرنٹ لائن پر خندقوں کی کھدائی کر کے ہر دو فریقین خندقوں کی جنگ میں مشغول ہو گئے۔ جنگِ عظیم اوّل کو خندقوں کی لڑائی کے نام سے اِسی محاذ کی وجہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جرمنی اور روس کی سرحد پر قائم محاذ کو مشرقی محاذ کو نام دیا جاتا ہے۔ یہ محاذ جرمنی کے علاقے مشرقی پروشیا اور سلیسیا جبکہ آسٹریا۔ ہنگری کے علاقے گلیشیا پر روس کے خلاف لڑی جانے والی لڑائیوں پر محیط ہے۔ روس کے شہر وارسا سے روس کی تمام افواج کی قیادت جنرل آئی وان زہیلن سکائی کر رہا تھا۔ جبکہ جرمن آرمی کی کمان جنرل میکس وان پریٹ ویٹز کے ہاتھ تھی۔

ابتدائی طور پر روسی افواج کو کامیابی حاصل ہوئی۔ روس کی پہلی آرمی جنرل رہینن کیمپف کی کمانڈ میں 17 اگست کو مشرقی پروشیا میں داخل ہوئی۔ 23 اگست کو جرمن افواج پسپا ہو رہی تھیں اور روسی افواج مشرقی پروشیا پر قابض ہو گئیں جبکہ جنرل پریٹ وٹز کو پسپا ہونے پر برطرف کرتے ہوئے اُس کی جگہ ریٹائرڈ جنرل پاوّل وان ہنڈن برگ اور جنرل ایرک ایف ڈبلیو لیوڈنڈروف کو صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اِن جرنیلوں نے آتے ہی صورتِ حال کو سنبھال لیا۔

جنرل الیگزینڈر سام سونوو کی قادت میں روسی دوسری آرمی نے بھی سرحد پار کر لی تھی۔ جرمن جرنیلوں نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ پہلی آرمی کو روکنے کے لیے جبکہ بقیہ دو حصے ٹینن برگ میں دوسری آرمی کو اپنے نرغے میں لیتے ہوئے ان کے خون سے ہولی کھیلنے کے لیے۔ روسی دوسری آرمی جرمن نرغے میں آ گئی۔ اور مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ جبکہ جنرل سام سونوو نے اِس صورتِ حال سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔

روسی دوسری آرمی جو 150000 سے زائد فوج پر مشتمل تھی صرف 10000 کے قریب

ہی اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکے۔ اب جرمن افواج جنرل رہینن کیمپف کی پہلی آرمی کو نرغے میں لینے کے لیے جھیل میسورین کی طرف بڑھیں۔ جھیل میسورین کی لڑائی میں روسی پہلی آرمی کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ تاہم وہ دوسری آرمی کی طرح مکمل طور پر تباہ نہ ہو سکی اور جنرل رہینن کیمپف نصف سے زائد فوج کو بچا کر لے گیا۔

دوسری طرف گلیشیا میں آسٹریا۔ ہنگری کے جنرل کونریڈ کی قیادت میں دو (2) افواج روسی جنرل آئی وان نیکولائی کی افواج کے ساتھ برسرِ پیکار تھیں۔ جنرل کونریڈ جنگ کے آغاز سے ہی غلطیاں کرتے جا رہا تھا۔ وہ روسی افواج کا حملہ لُوبلن۔ کوہلم سے متوقع کر رہا تھا۔ اِس لیے اِس کی زیادہ فوج وہاں روسی افواج کے استقبال کے لیے منتظر تھیں۔ جبکہ لیمبرگ کی سرحد پر صرف معمولی نوعیت کی دفاعی فوج رکھی گئی تھی۔

روسی افواج نے لیمبرگ سے حملہ کیا۔ جبکہ روسی کی دفاعی چوتھی آرمی آسٹریا۔ ہنگری کی افواج سے غیر متوقع طور پر کراسنک کے مقام پر ٹکرا گئیں۔ 25 اگست کو روسی افواج کو پسپا کر دیا گیا۔ جنرل کونریڈ نے اپنی فتح سمجھتے ہوئے زیموسک اور کوماروو پر قبل از مناسب وقت حملے کا حکم دیا۔ 26 اگست سے یکم ستمبر تک آسٹریا۔ ہنگری کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ تاہم لیمبرگ کے محاذ پر (جو 26 اگست کو ہی شروع ہوا تھا) گنیلا لیپا کی لڑائی میں روس کے شدید حملوں کے باعث آسٹریائی افواج کو پسپا ہونا پڑا۔

اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر کونریڈ نے بجائے اِس کے کہ بڑھتی ہوئی روسی افواج کو اپنے نرغے میں لیکر فتح کے لیے جدوجہد کرتا، فوراً تمام افواج کو پسپائی کا حکم دیا۔ اِس لڑائی میں آسٹریا۔ ہنگری کے 350000 فوجی کام آئے جبکہ وہ اپنی سرحد سے 100 میل تک پیچھے ہٹ گئے۔ اِس طرح سارا گلیشیا روسی افواج کے قبضہ میں آ گیا۔

28 اگست کو آسٹریا۔ ہنگری کی مدد کی درخواست اور روسی افواج کے کراکوو پر حملے کے خدشے کے پیشِ نظر جرمن محفوظ دستوں سے نویں آرمی تشکیل دی گئی جس نے 19 اکتوبر کو وارسا پر حملے کے لیے پیش قدمی کی۔ جو یکم نومبر کو بغیر کامیابی کے واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئی۔

فرانسیسی زعما کی درخواست پر روسی افواج نے سلیسیا پر پوزن۔ تھارن کے راستے حملے

کا پروگرام مرتب کیا۔ لیکن جنرل ہنڈن برگ نے بروقت نویں آرمی کو متحرک کر کے روسی افواج کے حملے سے قبل 11 نومبر کو لوڈز پر حملہ کر دیا۔ روسی افواج جنرل ہنڈن برگ اور جنرل آگسٹ وان میکنسن کے بچھائے ہوئے جال سے بڑی قربانیوں کے بعد بچ پائے۔ تاہم لوڈز پر جرمن افواج نے قبضہ کر لیا اور روسی افواج جرمنی پر حملہ کرنے کے قابل نہ رہیں۔

جنگِ عظیم اوّل کا آغاز بلکان کے محاذ سے ہوا۔ جب آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ آسٹریا۔ ہنگری نے سربیا پر تین (3) حملے کیے۔ لیکن سربیا کو اپنے زیرِ تسلط کرنے کی خواہش اِس سال پوری نہ ہو سکی۔ پہلا حملہ 12 اگست کو شروع ہوا۔ ابتدائی طور پر آسٹریا۔ ہنگری کو کامیابی ہوئی لیکن سربیا کی افواج نے سنبھل کر جوابی حملہ کر کے آسٹریائی افواج کو واپس اُن کی سرحد میں دھکیل دیا۔

8 ستمبر جنرل پوٹیورک نے سربیا پر دوسرا حملہ کیا۔ لیکن 16 ستمبر کو سربیا کی افواج کے جوابی حملے سے انہیں واپس اپنی سرحدوں میں آنا پڑا۔ بعدازاں سربیا کی افواج وال جیوو کے بلند میدانوں تک پسپا ہو کر نئی فرنٹ لائن بنا کر مورچہ زن ہو گئیں۔

سال 1914ء کا تیسرا اور آخری حملہ 5 نومبر کو کیا گیا۔ اِس حملے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ 15 نومبر کو وال جیوو اور 19 نومبر کو بلغراد سر کر لیا گیا۔ قریب تھا کہ سربیا کی افواج شکست کھا جاتیں لیکن پرانے بادشاہ کی اپیل پر ایک بار پھر متحد ہو گئیں۔ 3 دسمبر سے 9 دسمبر تک آسٹریا۔ ہنگری کی افواج سربیا کی شدید مزاحمت کے باعث پسپا ہوتی ہوئی اپنی پہلے والی پوزیشن تک آ گئیں۔ 15 دسمبر کو ایک زوردار حملے کے باعث واپس اپنی سرحدوں میں آنے پر مجبور ہو گئیں۔

آسٹریائی افواج تو پسپا ہو گئیں مگر اُن کی فوج سے سربیا میں ایک وبا پھیل نکلی جس کے باعث 70000 فوجی اور بے شمار سویلین مارے گئے۔ آسٹریا۔ ہنگری نے روسی محاذ پر فوجی ضروریات کے باعث اس سال سربیا پر مزید حملے کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

ترکی کے محاذ پر کاکیشیا کی لڑائی میں ترک افواج کو شدید ہزیمت اُٹھانا پڑی۔ جنرل حسن عزت کی قیادت میں 95000 ترک فوج میں جنگ کے اختتام پر صرف 18000 فوجی باقی

بچے تھے۔ اکثریت دشوار گزار علاقوں، طوفانِ بادو باراں، برف باری، سردی اور زخمی ہونے پر علاج معالجہ کی کمی کے باعث ہلاک ہو گئے۔

دوسری طرف میسو پوٹامیا پر برطانوی افواج نے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ برطانوی فوج نے 22 نومبر کو ترکی کے شہر بصرہ پر قبضہ کر لیا۔ جہاں سے وہ پوری عرب دنیا اور خصوصاً ترکی کی نبضوں کو اپنے ہاتھوں میں رکھ سکتا تھا۔

بحری لڑائیوں میں ہولی گو لینڈ کی لڑائی اہم ہے جس میں برطانیہ نے جرمنی کے تین (3) کروزرز تباہ کر دیے۔ جواب میں جرمنی نے برطانیہ پر 22 ستمبر کو حملہ کر کے برطانیہ کے تین (3) کروزرز تباہ کر دیے۔ بعد ازاں مشرقِ بعید میں موجود جرمنی کے بیڑے نے برطانیہ کے دو جنگی بحری جہاز غرق کر دیے۔

جرمنی کی افریقی اور چینی نوآبادیات پر بھی اتحادی ممالک نے حملے کیے۔ افریقہ میں مشرقی افریقہ میں جرمن افواج نے برطانوی افواج کا منہ توڑ جواب دیا جنرل لاٹو کی قیادت میں جرمن افواج نے گوریلا جنگ میں برطانوی افواج کی ایک بہت بڑی تعداد کو جنگ کے چار (4) سالوں تک مصروف رکھا اور 70000 فوجی مارے۔ گوریلا جنگ میں جنرل لاٹو نے ایک اہم باب کا اضافہ کیا۔

جرمنی کی چینی نوآبادیات کائیو چو کو جاپان کے حوالے کرنے کے لیے جاپان نے جنگ کے آغاز پر ہی برطانیہ کے ایما پر الٹی میٹم دے دیا تھا۔ 2 ستمبر کو جاپانی افواج جزیرے پر حملہ آور ہوئیں۔ 23 ستمبر کو برطانوی افواج بھی جاپانی افواج کی مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ 2 نومبر تک جنگ جاری رہی۔ اور آخر کار جرمن افواج نے ہتھیار ڈالتے ہوئے جزیرہ جاپان کے حوالے کر دیا۔

جنگِ عظیم کا پہلا سال مجموعی طور پر جرمنی کی افواج کی ابتدائی کامیابیوں کا سال تھا۔ آسٹریا۔ ہنگری کی افواج اپنے ہر محاذ پر بری طرح ناکام رہیں تھیں۔ جبکہ مرکزی قوتوں کا تیسرا حلیف ترکی بھی اِس سال میدانِ جنگ میں روس اور برطانیہ کے ہاتھوں بری طرح پِٹ چکا تھا۔ جرمنی اکیلا ہر محاذ پر لڑ رہا تھا۔ جبکہ اس کے مدِ مقابل روس، فرانس، برطانیہ اور جاپان کی افواج میدانِ کارزار میں کود چکی تھیں۔ اوّل الذکر تین (3) ممالک کی افواج کو وہ میدانِ جنگ میں اچھی

طرح سبق سکھا چکا تھا۔

تاہم نوآبادیاتی ممالک میں سے صرف مشرقی افریقہ میں ہی جرمن افواج بھرپور مزاحمت کرپائی تھیں۔ دیگر تمام مقامات پر جرمن افواج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

بحری محاذ میں جرمن کسی قدر کامیاب رہے تھے۔ تاہم اُن کے بحری کوڈز کا علم برطانوی افواج کو ہو چکا تھا۔ اور وہ جرمن ریڈیو کے پیغامات کا ترجمہ کرکے جرمنی کے حملوں کے پروگرامات کو قبل از وقت جان جاتے تھے اور اُس کے مطابق منصوبے بنا لیتے تھے۔
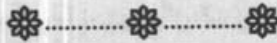
5

1915ء کے دوران جنگ کی صورتِ حال

جنگِ عظیم اوّل کا آغاز گزشتہ سال اگست سے ہو چکا تھا۔ اور تقریباً ہر محاذ پر جنگ کی بھٹی انتہائی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ افریقہ کے صحرا اور جنگلاگ، چین کے جزیرے، مشرقِ بعید کے سمندر، بلکان کے علاقے، پولینڈ، گلیشیا، پروشیا، اور فرانس سب ہی تو جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہو چکے تھے اور مقابل افواج ایک دوسرے پر کارگر حملے کرنے اور شکست دینے کے لیے مواقع کی تلاش میں تھے۔

1914ء کے آخر تک بہت سارے محاذ اپنی شدید ترین صورت حال سے نکل کر ایک معمول کی سی کیفیت میں داخل ہو چکے تھے۔ مغربی محاذ پر بھی جرمن اپنی ابتدائی برتری کے بعد فرانس کے مزید علاقوں کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر کے دفاعی محاذ قائم کیے بھرپور انداز سے دفاع کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ اور اپنی بھرپور توجہ مشرقی محاذ کی طرف مبذول کرتے ہوئے روسی افواج کو جنگ سے نکال باہر کر کے اپنی تمام تر توجہ مغربی محاذ پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری طرف اتحادی افواج جرمن دفاعی جنگ اور روس کی جانب توجہ مبذول کرنے کی کوشش سے واقف ہو کر مغربی محاذ پر اپنے حملوں کی شدت میں اضافہ کرتے ہوئے دشمن کو کمزور

کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اتحادی افواج مزید طاقتور ہوتی جا رہی تھیں۔ اور مغربی اور مشرقی محاذوں پر بھر پور ہزیمت کے باوجود دیگر محاذوں پر بہر حال صورتِ حال بہت زیادہ حوصلہ افزا تھی۔

برطانوی افواج جنہوں نے ابتدائی طور پر صرف 6 ڈویژن فوج سے کارروائی کا آغاز کیا تھا زیرِ مطالعہ سال کے آغاز پر 10 ڈویژن تک پہنچ چکی تھی۔ جبکہ اِس سال کے دوران مجموعی طور پر برطانوی فوج 37 ڈویژن ہو گئی۔ فرانس کی فوج 104 ڈویژن تھی۔ جبکہ اِن کے مدِ مقابل جرمنی کی مغربی محاذ پر فوج 94 ڈویژن اور مشرقی محاذ 65 ڈویژن تھی۔ 1915ء کے دوران محاذہائے جنگ کی تفصیلی کیفیت کچھ یوں رہی:۔

برّی، بحری اور فضائی حملے

1915ء کے دوران مغربی محاذ کی صورتِ حال میں استحکام نظر آتا رہا۔ دونوں متحارب افواج اپنی اپنی فرنٹ لائنز پر خندقوں میں مورچہ بند ہو کر لڑائیاں لڑتی رہیں۔ اتحادی افواج اپنے مقبوضہ علاقوں کے حصول کے لیے جرمن افواج پر حملے کرتی اور ناکام ہونے پر واپس اپنی خندقوں میں پلٹ آتی رہیں۔

مشرقی محاذ پر جرمن اور روسی افواج کی بھر پور توجہ رہی۔ جرمنی کے عزائم کے مطابق پہلے مشرقی محاذ کو خاموش کر کے پھر ساری توجہ مغربی محاذ کی جانب مبذول کی جائے حالانکہ اِس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا بہت حد تک مشکل تھا۔ بلقان، ترکی اور بحری محاذوں پر 1915ء کے دوران کافی زور رہا۔ اسی سال بلغاریہ نے جنگ میں مرکزی قوتوں کی طرف سے شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

اب ہم 1915ء کے دوران جنگ کے مختلف محاذوں کا ایک ایک کر کے تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

مغربی محاذ

مغربی محاذ پر جرمن افواج 14 ستمبر 1914ء کو اپنی نئی فرنٹ لائن کی طرف پسپا ہوگئی تھیں۔ یہ فرنٹ لائن نومبر 1914ء میں ایک مستقل سرحد کی سی صورت اختیار کرچکی تھی۔ اس فرنٹ لائن کو ہنڈن برگ لائن کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس دوران اتحادی افواج نے متعدد بار مختلف مقامات سے جرمن افواج کی اولین صفوں میں شگاف ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر مجموعی طور پر پورے سال کے دوران چند مقامات کے پر زیادہ سے زیادہ تین (3) میل آگے یا پیچھے ہونے کے علاوہ کسی بھی فریق کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اِسی سال مغربی محاذ پر جرمن افواج کی جانب سے جنگی تاریخ میں پہلی بار ''زہریلی گیس'' یعنی ''کلورین گیس'' کا استعمال بطور ہتھیار کیا گیا۔ یہ ''زہریلی گیس'' 22 اپریل کو یپرس کی دوسری لڑائی میں برطانوی افواج پر پھینکی گئی۔

نِو چیپل کی لڑائی

آرڈینیس کے وسیع وعریض جنگل کے قریب جرمن افواج کی ریل کی ایک ہی مناسب پٹری ہونے کے باعث نقل وحمل میں مشکلات کا سامنا تھا۔ جنرل جوفر نے اریس کے شمال میں وِمی کی پہاڑی پر قبضہ کرنے کے لیے حملے کا پروگرام بنایا۔

10 مارچ 1915ء کو برطانوی افواج نے ایک شاندار اور متحیر کردینے والا حملہ کیا۔ اس اچانک حملے کے نتیجے میں جرمن افواج کی اولین صف میں خلا پیدا ہوگیا اور برطانوی افواج اِس خلا میں گھس کر دشمن پر تابڑتوڑ حملے کرنے لگیں۔ میدانِ جنگ میں مصروف جرمن افواج کی کمک کے لیے 4 مختلف رجمنٹس سے 4 بٹالین محفوظ فوج روانہ کی گئی جس کی آمد پر بھی جرمن افواج جوابی حملہ کرنے میں ناکام رہیں اور اپنی اولین صف کے پیدا شدہ خلا کو مزید بڑھنے سے روکنے میں مصروف رہیں۔

اگلے روز جرمن افواج جو رات کی تاریکی میں 16000 کی تعداد میں کمک کے لیے پہنچ

چکی تھیں، جوابی حملے کے لیے تیار تھیں۔ 13 مارچ تک جرمن افواج دشمن پر لگاتار شدید حملے کرتی رہیں تاہم کسی بھی مقام پر اپنی کھوئی ہوئی جگہ حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ جرمن حملوں کا اس قدر فائدہ ضرور ہوا کہ برطانوی افواج نے مزید حملے کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور آخر کار لڑائی کا اختتام ہو گیا۔

یپرس کی دوسری لڑائی

جرمن چیف آف سٹاف جنرل کاؤنٹ فالکن ہائن نے یپرس کے مقام پر اپنے خفیہ ہتھیار ''زہریلی گیس'' کے استعمال کا فیصلہ کیا۔ 22 اپریل کو 5 بجے شام ایک بھرپور گولہ باری کے بعد جرمن افواج کی جانب سے ''زہریلی گیس'' کا استعمال کیا گیا۔ یپرس میں برطانوی افواج میں انتشار پھیل گیا۔

برطانوی کمانڈر جنرل سمتھ ڈورن نے کنیڈا کے محفوظ بریگیڈ کو صفِ اول دوبارہ ترتیب دینے کی ہدایت کی۔ 24 اپریل کو جرمنی نے دوبارہ ''زہریلی گیس'' سے حملہ کیا جس کے نتیجے میں کنیڈا کی فوج کو بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ تاہم جرمن افواج کو اِس صورتِ حال میں بھی مزید پیش قدمی میں سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ 27 اپریل کو جنرل سمتھ ڈورن نے پسپائی کا فیصلہ کر لیا۔

جنرل سمتھ ڈورن کے پسپائی کے فیصلے پر فرانس کے ہیڈ کوارٹر میں خوب بحث ہوئی اور جنرل سمتھ ڈورن کو برطرف کرتے ہوئے اُس کی جگہ جنرل ہربرٹ پلمر کو افواج کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ جنرل ہربرٹ پلمر نے محاذ کا بغور جائزہ لینے کے بعد جنرل سمتھ ڈورن کے پسپائی کے فیصلے کو ہی پسند کیا۔ اِس بار فرانس کے اعلیٰ حکام نے پسپائی کے فیصلے کو قبول کر لیا۔

برطانوی پسپائی کا آغاز یکم مئی کو شروع ہوا۔ اور جرمن افواج کے 25-24 مئی کو ہونے والے ایک اور حملے میں برطانوی افواج یپرس سے مکمل طور پر پسپا ہو گئیں اور یپرس جرمن افواج کے قبضہ میں آ گیا۔ یپرس کی لڑائی میں برطانوی افواج کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔ 70000 ہزار برطانوی فوجی مارے گئے جبکہ جرمن افواج کا نقصان نصف سے بھی کم رہا۔

آرٹوئز کی دوسری لڑائی

مغربی محاذ پر جہاں ایک طرف یپرس کی دوسری لڑائی اپنے زوروں پر تھی اِسی دوران فرانس نے آرٹوئز کے مقام پر ومی رج کے بلند میدان دشمن سے چھیننے کے لیے عرصے سے تیار کیے گئے منصوبے کے مطابق فرانس کی سب سے زوردار فوج کے ذریعے 9 مئی کو آرٹوئز کے مقام پر جرمن افواج پر بھرپور حملہ کیا۔

ابتدائی طور پر فرانس کی افواج کو ومی کی پہاڑی کے ایک مقام پر قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ تاہم بعدازاں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ جرمن افواج نے بھرپور جوابی حملے کرتے ہوئے فرانس کی افواج کو واپس اُن کی کمین گاہ میں جانے پر مجبور کردیا۔ 18 جون کو فرانس کی افواج کے بہت زیادہ نقصان کی وجہ سے فرانس نے ومی کی پہاڑی کے علاقے کو حاصل کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اِس لڑائی میں فرانس کی افواج کا نقصان 100000 سے زائد رہا جبکہ جرمن افواج کا جانی نقصان 75000 کے لگ بھگ رہا۔

خزاں کے حملے

خزاں 1915ء کے دوران فرانس کی افواج نے جرمن صفِ اوّل میں شگاف ڈالنے کی کوششیں کیں۔ اِن میں چیمپین کی دوسری لڑائی قابلِ ذکر ہے جس میں فرانس کی افواج نے ابتدائی طور پر حملے کیے تاہم بعد میں انہیں احساس ہوا کہ مزید تیاری اور فوج کے ساتھ ہی محاذ کھولنے پر کامیابی متوقع ہے تو انہوں نے 25 ستمبر تک جنگ کو ملتوی کردیا۔ دوبارہ جنگ کے آغاز پر فرانس کی دوسری اور چوتھی آرمی نے جرمن اولین صفوں کو چیر ڈالا۔

اِس صورتِ حال کے باعث جرمن چیف آف سٹاف جنرل فالکن ہائنز نے خصوصی طور پر محاذ پر بھر توجہ مرکوز کی اور وہ خود محاذ کی صفِ اوّل پر آکر اپنی افواج کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔ جس سے جرمن افواج ایک نئے جذبے اور روح سے میدانِ عمل میں جم کر لڑنے لگیں۔ اور انہوں نے دشمن کو ایک بار پھر پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا اور اپنی پہلی پوزیشن حاصل کر کے دم لیا۔
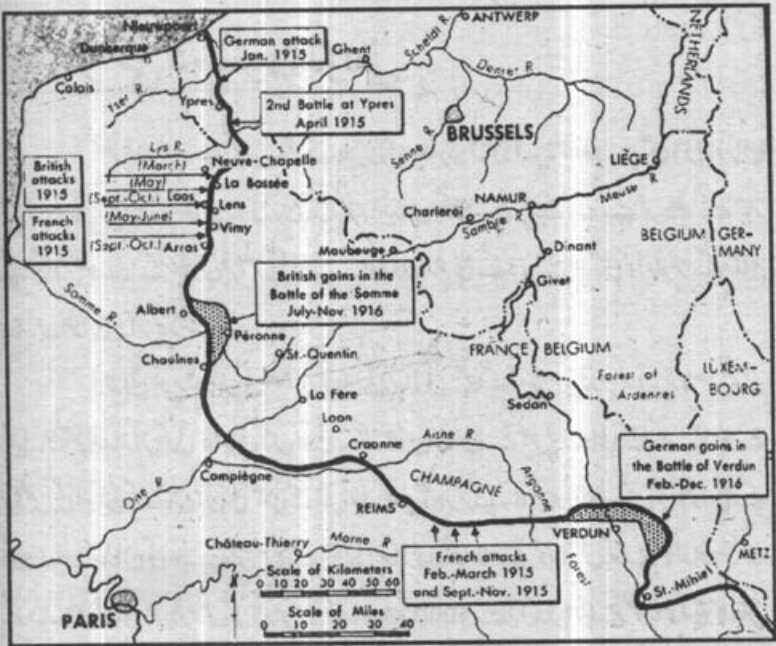
(نقشہ 1915ء کے دوران مغربی صفِ اوّل کی صورتِ حال)

مشرقی محاذ

مشرقی محاذ پر جرمن افواج 1915ء کے آغاز پر روس کو جنگ سے نکال باہر کرنے کے درپے تھیں۔ جنرل ہنڈن برگ اور جنرل لیوڈنڈروف قیصر ولیم دوم کو اِس امر پر سوچنے پر قائل کر چکے تھے کہ پہلی مشرقی محاذ پر دشمن کو خاموش کر دیا جائے تاکہ ساری کی ساری توجہ مغربی اور دیگر محاذوں پر مبذول کرنے کے لیے وافر فوج اور جملہ ذرائع میسر ہوں۔

اِس مقصد کے لیے جرمن اعلیٰ حکام اپنی منصوبہ بندی کرنے لگے تھے اور روس کی گرتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر آسٹریا۔ہنگری کی معمولی مدد کے ساتھ وہ روس کو اِس قدر نقصان پہنچانا چاہتے تھے کہ وہ دوبارہ اُٹھنے کے قابل نہ رہے اور دورانِ جنگ دیگر اتحادی افواج کی جانب توجہ مبذول کرنے پر مشرقی جانب سے روس کی جارحیت کا کوئی خطرہ نہ ہو۔

اِس طرح بلکان کا محاذ اور ترکی کا محاذ بھی خاموش ہو جانے کے بہت زیادہ امکانات

تھے۔ کیونکہ سربیا کو اب تک شکست نہ ہونے کی وجہ روسی افواج کی گلیشیا پر شدید جارحیت تھی۔ جبکہ ترک افواج کا کیشیاء کے برفانی علاقوں میں روس کی افواج سے برسرِ پیکار تھیں۔ اگر روسی افواج کو اپنی تمام تر توجہ مشرقی محاذ پر مبذول کر کے جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کا مقابلہ کرنا پڑتا تو لازماً ترک افواج کو بڑھ کر روس کی کمزور صفِ اوّلین میں شگاف ڈالتے ہوئے روس کے دور اندر تک مار کرنے کا موقع مل جاتا جس سے بچنے کے لیے روسی افواج ایک بار پھر مشرقی محاذ سے اپنی مضبوطی ختم کرتے ہوئے ترک محاذ پر منتقل ہوتیں۔

اِس دوران جرمن افواج روس کو تاخت وتاراج کر ڈالتیں اور روس کسی بھی محاذ پر اپنی افواج کو مجتمع کر کے جوابی حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا اور مرکزی افواج آدھی جنگ جیت جاتیں۔ کیونکہ دوسری جانب فرانس، برطانیہ، بلجیم اور سربیا کی افواج پہلے ہی اکیلے جرمنی کی افواج کے آگے ڈٹ کر نہیں ٹھہر سکتی تھیں۔

جرمن فوج کے مشرقی محاذ پر حملے 1915ء کے آغاز میں ہی شروع ہو چکے تھے۔ اِن حملوں کے پیچھے قوت اور روس کو نکال باہر کرنے کی جدوجہد شامل تھی۔

میسوریا کی سردیوں کی لڑائی

موسمِ سرما کے دوران ہی مرکزی قوتوں نے روس کو جنگ نکال باہر کرنے کے لیے متحدہ محاذ مرتب کیا اِس کے مطابق جرمن دسویں آرمی کو مشرقی پروشیا نے روسی افواج پر ایک بھرپور حملہ کرنا تھا۔ جب کہ اِسی دوران آسٹریا۔ ہنگری کی افواج نے کارپیتھینز کے کناروں پر حملہ آور ہونا تھا۔

جرمن دسویں آرمی نے خاموشی سے دریائے نی مین کے جنوب کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے روس کے تیسرے، چھبیسویں اور بیسویں کور جبکہ سائبیرین تیسرے کور کو نرغے میں لیتے ہوئے آگستوو کے جنگلات کی جانب دھکیلنا شروع کیا۔ اِس پسپائی کے دوران تیسرا، چھبیسواں اور سائبیریا کا تیسرا کور بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ البتہ بیسواں کور مکمل طور پر نرغے میں آ گیا اور آگستوو کے جنگلات میں چاروں طرف سے جرمن دسویں آرمی کے رحم وکرم پر تھا۔

اِس جنگ میں روسی اموات 100000 سے زائد رہیں جبکہ قیدیوں کی تعداد بھی اسی قدر رہی۔ دوسری جانب آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کا جنوب میں کیا گیا حملہ ناکام ہو گیا۔ جس کے باعث پوری کارروائی کے اصل ثمرات حاصل نہ ہو سکے۔ اور جرمنی کی شاندار تکنیکی اور فوجی فتح بھی بے کار ہو گئی۔

گارلس۔ ٹارنوو کی شکستگی

مارچ تک روس کی معاشی، معاشرتی اور اندرونی استحکام کی صورتِ حال بری طرح شکست وریخت کا شکار تھی۔ خوراک کی قلت، انتظامیہ کی نااہلی اور بدعنوانی نے امنِ عامہ کے قیام کی آواز کو جگہ دی اور ملک کے اندر ہر طبقہ امن کا خواہاں اور متلاشی نظر آنے لگا۔ صرف حکومتی ارکان ہی اپنے اتحادیوں کی خوشنودی کے لیے طے شدہ معاہدے کے مطابق جرمنی کو جنگ میں مصروف رکھنے کے خواہش مند تھے۔

جرمنی میں روس کے اندرونی محاذ کی صورتِ حال کا گہری نظر سے جائزہ لیا جا رہا تھا۔ جرمن حکام کی نظر میں یہی وہ فیصلہ کن وقت تھا جب گرتے ہوئے روس پر ایک آخری اور کڑی ضرب لگا کر اُسے جنگ سے دستبردار کرتے ہوئے ساری توجہ اتحادی قوتوں کی جانب مبذول کی جا سکتی تھی۔

جرمن حکام کی سوچ کے مطابق اگر واقعی روسی افواج کو جنگ سے دستبردار کر دیا جاتا تو اتحادی افواج کو عبرت ناک شکست سے کوئی بھی نہ بچا سکتا اور شاید آج دنیا کے نقشے پر فرانس اور برطانیہ کے نام اپنی موجودہ حالت وہیئت میں نظر ہی نہ آتے۔ پھر عالمی قوتوں کے منظرنامے میں بھی شاید امریکہ کی بجائے جرمنی ہی کا ڈنکا بج رہا ہوتا۔

لیکن حالات اِس قدر آسانی سے سوچے سمجھے منصوبوں کے مطابق نہیں ڈھل جاتے۔ قوموں کو اپنے منصوبوں کو عملہ جامہ پہنانے اور اُن کے مطابق درست درست ثمرات حاصل کرنے کے لیے سخت محنت و مشقت اور درست وقت میں درست سمت میں درست اقدامات کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

روسی افواج کی حالتِ زار بہت کمزور ہو چکی تھی۔ وہ کسی بھی مقام پر جرمن افواج کے مقابلے میں کوئی بڑا جوابی حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔ روسی افواج کو کپڑے اور اسلحہ کی کمی کا ہر محاذ پر سامنا تھا۔ دوسری جانب جرمن افواج ہر طرح سے مکمل اور بااعتماد تھیں۔ وہ روس پر ایک اور کاری ضرب لگانے کے لیے گارلیس۔ ٹارنوو کے علاقوں سے بھرپور حملے کی خفیہ طور پر تیاری کر رہی تھیں۔

اِس مقصد کے لیے توپ خانہ اور پیادہ فوج مغربی محاذ سے مشرقی محاذ پر منتقل کر دی گئی تھی۔ اب چوتھی اور بارہویں آرمی پہلے سے زیادہ طاقت ور اور مضبوط ہو کر دشمن پر کارگر حملہ کرتے ہوئے اس کی صفوں میں شگاف ڈالنے کے لیے تیار تھیں۔ 2 مئی کو حملے کا آغاز ہوا۔ اِس حملے میں 950 توپیں استعمال کی گئیں۔ یہ سارا حملہ انتہائی خفیہ رکھا گیا۔ جس کی روسی افواج کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

اگلے دو (2) دِنوں میں جرمن فوج کے بھاری توپ خانے نے روسی افواج کو درہم برہم کرتے ہوئے ایک بہت بڑا شگاف ڈال دیا۔ جس میں پیش قدمی اور بھرپور حملے کرتے ہوئے جرمن افواج آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ 22 جون تک جرمن افواج کی جوگرناٹ نے لیمبرگ کو فتح کر لیا تھا۔ تب وہ شمال کی جانب بڑھے اور 4-5 اگست تک وارسا اُن کے قدموں تلے روندا جا رہا تھا۔

25 اگست کو بریسٹ۔ لیٹووسک کا سقوط ہو چکا تھا۔ اکتوبر کے آغاز تک جرمن افواج روسی علاقوں میں دور تک گھس چکی تھیں۔ اور نئی صفِ اوّل ڈوِنسک کے مغرب سے شمال مغربی جانب پھیلتے ہوئے کولومیا کے دلدلی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ گارلیس۔ ٹارنوو کی شکست و ریخت اور اِس سے ملحقہ محاذوں پر روسی افواج کی اموات 10 لاکھ سے زائد ہو چکی تھیں۔ جبکہ اسی قدر فوجی قیدی بنا لیے گئے تھے۔ اسی سال 5 ستمبر کو زار نکولاس دوم نے روسی افواج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اٹلی کے محاذ

اٹلی نے 23 مئی 1915ء کو برطانیہ اور فرانس کی درخواست پر اپنے ''اتحادِ ثلاثہ'' کے

حلیفوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا اور ابتدائی طور پر آسٹریا۔ہنگری کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

اٹلی کے میدانِ جنگ میں مرکزی قوتوں کے مخالف کودنے کے فوراً بعد ہی جنگ کی مجموعی صورتِ حال نے پلٹا کھالیا تھا۔اٹلی کہ جو اتحادی افواج کے ساتھ اِس لیے شامل ہوا تھا کہ اُسے اتحادی افواج فتح کے نزدیک دکھائی دے رہیں تھیں اب ایک بار پھر سوچ میں مبتلا ہو چکا تھا کہ وہ ہارے والے گروپ کے ساتھ جا کھڑا ہوا ہے اور جیتنے والے گروپ کو چھوڑ چکا ہے جس کا خمیازہ اسے ضرور بھگتنا پڑے گا۔

مگر اب وقت کا چکر آگے نکل چکا تھا۔اٹلی کے ہاتھوں سے تیر نکل چکا تھا۔اور اب اسے میدانِ جنگ میں کودنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا۔دوسری طرف اتحادی افواج اٹلی کو بڑے بڑے لالچ دے کر میدانِ جنگ میں کودنے پر راضی کر چکے تھے اب اٹلی کے تذبذب کے باعث اُسے بار بار مختلف حیلوں بہانوں سے میدانِ جنگ میں عملی طور پر کودنے کی دعوت دے رہے تھے۔

اٹلی اور آسٹریا۔ہنگری کی 484 میل لمبی سرحد کو تین (3) مختلف سیکٹرز میں تقسیم کیا جاسکتا تھا۔مغرب میں ٹائرول کے علاقے، درمیان میں ڈالومٹس اور کارنک کی پہاڑی چوٹیاں اور مشرق میں دریائے ایسونزو کی لکیر۔

اوّل الذکر دونوں سرحدی علاقوں سے حملہ آور افواج کے لیے گزر کر حملہ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔جبکہ اٹلی کی افواج کو حملہ کرنے کے لیے صرف اور صرف دریائے ایسونزو کی باریک پٹی سے گزرنا پڑتا تھا۔جو جارحیت کی کی حکمت کے لحاظ سے انتہائی ناموزوں اور مشکل تھا۔اِس میں ایک اور اہم خطرہ یہ تھا کہ اگر آسٹریا۔ہنگری کی افواج ٹائرول کے علاقوں سے پیش قدمی کرتے ہوئے اٹلی کے شمالی مرکزی حصے پر حملہ کر دیں تو اٹلی کی دریائے ایسونزو کی جانب سے بڑھتی ہوئی افواج کو اپنے نرغے میں لے کر اُن کا قلعہ قمع کر سکتی تھی۔

مرکزی پہاڑی علاقوں کی چوٹیاں مختلف مقامات پر 6500 فٹ تک بلند تھیں اور وہاں سے صرف اٹلی کے کوہستانی فوجی دستے ہی گزر سکتے تھے۔اِس طرف سے حملہ کرنے پر اٹلی کی

افواج آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کی مین سپلائی لائن جو آسٹریا سے ٹرینٹینو کو ملاتی تھی، کو منقطع کرسکتی تھیں۔ مگر اِس مقصد کے حصول کے لیے ایک بہت بڑی تعداد میں کوہستانی فوجی دستے درکار تھے۔ جو اٹلی کے پاس نہ تھے۔ دوسرے یہ بھی کہ اِس حصے سے حملہ کرنے کے لیے صرف چند ماہ کا ہی وقت میسر آتا تھا۔

اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر دونوں ممالک کے لیے پیش قدمی کے لیے صرف ایک ہی راستہ بچتا تھا اور وہ دریائے ایسونزو کا تھا۔ اٹلی اِس میں بھی کسی قدر بدقسمت واقع ہوا تھا۔ کیونکہ دریائے ایسونزو کے تمام پل آسٹریا۔ ہنگری کے مکمل کنٹرول اور قبضے میں تھے۔ مشرقی بلند علاقے اور پہاڑی سلسلے پورے طور پر آسٹریا۔ ہنگری کے زیرِ تسلط اور زیرِ قبضہ تھے۔ اٹلی کو اپنے حملے کو کامیاب بنانے کے لیے ایک بہت بڑی پیادہ اور توپ خانے کی فوج کی ضرورت تھی۔

کسی جنگی مبصر کے تبصرے کے مطابق ''دریا اُس وقت تک پار نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک کہ ملحقہ پہاڑوں پر سے دشمن کی بمباری کو خاموش نہ کروادیا جائے اور دریا سے ملحقہ پہاڑوں پر سے دشمن کی بمباری ختم کروانے کے لیے دریا پار کرنا ضروری تھا۔''

اٹلی کے محاذ پر آسٹریا۔ ہنگری نے بھرپور دفاعی انداز سے کارروائیوں کا جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ جنرل کونریڈ نے اٹلی کے محاذ پر 14 کور صف آراء کردیے۔ اِس کے علاوہ جرمن افواج کی جانب سے ایک ڈویژن کوہستانی فوج پہاڑی علاقوں پر صف آراء ہونے کے لیے روانہ کردی گئی تھی۔ اٹلی جنرل لوئی گی کیڈورنا کی قیادت میں 35 ڈویژن فوج میدانِ کارزار میں لانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جو آسٹریا۔ ہنگری کے ایک ڈویژن کے مقابلے میں دو (1) ڈویژن فوج کی برتری تھی۔

اٹلی کی جنگی کارروائیاں

جنگ کے پہلے دِن اٹلی کے جنرل کیڈورنا نے ایک عمومی حملے کا اعلان کیا۔ اُس کی پہلی آرمی نے ٹرینٹینو پر حملہ کیا۔ چوتھی آرمی نے شمال مشرقی اولین صفوں پر حملہ کیا۔ دوسری آرمی کیپوریٹو پر حملے کے لیے تیار تھی۔ جبکہ تیسری آرمی دریائے ایسونزو پر گریڈزکا اور مونٹ فیلکن پر حملہ کرنے

کے لیے ترتیب دی گئی تھیں۔ اِس طرح کُل 23 ڈویژن فوج مختلف مقامات پر حملے کے احکامات کی منتظر تھیں۔

16 جون تک اٹلی کی افواج آسٹریا۔ ہنگری کی دفاعی صفوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنے قدم بھرپور انداز سے جما چکی تھیں۔ اب انہیں دریائے ایسونزو پر حملے کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ جس کے لیے 23 جون کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ اٹلی کی افواج ایک بھرپور حملے کے لیے تیار تھیں۔

دریائے ایسونزو کی پہلی چار لڑائیاں:

23 جون 1915ء کو اٹلی نے دریائے ایسونزو پر پہلی لڑائی کا آغاز کیا۔ یہ لڑائی 7 جولائی تک جاری رہی۔ تاہم اِس میں اٹلی کی افواج کو بہت زیادہ کامیابی نہ حاصل ہوئی۔ اس کے بعد دوسری لڑائی کا آغاز 18 جولائی کو ہوا۔ یہ لڑائی 3 اگست تک جاری رہی۔ تیسری لڑائی 18 اکتوبر سے 3 نومبر تک جاری رہی۔ جبکہ چوتھی لڑائی 10 نومبر سے 2 دسمبر تک لڑی گئی۔ اِن چاروں لڑائیوں میں مجموعی طور پر اٹلی کو اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا۔

تاہم اِن جنگوں میں اٹلی کی افواج نے بے مثال قربانیوں کی داستانیں رقم کیں لیکن انہیں اِس کے مقابلے میں کوئی خاص فتح حاصل نہ ہو سکی۔ آسٹریا۔ ہنگری کی افواج چند مقامات سے پیچھے ضرور ہٹ گئیں۔ مگر اب بھی اُن کی دفاعی صفوں میں مکمل ربط و اتحاد اور مضبوطی تھی۔ وہ بڑے بھرپور انداز سے اٹلی کی اپنے سے دوگنی فوج کے بھرپور، جارحانہ اور دلیرانہ حملوں کا جواب دے رہے تھے اور اپنی صفوں میں شگاف ڈالنے کی دشمن کی کوششوں کو ناکام کر رہے تھے۔

1915ء کے اختتام پر اٹلی کے فوجی نقصان کی تفصیل کچھ اِس طرح تھی: 66000 فوجی مارے جا چکے تھے؛ 190000 زخمی تھے جبکہ 22500 قیدی بنا لیے گئے تھے۔ دوسری طرف آسٹریا۔ ہنگری کے مجموعی نقصانات 165000 تھے۔ آسٹریا۔ ہنگری کی فوج میں اضافہ کیا گیا تھا جبکہ اٹلی کی فوج تھکن اور کم ہمتی کا شکار ہو چکی تھی۔

(نقشہ اٹلی کے پہلے محاذ اور دریائے ایسونزو کی لڑائیاں)
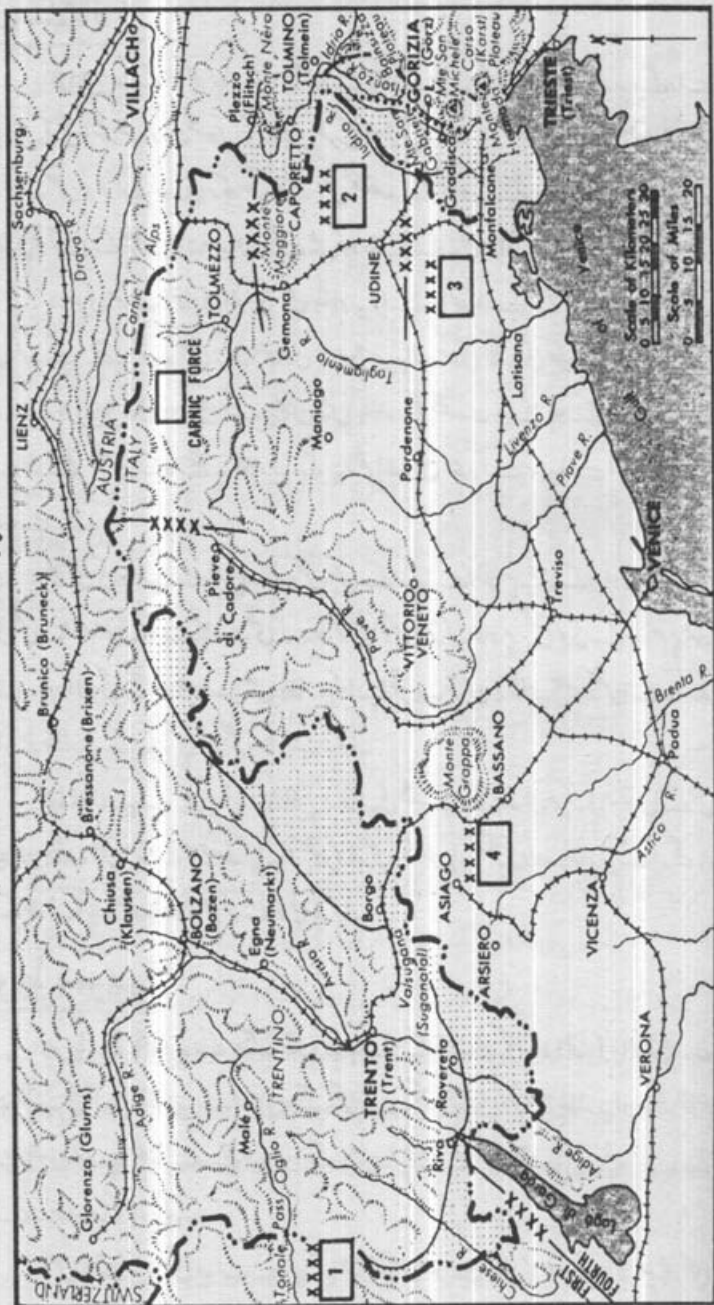
بلکان کے محاذ

1915ء کے موسمِ بہار میں جرمنی نے بغداد ریلوے کو سربیا اور بلغاریہ کے راستے جاری کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی۔ اِس طرح وہ ترکی، آسٹریا۔ ہنگری اور اپنی افواج کی بلا روک ٹوک نقل و حرکت جاری رکھ سکتا تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے جرمنی نے بلغاریہ کو مرکزی قوتوں کے شانہ بشانہ میدانِ جنگ میں کود جانے کے لیے مراعات کی پیش کش کی۔

دوسری طرف اتحادی افواج بھی بلغاریہ کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بڑی بڑی پیش کشیں کر رہے تھے۔ مگر بدقسمتی سے اتحادی افواج سربیا اور مونٹی نیگرو کی حلیف تھیں۔ اور اِن ممالک نے 1913ء کی دوسری جنگِ بلکان میں بلغاریہ کو شکست دیتے ہوئے اِس کے ڈھیر سارے علاقے چھین لیے تھے۔ بلغاریہ کے یہ زخم اندر ہی اندر اسے سربیا سے انتقام لینے پر مجبور کر رہے تھے۔

جرمنی کی جانب سے بھرپور پیش کش اس کے سربیا سے انتقام لینے کے ارادے کی تکمیل کر رہی تھی۔ تاہم صرف ایک رکاوٹ تھی کہ برطانوی افواج ترک محاذ پر گیلی پولی کے مقام پر حملہ آور تھیں۔ اور اُن کی فتح کی صورت میں بلغاریہ کو اپنے قریب ترین برطانیہ جیسے دشمن سے واسطہ پڑ جاتا۔ جو بلغاریہ کے لیے کسی طور بھی مناسب نہ تھا۔

لہٰذا بلغاریہ نے گیلی پولی کے محاذ پر برطانیہ کی شکست کے بعد ہی مرکزی قوتوں کے حق میں میدانِ جنگ میں اترنے کا فیصلہ کیا۔ 6 ستمبر کو جرمنی، آسٹریا۔ ہنگری اور بلغاریہ نے اگلے ماہ سربیا کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

سقوطِ سربیا

سربیا نے بلغاریہ کے جنگ میں کود جانے کے ڈر سے کئی بار اتحادی افواج سے اجازت طلب کی کہ وہ بلغاریہ سے اعلانِ جنگ کر دے۔ مگر اتحادی افواج بلغاریہ اور دیگر تمام بلکان ریاستوں کو اپنے جھنڈے تلے میدانِ جنگ میں دیکھنے کے متمنی تھے۔ اِس لیے انہوں نے ایسا کرنے سے سربیا کو باز رکھا۔

اُس وقت سربیا کی جانب سے کیا گیا حملہ مختلف صورتِ حال کا مظہر ہوتا تاہم پھر بھی

تین (3) اطراف سے حملے کی صورت میں سربیا کو آخر کار مکمل طور پر تباہ و برباد ہونا ہی تھا۔ سربیا کے خلاف مرکزی قوتیں 3 لاکھ فوج میدان میں لے آئیں تھیں۔ شمال میں جرمن گیارہوں اور آسٹریا۔ ہنگری کی تیسری آرمی، بلغراد کے مشرق اور مغرب پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھیں۔ جبکہ مشرق میں بلغاریہ کی پہلی اور دوسری آرمی سربیا پر شمال سے جنوب کی جانب حملہ کرنے کے لیے تیار تھی۔

مرکزی قوتوں کے پاس مزید محفوظ فوج کے دستے بھی تھے۔ بلغاریہ کی دوسری آرمی کی قیادت بلغاریہ کا چیف آف سٹاف کر رہا تھا۔ جبکہ دیگر تمام افواج کی قیادت جرمن فیلڈ مارشل آگسٹ وان میکنسن کر رہا تھا۔ سربیا کی 2 لاکھ فوج کو پانچ آرمیز میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جو دو مخالف سمت میں محاذوں پر لڑ رہی تھیں،

6 اکتوبر کو جرمن اور آسٹریا۔ ہنگری کی افواج نے بھرپور گولہ باری کے بعد ساوا کے مقام سے پیش قدمی شروع کی۔ اگلے روز وہ دریائے ڈینوب پار کر چکی تھیں۔ سقوطِ بلغراد 9 اکتوبر کو ہوا۔ سربیا کی پہلی اور تیسری آرمی نے بھرپور جوابی حملہ کیا مگر طاقت ور دشمن کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی۔

دوسری جانب بلغاریہ کی افواج 11 اکتوبر کو سرحد پار کر کے سربیا میں داخل ہو گئیں۔ 18 اکتوبر تک جنرل میکنسن کی تمام فوج دریا کے کنارے جمع ہو چکی تھی اور وہ سربیا پر ایک کاری ضرب لگانے کے لیے تیار تھا۔ سربیائی افواج تیزی سے پسپا ہو رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ ہی سرب بھی اپنی فیکٹریاں، دکانیں اور مکان وغیرہ چھوڑتے ہوئے پسپا ہوتے جا رہے تھے۔

بلغاریہ کی افواج میکڈونیا کی کمزور آرمی کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ 23 اکتوبر کو انہوں نے ویلز پر قبضہ کر لیا۔ اِس طرح وہ برطانیہ اور فرانس کی دو (2) ڈویژن امدادی فوج کو جو سیلونیکا سے آ رہی تھیں، کو روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ برطانیہ اور فرانس کی جانب سے یہ کمک تعداد میں بہت کم اور بہت تاخیر سے پہنچی تھی۔ جو محاذ پر کوئی خاص اثر نہ ڈال سکی تھی۔ نومبر کے وسط تک سربیا کی افواج کے پاس ہتھیار ڈالنے کے علاوہ صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کہ وہ پہاڑوں کی جانب پسپا ہو جائیں۔

انہوں نے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں پسپا ہونے کا ایک انتہائی مشکل اور دشوار

فیصلہ کیا جو تاریخ کی سب سے مشکل اور دشوار گزار پسپائی تھی۔ اِس تاریخی پسپائی کے بعد 150000 فوجیوں نے اتحادی بحری جہازوں کے ذریعے کرفو کے مقام پر جا کر پناہ لی۔ اِس پسپائی میں بھوک، پیاس، سردی اور مضبوط دشمن کی گولہ باری سے 100000 سے زائد سربیائی فوجی مارے گئے جبکہ 160000 سے زائد جنگی قیدی بنا لیے گئے۔

بلغاریہ سربیا کی افواج کا پیچھا کرنا چاہتا تھا۔ مگر جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اِس کی سیاسی وجوہات تھیں۔ جرمن افواج نے سیلونیکا کو اتحادی افواج سے پاک کرنے کے لیے پیش قدمی ترک کر دی۔
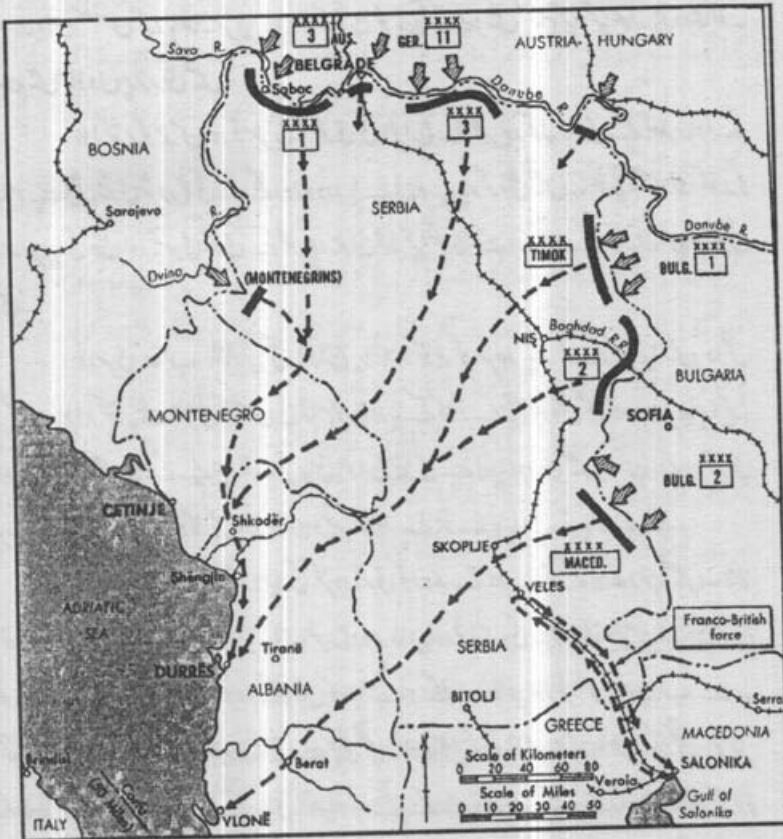
(نقشہ سقوطِ سربیا)

ترکی کے محاذ

ترکی کا محاذ 1915ء کے دوران انتہائی سرگرم محاذ رہا۔ ترکی از خود کسی خونریزی میں بھرپور حصہ لینے پر تیار نہ تھا۔ تاہم گیلی پولی پر برطانوی حملے کے خدشے کے تحت جرمنی نے ترک افواج کو از سرِ نو منظم کیا اور ترکی کے 40 ڈویژنوں میں 400000 فوج کو بڑھا کر 52 ڈویژنوں میں مجموعی طور پر 800000 فوج کھڑی کر دی۔

کاکیشیاء کا محاذ

کاکیشیائی جنرل یوڈنیچ کو اطلاع ملی کہ جھیل وان کی شمالی پہاڑیوں میں تین (3) ڈویژن ترک فوج موجود ہے۔ جسے نکال باہر کرنے کے لیے جنرل یوڈنیچ نے جنرل اوگانووسکی کو ہدایت کی کہ وہ بھرپور پیش قدمی کر کے دشمن کو اپنے علاقے سے نکال باہر کرے۔

تاہم بعد میں ترک افواج کی زیادہ تعداد کا علم ہونے پر جنرل یوڈنیچ نے جنرل اوگانووسکی کو محتاط رہنے کی ہدایت بھجوائی جو اُسے بہت تاخیر سے ملی جب کہ وہ ترک کمانڈر عبدالکریم پاشا کے نرغے میں آ چکا تھا۔ ایک ہفتے تک جنرل اوگانووسکی نے اپنے ہیڈکوارٹر کو کوئی رپورٹ نہ بھیجی۔ جنرل یوڈنیچ نے اپنے سٹاف آفیسر کو صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ جنرل اوگانووسکی کا توپ خانہ اور ٹرانسپورٹ تباہ ہو چکی ہے۔

وزیرِ جنگ انور پاشا نے عبدالکریم پاشا کو دشمن کو کاکیشیا سے نکال باہر کرنے کی ہدایت کی لیکن ثانی الذکر نے اپنی سپلائی لائن منقطع ہونے کے ڈر سے محتاط پیش قدمی جاری رکھی۔ جنرل یوڈنیچ نے ایک اور فوج ترک افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ کی جس کا مقصد ترک افواج کی سپلائی لائن کو منقطع کرنا تھا۔ جنرل این این بارانوو کی قیادت میں روسی افواج نے ترک افواج کی سپلائی لائن پر حملہ کر دیا اور بہت سی بندوقیں اور کھانے پینے کی اشیاء چھین لیں۔

اِس جنگ میں ترک افواج کا جانی نقصان 10000 تک ہوا۔ جبکہ 6000 کو قیدی بنا لیا گیا۔ جنرل یوڈنیچ کو ایک شاندار کامیابی حاصل ہوئی مگر اسے اِس کامیابی سے مزید فائدہ اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔

جنوبی میسوپوٹامیا کا محاذ

برطانوی افواج جو بصرہ کے بعد القرنا کو بھی فتح کر چکی تھیں۔ اب امارہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ 3 جون کو برطانوی افواج نے امارہ کو فتح کر لیا۔ برطانیہ کی ایک اور فوج احواز کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اِس فوج کو شدید گرمی اور ذرائع نقل وحمل کی کمی کی وجہ سے شدید دشواریوں کا سامنا تھا۔ جنرل جارج الیف گورنچ کی قیادت میں برطانوی فوج کا میسوپوٹامیا کے محاذ پر یہ سب سے اہم حملہ تھا۔ اِس کے نتیجے میں احواز پر قبضے سے اتحادی افواج تیل کے تمام ذخائر پر قبضہ کر سکتی تھیں۔ برطانوی افواج نے آخر کار شدید مزاحمت کے بعد ناصریہ پر 25 جولائی کو قبضہ کر لیا۔

برطانوی افواج اِس کے بعد کٹ الِامارہ کی جانب بڑھیں۔ ان کی قیادت ٹاؤن شینڈ کر رہا تھا جو پاکستان کے صوبہ سرحد میں اُس وقت برطانوی فوج کے کامیاب آپریشنز کا ذمہ دار تھا۔ ٹاؤن شینڈ 28 ستمبر کو العزیزیہ کی جانب بڑھا۔ اور 5 اکتوبر کو العزیزیہ پر قابض ہو گیا۔

اب برطانوی حکام کی جانب سے بغداد پر حملے کی اجازت مل چکی تھی۔ جنرل نکسن جو ہندوستان میں چیف آف سٹاف تھا اِس پورے محاذ کی قیادت کر رہا تھا۔ جنرل نکسن نے برطانوی افواج کو بغداد کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ 22 نومبر کو بغداد پر حملہ کیا گیا جو مکمل طور پر ناکام رہا۔ اور برطانوی افواج کو 4500 جانوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اور برطانوی افواج پسپا ہو کر واپس کٹ آ گئیں۔

گیلی پولی کا محاذ

2 جنوری 1915ء کو روسی چیف آف سٹاف نیکولاس نے اتحادی افواج سے ترک محاذ پر زوردار حملہ کر کے ترکی کو جنگ سے دستبردار کرنے کی استدعا کی تھی تا کہ کاکیشیا میں ترک حملے کا خطرہ ختم ہو جائے۔ تاہم کاکیشیا میں ترک افواج کی شکست کے بعد کاکیشیا کے محاذ پر روسی افواج کو اپنا دم خم نظر آنے لگا تھا۔ تاہم اتحادی افواج نے اپنے بھرپور فائدے کے لیے ڈارڈنیلیز سے راستہ بنانے کا فیصلہ کیا۔

ابتدائی طور پر اتحادی ممالک کی بحریہ نے کارروائی کی جس کی بابت تفصیل سے ہم اگلے چند صفحات میں پڑھیں گے۔ برطانوی بحریہ کی ناکامی کے بعد برطانوی حکام نے گیلی پولی کے مقام پر وسیع پیمانے پر اپنی افواج اتارنے کا فیصلہ کیا۔ جنرل آئن ہیملٹن گیلی پولی پر حملے کے

لیے تیار ہوگیا۔ اُس نے 150000 فوجی طلب کیے۔ جس کے جواب میں 75000 فوج جو آسٹریلیا، نیوزی لینڈ (اینزیک Anzac) اور فرانسیسیوں پر مشتمل تھی روانہ کی جبکہ اِن کی مدد کے لیے 29 ویں ڈویژن کو مامور کیا۔

ترک جنرل لی مون وان سینڈرز کو بڑے پیمانے پر ہونے والے بحری حملوں نے کسی بڑے حملے کی بابت ہوشیار کردیا تھا۔ جنرل سینڈرز نے ازخود چھان بین شروع کردی اور جیسے ہی اسے برطانوی 75000 فوج کی آمد کی اطلاع ملی، اُس نے اپنی 84000 فوج کو برطانوی فوج کی متوقع آمد کے مقامات پر تعینات کردیا۔

روسی بحیرہ اسود کے بیڑے نے باسفورس کے قلعوں پر بھاری گولہ باری شروع کردی۔ جس سے بولیئر پر حملے کے واضح آثار مل گئے۔ روسی افواج چاہتی تھیں کہ قسطنطنہ کی فتح کے وقت اتحادی افواج کے شانہ بشانہ اُس کی افواج بھی کھڑی ہوں۔ مصطفیٰ کمال پاشا جو اس وقت ترک ڈویژن کا جونیئر کمانڈر تھا، اینزیک کے خلاف سینہ سپر ہوگیا اور برطانوی افواج کے بلند مقام پانے کے منصوبے کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔

(کمال اتاترک پاشا گیلی پولی کی لڑائی میں)

برطانوی افواج بحری جہازوں سے گیلی پولی کے ساحل پر اتریں۔ بدقسمتی سے وہاں اُن کے انتظار میں ترکی کی افواج موجود تھیں۔ اِس طرح برطانوی افواج کو قدم جمانے سے پہلے ہی بری طرح نقصان اُٹھانا پڑا۔ اتحادی ممالک میں گیلی پولی کے محاذ کو بڑی اہمیت دی جارہی تھی۔ وہ تمام مغربی محاذوں سے زیادہ گیلی پولی کے فوری اور مثبت نتائج حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔

25 مئی کو عوامی دباؤ کے باعث ایک متحدہ حکومت قائم کی گئی اور دو (2) روز بعد ہی چرچل کو گیلی پولی میں مثبت نتائج حاصل نہ کرنے پر اپنے عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ اب نئی حکومت گیلی پولی کے محاذ پر بھرپور توجہ اور اخراجات کرنے کے لیے تیار تھی۔ نئی حکومت نے گیلی پولی کے محاذ پر افواج کی تعداد بڑھادی اور وہاں 13 ڈویژن فوج تعینات کر دی۔ دوسری جانب ترکی کی 16 ڈویژن فوج میدان میں تھی۔

اب اتحادی افواج کے نئے منصوبے کے تحت سوولا کے ساحل پر دو (2) ڈویژن فوج کو اتارنا تھا جو مشرق کی جانب اینزیک کے کور کے ساتھ پیش قدمی کرتی۔ اِس طرح ایک کامیاب حملہ ترک افواج کو اُن کے عقب سے علیحدہ کر دیتا۔ 6 اگست کو اتحادی افواج نے بلا روک ٹوک بحری جہازوں سے زمین پر قدم رکھا۔ اِن افواج نے بجائے فوجی انداز سے بڑھنے کے اُن علاقوں میں سیر وسیاحت اور سمندری پانی سے غسل وقت گزار دیا۔

اِس دوران جنرل سینڈرز کو اپنی دو (2) ڈویژن فوج وہاں پہنچانے کا موقع مل گیا۔ جس نے موقع پر پہنچ کر اتحادی افواج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر اتحادی افواج نے گیلی پولی کا محاذ ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی افواج کو فوری طور پر وہاں سے نکالنے کا حکم دیا۔ 20 دسمبر تک اینزیک جبکہ 9 جنوری 1916ء تک باقی برطانوی و فرانسیسی افواج گیلی پولی سے نکل آئیں۔

گیلی پولی سے نکلتے ہوئے اتحادی افواج کو کوئی نقصان نہ ہوا۔ تاہم اِس پورے محاذ کے دوران صرف برطانیہ کے 214000 فوجی مارے گئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ برطانیہ کی جانب سے اِس قدر غیر ذمہ دارانہ طور پر کوئی بھی دیگر محاذ نہیں لڑا گیا تھا۔ ہر بار اتحادی افواج درست مقام پر اترتیں۔ اور بروقت پیش قدمی کر کے دشمن کو گیلی پولی سے نکال باہر کر سکتی تھیں مگر ہر بار مواقع کو ضائع کر دیا گیا۔

(نقشہ گیلی پولی محاذ)
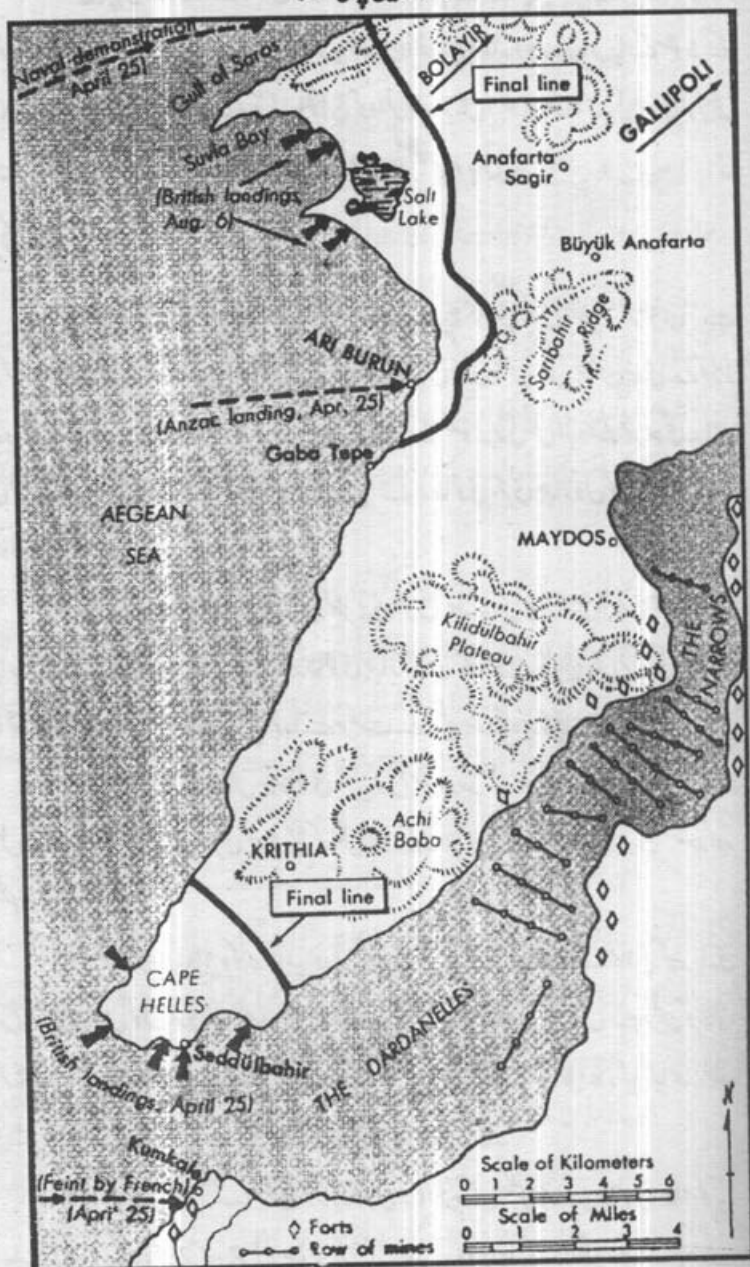
گیلی پولی کے محاذ سے واپسی کا فیصلہ دو (2) وجوہات کی بنا پر کیا گیا تھا۔ ایک تو اِس محاذ پر اتحادی افواج خصوصاً برطانوی افواج کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ دوسرے سربیا کے سقوط کے بعد بغداد ریلوے کے چالو ہونے پر ترک افواج کو وافر مقدار میں اسلحہ اور خوراک کی فوری فراہمی ممکن ہو گئی تھی۔ جس کے بعد اُن کی دفاعی پوزیشن مزید مستحکم ہو جاتی۔

بحری محاذ

1915ء کے آغاز پر ہی جرمنی نے برطانیہ پر اپنے بہتری بحری ہتھیار ''زیپلن'' سے حملہ کر دیا۔ بعد ازاں 24 جنوری کو ڈوگر بینک کی بحری لڑائی ہوئی جس میں جرمن نیوی کے کوڈز سے واقفیت کی وجہ سے برطانوی بحریہ کو جرمنی کے حملے کے منصوبے کی قبل از وقت خبر ہو گئی۔ اِس بحری لڑائی میں جرمن کمانڈر ایڈمرل فرینز وان ہیپر نے برطانوی بحری جہازوں کو اپنا منتظر پایا تو فوراً واپسی کا حکم دیا۔

واپسی کے دوران جرمن جہاز سیڈلیٹز بری طرح گولہ باری کی زد میں آیا۔ تاہم وہ غرق نہ کیا جا سکا۔ جبکہ جرمن گولہ باری کا نشانہ برطانوی جہاز ''لائن'' تھا جو اِس لڑائی میں لیڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس جہاز کو شدید نقصان پہنچا اور اسے مرمت کے لیے بندرگاہ پر پہنچانا پڑا۔

اِس مختصر بحری جنگ میں برطانوی بحریہ کو فتح ضرور حاصل ہوئی مگر خاطر خواہ نتائج ہرگز حاصل نہ ہو سکے۔ اور جرمن بحری جہاز بچ کر نکل بھاگے۔ جرمن بحریہ بعد ازاں بہت مستعد اور مستحکم ہو گئی۔

19 فروری 1915ء کو برطانیہ اور فرانس کی بحریہ نے ڈارڈنیلیز کے محاذ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اِس گولہ باری کا مقصد ساحلِ سمندر کے ساتھ بنے ہوئے قلعوں سے دشمن کو نکال باہر کرنا تھا۔ وائس ایڈمرل کارڈن کے منصوبے کے مطابق گیلی پولی کے محاذ کا آغاز کیا گیا تھا۔ جلد بازی میں برطانوی حکام منصوبے کے مطابق بھرپور تیاری نہ کر سکے۔

اِس کی بڑی وجہ ترک افواج اور جرنیلوں کو نااہل سمجھنا بھی تھا۔ برطانوی حکام کو یہ اطلاعات نہیں ملی تھیں کہ جرمن جنرل سینڈرز کو ترک محاذ کی کمان سونپی جا چکی ہے اور موصوف

انتہائی رازدارانہ انداز سے گیلی پولی پہنچ چکا ہے۔

اتحادی بحریہ کا دوسرا حملہ 25 فروری کو کیا گیا۔ اِس حملے میں بیرونی قلعے توڑ دیے گئے اور دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ تاہم اِن ابتدائی حملوں میں وائس ایڈمرل کارڈن کو احساس ہو گیا کہ صرف بحریہ کے ساتھ اِس محاذ پر مزید پیش رفت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن چرچل نے اس کی درخواستوں پر کوئی غور نہ کیا اور اسے آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔

منصوبے کے مطابق پیش قدمی جاری رہی۔ 4 مارچ سے منصوبے میں معمولی ترامیم کی گئیں اور اگلے دو (2) ہفتوں تک دِن کو بڑے برطانوی جہاز گولہ باری کر کے دشمن کو پیچھے دھکیلتے اور رات کے عمل میں بارودی سرنگیں صاف کرنے والا عملہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ تاہم بارودی سرنگیں صاف کرنے والے عملے کو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ اور زمینی گولہ باری سے انہیں شدید نقصان ہو رہا تھا۔

کورڈن پر چرچل کے شدید دباؤ کے باعث موصوف کو شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے میدانِ جنگ سے گھر واپس بھیج دیا گیا۔ اور اس کی جگہ ایڈمرل روبک کو محاذ کی قیادت سونپی گئی۔ روبک نے دِن کی روشنی میں گولہ باری کی آڑ میں بارودی سرنگوں کو صاف کرنے والی فوج کو مستعد کیا۔ 18 مارچ کو اِس حملے کا آغاز ہوا اور سہ پہر تک یہ حملہ بہت زیادہ کامیاب نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قلعہ دشمن سے خالی کرا لیا گیا ہے۔

لیکن جب بارودی سرنگوں کو صاف کرنے والے عملے نے دوبارہ اپنا کام شروع کیا تو ساحلی علاقوں سے فائرنگ کے باعث اُن کا کام بہت دشوار ہو گیا۔ اسی اثنا میں اچانک ہی اتحادی بحریہ کے تین بحری جہاز غیر صاف شدہ بارودی سرنگوں سے ٹکرا کر غرق ہو گئے۔ اِس صورتِ حال کے پیشِ نظر روبک نے عمومی پسپائی کا اعلان کر دیا۔

اب کارڈن کے بری حملوں کی درخواست کی اہمیت اتحادی افواج کے حکامِ بالا کو سمجھ آئی۔ اس لیے منصوبے کو از سرِ نو مرتب کرتے ہوئے بری فوج کو بنیادی کردار ادا کرنے کی ذمہ داری دی گئی جبکہ بحریہ کو بری فوج کی مدد کے لیے مامور کر دیا گیا۔

مجموعی صورتِ حال

1915ء کے دوران مغربی محاذ کی مجموعی صورتِ حال چکی کے دو پاٹوں میں پسنے والے گھیوں کی مانند رہی۔ دونوں متحارب فریقین ایک دوسرے کی دفاعی صف بندی میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی کو بھی کوئی خاص کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ تاہم بھاری جانی و مالی نقصان ہوتا رہا۔ تمام شریک جنگ ممالک میں اِس محاذ پر ہونے والے نقصانات کے باعث معاشی مسائل کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

دوسری جانب مشرقی محاذ پر جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کی افواج روسی افواج کو بھرپور شکست دینے کے لیے کوششیں کر رہی تھیں۔ اِس محاذ پر جرمن افواج فتح کے پھریرے لہرا رہی تھیں جبکہ آسٹریا۔ ہنگری کی افواج ابتدائی طور پر اپنی کارروائیوں میں ناکام رہی تاہم جرمن افواج سے مل کر کی گئی کارروائیوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن جرمن افواج اپنی توقع کے مطابق روسی افواج کو جنگ سے دستبردار کرنے میں ناکام رہیں۔

اسی سال اٹلی نے بھی جنگ میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ برطانوی اصرار پر اٹلی نے 23 مئی کو عملی طور پر میدانِ جنگ میں کودنے کا منصوبہ بنایا۔ اٹلی کو حملہ کرنے کے لیے 484 میل لمبی سرحدی پٹی پر دریائے ایسونزو کی لائن سے بھرپور حملے کرنے کا موقع تھا۔ اٹلی کی افواج نے پہلی چار لڑائیوں میں قدم جمانے کے لیے کچھ جگہ حاصل کر لی۔ جبکہ آسٹریا۔ ہنگری کی افواج دفاعی لحاظ سے بھرپور مقابلہ کر رہی تھیں۔

بلکان کے محاذ پر بلغاریہ کے میدانِ جنگ میں مرکزی قوتوں کی حمایت میں کود جانے کے باعث صورتِ حال اتحادی ممالک کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ سربیا کی 150000 فوج ہجرت کر کے کرفو کے مقام پر چلی گئی تھیں اور سربیا کا سقوط ہو گیا۔

سربیا کے سقوط سے بغداد ریلوے لائن سے متعلق جرمنی کا دیرینہ خواب پورا ہو گیا اور ترکی سے بلاواسطہ طور پر نقل و حمل کا آغاز ہو گیا جس کے مرکزی قوتوں پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ ترک محاذ پر اتحادی افواج نے اِسی سال اپنی بھرپور توجہ مبذول رکھی۔ ایک طرف تو بغداد

پر قبضے کا منصوبہ ناکام رہا جبکہ دوسری جانب سال بھر کے گیلی پولی کے محاذ کے بعد خاطر خواہ کامیابی نہ ملنے پر اپنے منصوبے کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

گیلی پولی کے محاذ پر برطانوی افواج کو شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ جبکہ اسی محاذ پر اتحادی افواج کی جانب سے بے ربط اور بے ہنگم فیصلوں کے نتیجے میں انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویے کی عکاسی ہوئی۔ اور برطانوی افواج کا دبدبہ اور وقار بُری طرح مجروح ہوا۔

بحری مہموں میں بھی ڈوگر بینک کی مہم میں برطانوی بحریہ کو سبقت حاصل رہی جبکہ گیلی پولی کے محاذ کی ابتدا بحری حملوں سے ہی کی گئی تھی۔ برطانوی حکام کے اِس محاذ پر تیزی سے کامیابی حاصل کرنے کے عزائم کے پیشِ نظر مقامی بحری ایڈمرل نے فوری طور پر حملے کی پالیسی مرتب کی جس پر برطانیہ کے تین بحری جہاز بارودی سرنگوں سے ٹکرا کر ڈوب گئے۔ بعد ازاں بری فوج کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اُن کی معاونت کے لیے بحری افواج کو مامور کیا گیا۔

نوآبادیاتی محاذوں کا تفصیلی ذکر ہم گزشتہ باب میں ہی کر چکے ہیں۔ سالِ ہٰذا میں بھی کیمرون، مشرقی افریقہ اور جنوب مغربی افریقہ میں اتحادی اور مرکزی افواج مدِ مقابل رہیں۔ آخر الذکر اسی سال اتحادی افواج کے ہاتھوں زیر ہوا اور وہاں برطانوی پھریرا لہرانے لگا۔ جبکہ اول الذکر دونوں نوآبادیاتی ممالک کی جنگوں کا فیصلہ اِس سال نہ ہو سکا۔

بظاہر 1915ء کا پورا سال مرکزی قوتوں کے لیے بہترین سال رہا۔ اتحادی افواج کو دورانِ سال بہت شدید لڑائیوں میں بھاری جانی و مالی نقصانات اُٹھانے پڑے۔ خصوصاً روس کے لیے یہ سال انتہائی مشکل اور بحرانوں کا سال تھا۔ ایک طرف تو اُس کی معیشت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی تھی۔ دوسری طرف اِس کی افواج جرمن افواج کے ہاتھوں بے رحمی سے ذبح ہو رہی تھیں۔ ملک میں بے چینی کی لہریں شدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ لوگوں کو خوراک کی کمی اور روزگار کی عدم دستیابی کے باعث افراطِ زر کی جکڑن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔
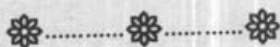
6

1916ء کے دوران جنگ کی صورتِ حال

جنگِ عظیم اوّل زور و شور سے جاری تھی۔ اتحادی اور مرکزی ممالک مسلسل جنگ کے ایندھن کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ اسلحے کی تیاری پر ان ملکوں کی معیشت صرف ہو رہی تھی۔ اب تو چند ممالک میں معاشی بحران آچکے تھے۔ اور وہاں لوگ جنگ کے خاتمے اور امن کے قیام کے مطالبات کر رہے تھے۔ جنگ میں مارے جانے والے افراد کے لواحقین حکمرانوں کو اپنے عزیزوں کا قاتل گردانتے ہوئے کھلے عام اُن کے خلاف اظہارِ خیال کرنے لگے تھے۔

جنگ عوام کے لیے اِس قدر اہمیت اختیار کر گئی تھی کہ گزشتہ سال برطانیہ کے سیکریٹری برائے جنگ چرچل کو ڈارڈنیلیز کے محاذ میں شکست پر نااہل تصور کرتے ہوئے ہٹا دیا گیا۔ جبکہ برطانوی پارلیمنٹ ہٹاتے ہوئے نئی حکومت تشکیل دی گئی۔ روس میں چیف آف جنرل سٹاف کو ہٹا کر خود زار نیکولاس نے افواج کی قیادت سنبھال لی۔

مگر جنگ اب بھی اپنی بھرپور تندی و تیزی سے جاری تھی۔ میدانِ جنگ میں افواج ایک دوسرے پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہی تھیں۔ گولہ بارود اور توپیں شعلہ بار تھیں۔ انسانی جسم کٹ کٹ کر بکھر رہے تھے۔ دھوئیں کے بادلوں میں جلی ہوئی لاشوں اور خون کی بو کے بھبھوکے اُٹھ

رہے تھے۔

انسانیت اپنی تباہی کے مناظر سے اشک بار تھی۔ ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کا دعویٰ کرنے والے انسان درنگی اور حیوانی جبلتوں کا بدرجہِ اُتم اظہار کر رہے تھے۔ تاریخ محوِ تماشا تھی اور وقت انسانی حیات کے سیاہ ترین باب کا احاطہ کر رہا تھا۔ اِس لرزہ خیز اور خون آشام داستان کے اوراق ابھی مزید الٹے جانے تھے۔

برّی، بحری اور فضائی حملے

1916ء بھی اپنے ساتھ جنگ کی تباہ کاریوں کا تحفہ لایا تھا۔ اِس سال بھی تمام تر محاذ اپنی پوری شدت اور تیزی کے ساتھ جاری رہے۔ بحری بالادستی کی کوششیں اپنے عروج پر رہیں اور نوآبادیات کی بندر بانٹ پر قتل وغارت گری کا بازار خوب گرم رہا۔

مغربی محاذ

مغربی محاذ کی مجموعی صورتِ حال گزشتہ سال سے مختلف نہیں رہی۔ فریقین ایک مسلسل صفِ اولین (فرنٹ لائن) کے آگے پیچھے سادہ پینڈولم کی طرح حرکت کرتے رہے۔ دورانِ سال قابلِ ذکر لڑائیوں میں ورڈن اور سوم کی لڑائیاں شامل ہیں۔

ورڈن کی لڑائی

جرمن چیف آف سٹاف جنرل فالکن ہائن مغربی محاذ پر فرانسیسیوں کے مورال کو گرانا چاہتا تھا۔ اِس کے لیے جنگ کو طول دینا اور فرانسیسی افواج کے مختلف محاذوں پر پسپا ہونے اور بعد ازاں جرمن افواج کو پسپا نہ کر سکنے کے باعث عوامی تاثر کو فوج کے خلاف کر دینے کی ضرورت تھی۔ مزید زیادہ سے زیادہ فرانسیسی افواج کو تہہ تیغ کرتے ہوئے عوام الناس کو فوج میں بھرتی ہونے سے خوف زدہ کرنا بھی اہم تھا۔

اِس طرح جہاں اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنے کے لیے پراپیگنڈا کیا جا رہا تھا۔ وہیں جذبہِ حب الوطنی سے سرشار لوگوں کو دورانِ جنگ ختم کر کے باقی ماندہ عوام جو وطن کی

نسبت اپنی ذات سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، کو چھوڑ دینے کی پالیسی پر عمل کیا جارہا تھا۔ کیونکہ وطن کی محبت رکھنے والے لوگ ملک کو خطرے میں دیکھ کر اسے بچانے اپنی افواج میں شامل ہوکر سرحدوں پر آجائیں گے جہاں جرمن افواج انہیں مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالیں گی۔

وہ لوگ جو ملک کو خطرے میں دیکھ کر بھی اپنی ذات کی حفاظت کے پیشِ نظر ملک کو بچانے فوج میں بھرتی نہیں ہوئے، انہیں مارنا یا نہ مارنا برابر ہے۔ لہٰذا اُنہیں چھوڑ ہی دیا جائے کیونکہ اُن سے کوئی خطرہ نہیں۔

اِس سوچ کے پیشِ نظر جنرل فالکن ہائن ورڈن کے مقام سے دشمن کی صفِ اولین پر جرمن شہزادے ولیم کو اُس کی پانچویں آرمی کے ساتھ حملہ آور ہونے کے لیے منصوبہ بنا رہا تھا۔ ورڈن میں فرانسیسی آرمی کی کمان جنرل پیٹین کے ذمے تھی۔ فرانس کی فوج کے رسد اور کمک کے لیے ایک ہی ریلوے لائن تھی جو جرمن افواج کی شدید گولہ باری کا نشانہ بنتی تھی اور آئے روز اُس کی مرمت کے کام کروانے پڑتے تھے۔

جرمن فوج بہادری، صلاحیت، جنگی مشق اور مہارت سے لڑ رہی تھیں۔ وہ دشمن کا بہت زوردار حملہ چند منٹ میں بالکل ہی رائیگاں کردیتی تھیں۔ کوئی کمپنی کمانڈر ریکی کے دوران دشمن کی غیر معمولی نقل وحرکت کا مشاہدہ کرتا تو فوراً بھاری توپ خانہ اور محفوظ دستے اِس مقام پر پہنچادیے جاتے۔ فوری کمک اور توپ خانے کا بہترین استعمال جرمن افواج کا طرۂ امتیاز تھا۔

دوسری طرف فرانس کی افواج بہادری اور بے جگری سے لڑ رہی تھیں تاہم اُن میں وہ جنگی مہارت و مشق نہ تھی۔ وہ فوری طور پر منظم ہوکر ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے کی صلاحیت سے یکسر بے بہرہ تھیں۔

ورڈن پیرس سے 200 کلومیٹر مشرق میں دریائے میوز کے کنارے فرانس کا بہترین قلعہ بندیوں پر مشتمل ایک ٹاؤن تھا۔ 21 فروری کو جرمن پانچویں آرمی نے فرانس کی افواج پر ورڈن کے مقام پر حملہ کردیا۔ اسی حملے کے سلسلے میں 22 فروری کو جرمن فوج کی ایک کمپنی نے ڈوامونٹ کا قلعہ فتح کرلیا۔ جبکہ فرانس کی افواج پسپا ہوکر اپنی دوسری خندقوں تک پیچھے ہٹ گئی۔

جرمن افواج کی جانب سے کیے گئے پے در پے حملوں کے باعث 24 فروری تک فرانس کی فوج تیسری خندقوں تک پسپا ہوگئی۔ یہاں سے ورڈن صرف آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر

تھا۔ 24 فروری کو جنرل ہینری فلپ پیٹین کو ورڈن کے محاذ کا انچارج بنایا گیا۔ جس نے آتے ہی مزید پسپا نہ ہونے کا حکم دیا۔ اور ہر محفوظ دستے کے سپاہی کو ورڈن میں جنگ کے لیے طلب کر لیا۔ فرانس کی 330 پیادہ رجمنٹس میں سے 259 رجمنٹس نے ورڈن کی جنگ میں حصہ لیا۔

ماہِ فروری کے اختتام پر جرمن پیش قدمی رک گئی۔ تاہم 6 مارچ کو جرمن پانچویں آرمی نے ایک اور حملہ کیا۔ اِس حملے میں جرمن فوج نے فرانس کی فوج کو 3 کلومیٹر تک مزید پیچھے دھکیل دیا۔ 29 مئی تک فرانس کی فوج نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن آخرکار مارٹ ہوم کی پہاڑی بھی جرمن فوج نے سر کر لی۔ 7 جون کو ووکس کا قلعہ بھی جرمن فوج کے قبضے میں آ گیا۔

سوم کے محاذ پر جرمنی افواج کی شدید ضرورت کے پیشِ نظر ورڈن کے محاذ پر حملوں کی تعداد اور قوت میں کمی واقع ہو گئی۔ تاہم موسمِ خزاں کے آخر تک حملے جاری رہے۔ اِس دوران تمام محاذوں پر جرمن افواج کو فرانس کی فوج سے سخت مزاحمت کا سامنا رہا۔

فرانس کی فوج نے جنرل چارلس مینجن کی قیادت میں جوابی حملوں کا آغاز کیا۔ جنرل چارلس مینجن کو فرانس کے ایک ہیرو کا درجہ اُس وقت حاصل ہو گیا جب موصوف نے 2 نومبر کو جرمن افواج سے ڈوامانٹ اور ووکس کے قلعے واپس چھین لیے۔ اگلے دو ہفتوں کے دوران فرانس کی فوج جرمنوں کو مزید دو (2) کلومیٹر پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئی۔

ورڈن کی لڑائی جنگِ عظیم اوّل کی سب سے لمبی لڑائی تھی۔ یہ 2 فروری سے 18 دسمبر تک جاری رہی۔ اِس میں فرانس کی آرمی کا نقصان 550000 رہا جبکہ جرمن فوج کا نقصان 430000 کے لگ بھگ تھا۔

سوم کی لڑائی

برطانوی اور فرانسیسی فوج کی متحدہ کارروائی کے طور پر سوم کے محاذ کو کھولنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ پہلے فرانس کی افواج کی اکثریت کو اِس لڑائی میں شامل کرنے کا پروگرام تھا۔ لیکن فروری میں ورڈن کی لڑائی چھڑ جانے کے باعث فرانس کی افواج کو اُس محاذ پر بھرپور توجہ دینا پڑی۔ اِس طرح زیادہ دباؤ برطانوی مہماتی فوج کے سر آ پڑا۔

فلینڈرز کے مقام پر برطانیہ کی مہماتی فوج کے کمانڈر جنرل ہیگ کی ناقص کارکردگی

کے باوجود ایک بار پھر اسے ایک لمبے آپریشن کی نگرانی اور قیادت کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ فرانس کے چیف آف سٹاف جنرل فرنز جوفر کا مقصد اِس حملے سے دشمن کی افرادی قوت کو کمزور کرنا اور اپنے علاقے دشمن سے واپس چھین لینا تھا۔

منصوبہ بندی اور دانشمندی کے لحاظ سے یہ محاذ بدرجہا ابتر تھا۔ کیونکہ سوم کا علاقہ فوجی نقل وحمل کے انتہائی غیر موزوں اور نامناسب تھا۔ جنرل ہیگ کے منصوبے کے مطابق پہلے آٹھ (8) دِن جرمن افواج پر بھرپور گولہ باری کر کے اُس کی دفاعی لائن توڑ دینے کے بعد ایک بھرپور حملہ کرنا تھا۔ اِس مقصد کے لیے وہ اپنے 27 ڈویژن (750000 فوج) میدان میں لایا تھا۔ جبکہ دوسری طرف جرمن فوج کے صرف 16 ڈویژن مدِ مقابل تھے۔

برطانوی شدید گولہ باری کے باوجود جرمن کنکریٹ کے بنے بینکرز کو معمولی نقصان ہوا۔ جبکہ برطانوی آفیسران کے خیال میں وہ دشمن کی کمر توڑ چکے تھے۔ انہوں نے یکم جولائی صبح 7:30 بجے پیادہ فوج کو عام حملے کا حکم دیا۔ جرمن فوج نے برطانوی فوج کا حملہ بری طرح ناکام کر دیا۔ لیکن برطانوی فوج کو اِس حملے کی بہت بڑی قیمت چکانا پڑی۔ اس ایک ہی دِن میں 58000 برطانوی فوجی مارے گئے۔

اِس طرح برطانوی تاریخ کا یہ سیاہ ترین دِن تھا۔ تاہم جنرل ہیگ نے حملوں کے سلسلے کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ 13 جولائی کو رات کے عمل میں برطانوی فوج کو جرمن فوج کی صف بندی میں شگاف ڈالنے کا موقع مل گیا۔ لیکن جرمن فوج کی بروقت کمک نے یہ خبر بھی عارضی ثابت کی اور فوراً ہی شگاف بھر دیا گیا اور برطانوی افواج کو پسپا ہونا پڑا۔

ایک عرصے تک برطانوی فوج فتح کی امید پر حملے کرتی رہی۔ جنرل ہیگ کے خیال میں جرمن فوج بار بار حملوں سے تھک ہار کر کمزور پڑ جانے پر برطانوی حملوں کے مقاصد پورے کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

اسی اثنا میں 29 اگست کو جنرل فالکن ہائنز کو اپنے عہدے سے برطرف کر کے جنرل ہنڈن برگ کو اُس کی جگہ نامزد کیا گیا جس کے ساتھ جنرل لیوڈنڈروف بھی مشرقی محاذ سے مغربی محاذ پر معائنے کے لیے آیا۔

15 ستمبر تک برطانوی افواج کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اب انہوں نے

ایک دس (10) میل لمبے محاذ پر عام حملے کا فیصلہ کیا۔ اِس حملے کی خاص بات یہ تھی کہ اِس میں مستقبل کے ہتھیار ٹینک کا استعمال پہلی بار کیا جا رہا تھا۔

دوسری طرف جنرل جوفرا اور فوش کو دسمبر 1916ء میں ریٹائر کر دیا گیا اور جنرل جوفر کی جگہ جنرل نیویل کو فرانسیسی افواج کی سپریم کمانڈر مقرر کیا گیا۔ موسم کی شدت کے باعث برطانوی حملوں میں کمی واقع ہو چکی تھی۔ تاہم 13 نومبر کو بیومونٹ ہامل کا قلعہ برطانوی افواج نے فتح کر لیا۔ شدید برف باری کے باعث برطانوی فوج کو پسپا ہونا پڑا اور جنرل ہیگ نے سوم کے محاذ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

سوم کے محاذ پر برطانیہ کے 420000 فوجی کام آئے۔ فرانس کے نقصانات کا تخمینہ 200000 جبکہ جرمن فوجی نقصانات 500000 کے لگ بھگ رہے۔ اتحادی افواج کو اِس لمبی لڑائی کے اختتام پر صرف ایک زمینی پٹی جس کی کسی ایک مقام پر زیادہ سے زیادہ لمبائی 12 کلومیٹر تھی حاصل ہوئی۔

مشرقی محاذ

گارلس۔ ٹارنو کی شکست کے بعد باقی ماندہ روسی فوج از سرِ نو منظم ہو رہی تھیں۔ زار نکولس دوم چاہتا تھا کہ گرمیوں میں ایک بھرپور حملہ کر کے جرمن افواج سے ولنا کا علاقہ واگزار کروالے۔ فرانس کی حکومت کی جانب سے اپیل کی گئی تھی کہ مغربی محاذ پر ورڈن کی لڑائی میں جرمنی کی افواج کی قوت کو کمزور کرنے کے لیے روسی افواج مشرقی محاذ پر حملہ آور ہوں۔

فرانس کی استدعا پر ایک بار پھر روسی افواج قبل از وقت اور تیاری میدانِ عمل میں کود پڑیں۔ مارچ میں روسی افواج نے جھیل نیروچ کے ساتھ جرمن افواج پر حملہ کر دیا۔ منتشر روسی فوج بدنظمی اور بدتدبیری کے باعث شدید حملہ نہ کر سکی۔ نتیجتاً جرمن افواج نے بڑی کامیابی اور آسانی سے حملے کو ناکام بنا دیا۔

مشرقی محاذ پر اب دونوں افواج آمدہ گرمیوں میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنانے لگیں۔ دریں اثنا کوئی بھی قابلِ ذکر جھڑپ نہ ہوئی۔ مئی میں آسٹریا۔ ہنگری نے اٹلی کے محاذ پر بھرپور حملہ کر دیا۔ اب روس سے اپیل کی باری اٹلی کی تھی۔ اٹلی چاہتا تھا کہ روسی افواج

آسٹریا۔ ہنگری پر حملہ آور ہو کر دشمن کی توجہ اپنی جانب مبذول کریں اور اٹلی کے محاذ سے فوجی قوت میں کمی واقع ہونے پر اٹلی اپنا دفاع کر سکے۔

روسی مغربی آرمی گروپ کے کمانڈر نے زار کے طے شدہ منصوبے کے مطابق گرمیوں میں حملے کے لیے عدم تیاری کے باعث معذرت کر لی۔ اِس پر روسی جنوب مغربی آرمی گروپ کے جنرل الیکسی بروسیلوف نے رضا کارانہ طور پر اکیلے اپنے فوج کے ہمراہ آسٹریا۔ ہنگری پر حملے کی حامی بھر لی اور 4 جون کو حملے کا آغاز کر دیا۔

بروسیلوف کا گرمیوں کا حملہ

روسی فوج کے اعلیٰ ترین آفیسروں میں ممتاز جنرل بروسیلوف نے جرمنی کے حملہ آور ہونے کی تکنیک کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بڑی عرق ریزی اور مہارت سے حملوں کا سلسلہ ترتیب دیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ بڑی فوج کے ایک جگہ حملے کی بجائے گشتی فوج کے مناسب دستے ترتیب دیتے ہوئے دشمن پر خاموشی سے حملہ آور ہوتے ہوئے شدید نقصان پہنچایا جائے۔

جنرل بروسیلوف کی یہ جنگی ترکیب بہت کارگر رہی اور روسی افواج کو جنگِ عظیم اوّل میں شکست کھانے کے بعد پہلی بار ایک عظیم فتح حاصل ہوئی۔ بغور مشاہدہ کرنے اور جائزہ لینے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ اتحادی افواج میں روس کے علاوہ تمام دیگر قوتیں روس کو صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی رہیں تھیں۔ اتحادیوں نے روسی دوستی کو زار کی بیوقوفی اور حماقت کے باعث قربانی کا بکرا بنا رکھا تھا۔

جنرل بروسیلوف کے اِس حملے کے بھی اصل فوائد بہر حال دیگر اتحادیوں کو ہوئے۔ مغربی محاذ پر ورڈن کی لڑائی سے 15 ڈویژن جرمن فوج اس محاذ پر منتقل کرنے سے فرانس نے چین کا سانس لیا۔ جبکہ اٹلی پر آسٹریا۔ ہنگری کا حملہ صرف اور صرف اسی حملے کی وجہ سے ناکام ہو گیا۔ لیکن اِن تمام قربانیوں کے باوجود روس کو اتحادیوں نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت نزدیک نہیں آنے دیا۔ روس کی اندرونی توڑ پھوڑ میں اتحادی ممالک نے جلتی پر تیل کا کام دیا۔

دریائے ڈینیسٹر اور سٹرایپا کی آسٹریائی فرنٹ لائن (صفِ اول) کو زوردار اور منظم روسی حملوں نے ایک ہفتے کے اندر ہی درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ روسی افواج آندھی اور طوفان کی

طرح آتیں اور آسٹریا۔ ہنگری کی متحیر افواج کو تہہ تیغ کر ڈالتیں۔ روسی افواج مزید پیش قدمی کرتی ہوئی لیوٹسک پر قابض ہو گئیں۔ اب کوویل کا ریل جنکشن اُن کے کامیاب حملوں کی زد میں تھا۔

جرمن چیف آف سٹاف کو تیزی سے آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا۔ جرمن افواج بروقت میدانِ جنگ میں پہنچ بھی گئیں اور انہوں نے جنرل بروسیلوف کے حملوں کو بہت حد تک سست بھی کر دیا مگر روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

روسی جنرل بروسیلوف کے جاندار حملوں اور بہترین حکمتِ عملی نے روسی افواج کو ایک بار پھر اپنے چھنے ہوئے علاقوں پر بہت حد تک قبضہ دلا دیا۔ روس میں امید کی ایک نئی کرن پھوٹ پڑی۔ لیکن ملک کی معاشی خستہ حالی اور انتظامی ابتری کے باعث افواج کو اسلحہ کی شدید قلت کا سامنا تھا۔ اِس لیے ابتدائی کامیابیوں کے بعد حملے سے دستبردار ہونا پڑا۔

جنرل بروسیلوف کے کامیاب حملے نے جرمنی کو تقریباً ہر میدان میں شکست سے دوچار کیا۔ اِس کا مغربی محاذ پر ورڈن کا حملہ اپنے متوقع نتائج کے حصول میں ناکام رہا۔ رومانیہ جنگ کی صورتِ حال کے پیشِ نظر اتحادی کی بہترین پوزیشن دیکھتے ہوئے مرکزی قوتوں کے خلاف میدانِ جنگ میں شریک ہو گیا۔ جبکہ آسٹریا۔ ہنگری جو اٹلی کو جنگ سے نکال باہر کرنے کے ارادے سے حملہ آور ہوا تھا، اپنا حملہ جاری نہ رکھ سکا۔

بروسیلوف کا حملہ دونوں فریقین کے لیے انتہائی مہنگا اور نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دونوں طرف دس دس لاکھ فوجی کام آئے۔ آسٹریا۔ ہنگری کی کمر اِسی حملے میں ٹوٹ گئی اور وہ اٹلی کے محاذ سے فوراً ہی دستبردار ہو گیا۔

اٹلی کا محاذ

ماہِ جنوری اور فروری میں اٹلی کو البانیہ میں سربیا کے مہاجرین کے لیے امدادی کارروائیوں نے بہت عاجز کر دیا تھا۔ اٹلی کی معیشت بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ جبکہ فوج میں بددلی کی کیفیت عام تھی۔ فرانس کے چیف آف سٹاف جنرل جوفر نے جرمنی کے ورڈن کے محاذ پر بھرپور حملوں کے باعث اٹلی کی حکومت کو استدعا کی کہ وہ دریائے ایسونزو پر حملہ آور ہو کر جرمن افواج کی ورڈن پر مضبوطی کو کم کریں تو جنرل کیڈورنا چیف آف سٹاف برائے اٹلی نے جلد بازی

سے ایک حملے کا منصوبہ بنایا۔

دریائے ایسونزو پر پانچویں لڑائی کا آغاز 9 مارچ سے ہوا جو 17 مارچ تک جاری رہا۔ حملہ گوریزیا کے شمال اور جنوب کی جانب سے کیا گیا تھا۔ موسم کی خراب صورتِ حال، دھند اور برسات نے حملہ آور افواج کو شدید مشکلات میں ڈال دیا۔ برف باری اور سخت سردی کے باعث پیش قدمی میں رکاوٹیں پیش آرہی تھیں اور سردی کی شدت سے فوجی بری طرح نڈھال ہو رہے تھے۔ اسی دوران جنرل کیڈورنا کو آسٹریا۔ ہنگری کے ٹرینٹینو کی جانب سے حملہ آور ہونے کے منصوبے کی اطلاع ملی۔ جس پر دریائے ایسونزو کی پانچویں لڑائی کا اختتام کرنا پڑا۔

آسٹریائی آسیاگو کا حملہ

مئی 1916ء میں آسٹریا۔ ہنگری کے چیف آف سٹاف جنرل کونریڈ کے دیرینہ منصوبے کے مطابق اٹلی پر ٹرینٹینو کی جانب سے ایک بھرپور حملہ کر کے شکست دی جائے۔ اُس کے خیال کے مطابق وقت آچکا تھا کہ اٹلی پر ایک بھرپور حملہ کیا جائے۔ اِس مقصد کے لیے جرمنی سے امداد کی استدعا کی گئی جو جنرل فالکن ہائنز نے مسترد کر دی۔ کیونکہ جنرل فالکن ہائنز جنرل کونریڈ کی نسبت جہاندیدہ اور پورے حالات پر نظر رکھنے والا تھا۔

جنرل کونریڈ کے منصوبے کے مطابق اسے ٹرینٹینو کے راستے اٹلی کے شمالی میدانوں پر قبضہ کرنا تھا اور پاڈوا کا سب سے اہم ریلوے اسٹیشن قبضے میں لے کر اٹلی کی ایسونزو اور کارنک کی افواج کو اپنے عقب سے کاٹ ڈالنا تھا۔ جرمنی کی جانب سے امداد نہ ملنے پر جنرل کونریڈ نے اپنی فوج کے ہمراہ ہی اِس حملے کا پروگرام ترتیب دیا۔

آسٹریا۔ ہنگری کے 14 ڈویژن اور 4 قیصر جیگر رجمنٹس جو جرمن کوہستانی فوج کے گزشتہ سال اکتوبر میں واپس چلے جانے پر متعین تھیں، کے ذریعے بڑے پیمانے پر حملے کا منصوبہ زیرِ عمل لانے کی تیاری کی گئی۔ جبکہ افرادی قوت کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں درمیانی اور بھاری توپ خانے کا اضافہ کیا گیا۔

اِس حملے کے آغاز پر اٹلی کی حکومت کو روسی حکومت سے مدد کی اپیل کرنا پڑی جبکہ روسی افواج جرمن افواج کی اعلیٰ جنگی صلاحیتوں کے ہاتھوں عاجز آچکی تھیں۔ تاہم جنرل الیکسی

بروسیلوف جو جنوب مغربی آرمی گروپ کی قیادت کر رہا تھا، نے آسٹریا۔ہنگری پر حملہ کرنے کی رضا کارانہ حامی بھر لی۔

15 مئی 1916ء کو شروع ہونے والے اس حملے میں ابتدائی طور پر جنرل کونریڈ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اٹلی کی پہلی آرمی کے جنرل رابرٹو بروسائی کو آسٹریائی حملے کے پیشِ نظر مناسب صف بندی کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر موصوف کے تاخیر کرنے کی وجہ سے آسٹریائی افواج نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اور بڑھتے ہوئے آرسیرو اور آسیاگو پر قبضہ کر لیا جو کہ شمالی میدانوں کے لیے دروازے کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

اِس مقام پر پہنچ کر آسٹریا۔ہنگری کی افواج کے حملوں کی شدت میں کمی آ گئی۔ کیونکہ ایک تو اٹلی کی افواج دریائے ایسونزو سے بروقت مدد کے لیے آ گئی تھیں۔ دوسرے جنرل براسیلوف کے شدید حملوں کے باعث مشرقی محاذ پر افواج کی منتقلی کا تقاضا شروع ہو چکا تھا۔ تیسرے دشوار گزار راستے اور علاقے نے پیش قدمی کو مشکل ترین بنا دیا تھا۔ چوتھے یہ کہ ایک بہت بڑے حملے کے لیے درکار فوجی قوت بھی آسٹریا۔ہنگری کے پاس نہ تھی۔

آخر کار 17 جون کو جنرل کونریڈ کو اٹلی کی جانب سے مسلسل بھرپور جوابی حملوں اور دیگر محاذوں پر دشوار ترین صورتِ حال کے پیشِ نظر لڑائی سے پہلے کی پوزیشن پر واپس آتے ہوئے حملے کو ختم کرنا پڑا۔ اِس جنگ میں ہر فریق کے جانی نقصانات کا تخمینہ ایک لاکھ افراد رہا۔

دریائے ایسونزو کی چھٹی سے نویں لڑائیاں

آسٹریا۔ہنگری کے آسیاگو کے حملے کی ناکامی کے فوراً بعد ہی جنرل کیڈورنا نے ایسونزو کے محاذ پر جوابی حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اٹلی کا افواج کو فوری طور پر دریائے ایسونزو پر آنے کے لیے بہترین ریلوے لائن اور سڑکیں میسر تھیں۔ جبکہ آسٹریا۔ہنگری کی ٹرینٹینو سے ایسونزو آنے والی فوج کو ایک لمبا اور دشوار راستہ اختیار کرتے ہوئے آنا پڑتا تھا۔

اس لیے جنرل کیڈورنا نے چھٹی دریائے ایسونزو کی لڑائی جسے گوریزیا کی لڑائی بھی کہتے ہیں، کا آغاز 6 اگست سے کیا۔ ابتدائی طور پر ہی اٹلی کو گوریزیا اور سین مائیکل کی پہاڑی پر قبضہ کرنے کا موقعہ مل گیا۔ اِس مقام سے اٹلی کی افواج کارسو کے شمالی علاقوں پر قبضہ کر لینے کے بعد

کارسو پر بھرپور حملہ کر سکتی تھیں۔ ایک شدید لڑائی کے بعد کارسو سے آسٹریا۔ہنگری کی افواج پسپا ہو گئیں۔

گوریزیا کی لڑائی میں اٹلی کی افواج آسٹریا۔ہنگری کی دفاعی لائن کو توڑتے ہوئے کئی میل اندر تک گھس آئی تھیں۔ جبکہ مزید اندر گھسنے اور آسٹریا۔ہنگری کی افواج کو قریب قریب شکست دینے کی نوبت بھی آسکتی تھی مگر اٹلی کی فوج میں محفوظ دستوں کی کمی اور آسٹریائی مزاحمت کے باعث مزید فتوحات کا سلسلہ جاری نہ رکھا جا سکا۔

یہ پہلی لڑائی تھی جس میں اٹلی کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ قبل ازیں و بعد ازیں اٹلی کی افواج کو اس سے زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اب اٹلی جنگی محاذ کے ساتھ ساتھ آسٹریا۔ہنگری کی دوہری سلطنت کو توڑنے کے لیے سیاسی تدبیریں بھی بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اٹلی کے احبابِ عقل و دانش کے لیے یہ ایک سنہری موقعہ تھا کہ وہ موجودہ صفِ اوّل سے صرف تیس میل دور واقع آڈری ایٹک شہر پر قبضہ کر کے آسٹریا۔ہنگری کے ٹریزٹ کے دیرینہ متنازعہ مسئلے کو ہوا دیتے ہوئے ہیپس برگ کی بادشاہت کا خاتمہ کر سکے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے بروقت، باتدبیر، پرجوش، توانائی سے بھرپور اور کم سے کم جانی نقصان والے متواتر اور شدید حملوں کی ضرورت تھی جو مکمل طور پر اپنے مقاصد کے ساتھ منسلک ہوں اور بے جا طوالت اختیار نہ کریں۔

لہٰذا اٹلی کی جانب سے 14 سے 17 ستمبر تک ساتویں دریائے ایسونزو کی لڑائی، 10 سے 12 اکتوبر تک آٹھویں اور یکم نومبر سے 4 نومبر تک نویں دریائے ایسونزو کی لڑائی لڑی گئیں۔ حالانکہ منصوبہ نہایت موزوں اور مناسب تھا مگر زمینی حقائق کسی قدر مختلف تھے۔ اٹلی کی فوج کے پاس مناسب تعداد میں توپ خانہ نہ ہونے کے باعث اصل مقاصد حاصل نہ ہو سکے۔ پھر بھی اٹلی کی افواج کو خاطر خواہ علاقہ حاصل ہو گیا۔

1916ء کے موسمِ خزاں اور سردیوں میں اٹلی کی افواج کی از سرِ نو منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کے تحت 16 نئے ڈویژن میدان میں لائے گئے۔ اور مدد کے لیے 6 محفوظ فوج کے ڈویژن بھی تشکیل دیے گئے۔ درمیانی درجے کا توپ خانہ دوگنا کر دیا گیا۔ جبکہ بھاری توپ

خانے کو چار گنا بڑھا دیا گیا۔

جنگ کے آغاز پر اٹلی کی فوج کے پاس موجود مشین گنوں کی تعداد صرف 600 تھی۔ جسے بڑھا کر 8200 کر دیا گیا۔ گولہ بارود اور بم وغیرہ کی پیداوار کو کئی گنا زیادہ بڑھا دیا گیا۔ اٹلی کی فضائیہ کے لڑاکا طیاروں کی تعدا آغازِ جنگ پر صرف 382 تھی۔ جس میں بہت زیادہ اضافہ کرتے ہوئے 3860 کر دی گئی۔ اِن طیاروں کی رفتار، گولہ بارود لے جانے کی صلاحیت اور نشانہ بنانے کی صلاحیت میں بہت اضافہ ہوا۔ اِن وجوہات کی بنا پر کیڈورنا 1917ء میں آسٹریا۔ ہنگری پر حملے کرنے کے لیے پُر اعتماد تھا۔

بلکان کے محاذ

دورانِ سال بلکان کے محاذ کی اہم پیش رفت رومانیہ کا اتحادی افواج کے حق میں مرکزی ممالک کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑنا تھا۔ رومانہ اپنے تیل اور زرعی ذخائر کے باعث ہر دو فریقین کے لیے انتہائی ضروری اور بہترین ساتھی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ فریقین اسے اپنے ساتھ ملانے کے لیے طرح طرح کی پیش کشیں کر رہے تھے۔

اِن پیش کشوں میں زیادہ پُر کشش اتحادی ممالک کی پیش کشیں تھیں کیونکہ رومانیہ کے مطلوبہ علاقے بلغاریہ اور آسٹریا۔ ہنگری کے زیرِ کنٹرول تھے جو مرکزی ممالک کے حلیف تھے۔ رومانیہ کی علاقائی وسعت کی خواہش نے اسے غیر جانبدار نہ رہنے دیا کیونکہ اُس کی نظر بوکووینیا، ٹیمیسور، مرموِرس، کری سانا اور ٹرینسلوانیا پر تھی جو جرمنی کے حلیف ممالک کے علاقے تھے۔

1916ء کے وسط میں رومانیہ کے لیے صورتِ حال بہت زیادہ پُر کشش ہو گئی جب جرمن افواج ورڈن میں بری طرح مصروف تھیں، سوم میں اتحادی افواج کے شدید حملے جاری تھے۔ اٹلی کی افواج نے آسٹریا۔ ہنگری کو بری طرح الجھا رکھا تھا۔ جنرل بروسیلوف کا کامیاب حملہ جاری تھا۔ اور سیلونیکا کی جانب سے اتحادی افواج بلغاریہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔

اس طرح اِن حالات میں مرکزی ممالک کی صورتِ حال نازک اور اتحادی ممالک کی کامیابی واضح تھی۔ اِس موقعے پر جنگ میں شریک ہو کر بلغاریہ جس پر سیلونیکا کی جانب سے شمال میں حملہ ہو رہا تھا، جنوب سے حملہ کر دینے سے بلغاریہ پر قبضہ کرنے اور بعد ازاں بغداد

ریلوے کو منقطع کر کے ترکی اور جرمنی کا زمینی راستہ ختم کرنے سے مرکزی قوتوں کو بھرپور شکست دی جاسکتی تھی۔

مگر رومانیہ نے مزید دو (2) ماہ اپنے عوضانے میں اضافے کی گفتگو میں صرف کرنے کے بعد اخر کار 27 اگست کو جنگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اِس وقت تک مرکزی قوتوں کی صورتِ حال پہلے سی نہ رہی تھی اور اُن کے پاس رومانیہ کی افواج کو کچلنے کے لیے وافر فوج موجود تھی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جرمنی کے حکام رومانیہ کی سیاسی اور خارجی صورتِ حال کا بغور جائزہ لے رہے تھے اور انہیں رومانیہ کے اُن کے مخالف میدانِ جنگ میں کودنے کا یقین تھا۔

لہٰذا جرمنی نے رومانیہ کے میدانِ جنگ میں کود جانے کے خدشے کے پیشِ نظر مناسب پیش بندی کر رکھی تھی۔ جنرل میکنسن جو بلغاریہ کے محاذ کا کمانڈر تھا، کو وجود جرمن، بلغاریہ اور ترکی کے دستوں سے ایک نئی آرمی بنانے کی ہدایت کی گئی تھی۔

رومانیہ کے حملے اور پسپائی

اتحادی افواج کی پرزور اپیل پر سیلونیکا کے محاذ میں اُن کا ساتھ دینے کی بجائے رومانیہ نے ٹرانسلوانیا کے واپس حصول کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے 560000 فوجیوں پر مشتمل 4 آرمیوں اور ایک معمولی محفوظ فوج کے ساتھ حملہ کر دیا۔ پہلی، دوسری اور چوتھی آرمی کو پہاڑیوں کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے ٹرانسلوانیا پر حملہ آور ہونا تھا جبکہ تیسری آرمی نے بلغاریہ کی سرحد کی حفاظت کرنا تھی۔

رومانیہ کی فوج کے پاس رائفل، مشین گن، توپ خانہ اور سگنل کے آلات کی شدید قلت تھی۔ کوئی باقاعدہ منصوبہ نہ تھا اور نہ ہی کوئی تجربہ کار قیادت تھی۔ اپنے اسلحے اور فوجی ضروریات کے کارخانے نہ تھے۔ صرف اور صرف اتحادیوں 300 ٹن روزانہ کی سپلائی کے وعدے پر رومانیہ نے صرف 6 ہفتوں کی سپلائی کی موجودگی میں 28 اگست کو حملہ کر دیا۔

جرمن حکام کے اندازے کے مطابق 30 ستمبر تک رومانیہ کی افواج کا حملہ متوقع تھا۔ جبکہ رومانیہ نے ایک ماہ قبل ہی حملہ کر دیا تھا جو ٹرانسلوانیا میں برسرِ پیکار جرمن نویں اور آسٹرین پہلی آرمی کے لیے چونکا دینے والا تھا۔ رومانیہ کی فوج کی رفتا آہستہ مگر مسلسل تھی۔ راستے کی سڑکوں کی

خستہ حالی اور تباہ شدہ پلوں کے باعث فوج کو صرف پہاڑی دروں میں سے ہو کر گزرنا تھا۔ چند ایک درے 40 میل لمبے تھے۔ اس طرح رومانیہ کی حملہ آور فوج کو بیشتر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر پہاڑی علاقے سے گزرنا تھا۔ اس طرح بٹی ہوئی فوج کا علاقہ 200 میل تک پھیل گیا۔ آپس میں رابطے کا کوئی مؤثر نظام نہ تھا۔ اور 200 میل لمبے فرنٹ کے باعث حملے میں قوت کا عنصر غائب ہو چکا تھا۔

جرمن افواج بھی وسط ستمبر تک اپنی پوزیشن سنبھال چکی تھیں اور اُن کی جانب سے مزاحمت میں شدت آنے لگی تھی۔ یکم ستمبر کو جنرل میکنسن نے رومانیہ کی سرحد پار کر کے کانسٹانٹا کے شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ شہر رومانیہ، روس اور دیگر اتحادی افواج کے لیے انتہائی اہم تھا کیونکہ یہاں رومانیہ کی واحد بندرگاہ تھی جو بحیرہ اسود کے ذریعے رومانیہ کو اتحادی ممالک سے ملاتی تھی۔

اس شہر کو بچانے کے لیے رومانیہ کی تیسری آرمی کے علاوہ تین (3) روسی، تین (3) ٹرانسلوانیا سے واپس طلبیدہ اور ایک (1) سربیا کا رضا کار ڈویژن فوری طور پر دوڑے ہوئے آئے اور روسی کمانڈر کی قیادت میں متحد ہو گئے۔ اس فوج نے عارضی طور پر جنرل میکنسن کو روک دیا جو سڑکوں کی قلت کے باعث پیش قدمی میں دشواری کا شکار تھا۔

20 اکتوبر کو ترکی کی دو (2) ڈویژن فوج کی آمد پر جنرل میکنسن نے دوبارہ حملہ کیا۔ اسلحہ اور فوجی سامان کی ترسیل میں کمی کے باعث دفاعی افواج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ 23 اکتوبر کو جرمن افواج نے کانسٹانٹا پر قبضہ کر لیا اور تمام ریلوے اور سڑکیں حاصل کر لیں۔ جنرل میکنسن مزید آگے سویشٹوف کی جانب بڑھا۔ جہاں سے وہ فالکن ہائنز کی رومانیہ میں پیش قدمی کے ساتھ شامل ہو سکتا تھا۔

اس دوران جنرل فالکن ہائنز نے رومانیہ کے حملے کو روک کر جوابی کارروائی سے رومانیہ کی فوج کو پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اب وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر ایک زبردست حملہ کرنا چاہتا تھا تاکہ موسمِ سرما کی شدت سے قبل وہ رومانیہ کی افواج کو شکست دے دے۔ 10 نومبر کو اُس نے رومانیہ کی فوج پر بھرپور حملہ کیا۔ رومانیہ کو اتحادیوں کی جانب سے 300 ٹن روزانہ کی بجائے صرف 30 ٹن سپلائی موصول ہو سکی تھی۔ 23 نومبر کو جنرل میکنسن نے جنوب سے حملہ کر دیا۔

اسلحہ، تجربہ اور راہنمائی کے فقدان کے باعث رومانیہ کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔ رومانیہ کی افواج نے جنرل میکنسن کو جنرل فالکن ہائنز کے ساتھ شامل ہونے سے روکنے کے لیے دو حملے کیے۔ پہلا حملہ ماہِ اکتوبر کے آغاز میں کیا گیا جو سیلاب کے باعث ناکام ہو گیا۔ جبکہ دوسرا حملہ دسمبر کے آغاز میں کیا گیا جس میں ابتدائی طور پر کامیابی حاصل ہوئی تاہم بعد ازاں رومانیہ کی افواج کو پسپا ہونا پڑا۔

جنوری 1917ء کو رومانیہ کی آرمی کی تعداد صرف 150000 رہ گئی تھی اور وہ مشرقی رومانیہ میں دریائے سیرت کے دوسری جانب صرف اِس وجہ سے کسی قدر محفوظ تھے کہ اِس علاقے میں سڑکوں کا ناقص نظام اور برسات کا شدید سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اب رومانیہ کے تیل اور زرعی ذخائر مرکزی قوتوں کے ہاتھوں میں تھے۔

یونان اور سیلونیکا کے محاذ

یونان پر اتحادی ممالک اپنا دباؤ بڑھا رہے تھے کہ وہ اپنے 1913ء کے معاہدے کے تحت سربیا کی مدد کرے۔ اِس معاہدے کی رو سے سربیا کو 150000 فوجی بلغاریہ کے محاذ پر لڑنے کے لیے یونان کو فراہم کرنے تھے۔ یونان کے وزیرِ اعظم نے سربیا کی جانب سے 150000 فوجیوں کی عدم فراہمی کے باعث جنگ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔

اتحادی افواج نے یونان کو جنگ میں شامل کرنے کے لیے وعدہ کیا کہ وہ 150000 فوجی یونان کی مدد کے لیے روانہ کریں گے۔ اِس سلسلہ میں آنے والے فوج کی تعداد صرف 40000 تھی جو 3 اکتوبر 1915ء سے سیلونیکا کے مقام پر بحری جہازوں سے خشکی پر اترنا شروع ہوئے۔ لیکن اِن کی تعداد کی کمی کے باعث یونان میدانِ کارزار میں اترنے سے باز رہا۔

یونان کے سابق وزیرِ اعظم ساریل کو سربیا کی طرف داری کی وجہ سے یونان کی وزارتِ عظمیٰ سے دستبردار ہونا پڑا تھا۔ موصوف نے وزارتِ عظمیٰ سے علیحدگی پر بغاوت کر دی اور جولائی 1916ء تک اُس کے پاس سیلونیکا کے مقام پر 250000 سپاہی اکٹھے ہو چکے تھے۔ اِن میں اتحادی دستے اور سربیا کی منتشر فوج جو کرفو سے واپس آ چکی تھی، شامل تھی۔

ساریل کو اپنے اختیارات کے استعمال میں سخت دشواری کا سامنا تھا۔ عموماً ہر ملک اپنی

اپنی فوج کو بلاواسطہ طور پر پیغام رسانی کے ذریعے احکامات دے دیتا۔ تاہم ساریل اِن مشکل حالات میں بھی اتحادی افواج کا ہمدرد اور خیر خواہ رہا۔ اُس نے رومانیہ کے جنگ میں شامل ہونے پر اُس کی مدد کے لیے بلغاریہ پر ایک حملے کا پروگرام بنایا۔ اس وقت اُس کے پاس 350000 سپاہ موجود تھیں۔ یہ فوج ''آرمیز الائیز این اوریئنٹ'' کے نام سے موسوم تھی۔

10 ستمبر کو ساریل نے سرب اکثریتی بائیں بازو کی فوج کے ذریعے بلغاریہ پر حملہ کیا۔ اِس دوران اُس کی دائیں بازو کی فوج دفاعی پوزیشن میں رہی۔ بلغاریہ پر حملے میں بائیں بازو کی فوج کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور وہ بیٹولج (موناسٹر) پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہی۔ تاہم دائیں بازو کی فوج کو بلغاریہ کی فوج سے پسپا ہونا پڑا۔ اور ساریل کو اتحادیوں کی جانب سے عدمِ کمک اور اپنے لٹے پھٹے فوجیوں کے باعث بلغاریہ پر فتح حاصل کرنے میں ناکامی رہی۔

اسی دوران یونان میں جرمنی کی طرف جھکاؤ رکھنے والے بادشاہ کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ یہ بغاوت اتحادی ممالک کی بھرپور کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ اتحادیوں کے کٹھ پتلی وینی زیلو نے کریٹ کے مقام پر نئی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اب سیلونیکا پر بظاہر ساریل کی حکومت تھی مگر درحقیقت وہ بھی اتحادیوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن چکا تھا۔ تمام سڑکیں، ریلوے، بحری بیڑہ اور پائیریوس کی بندرگاہ اتحادیوں کے قبضے میں تھیں جنھوں نے اپنے اخبار کے ذریعے عوام الناس میں زبردست پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا۔

ترکی کے محاذ

دسمبر 1914ء میں برطانوی حکام نے مصر کے بادشاہ عباس دوم حِلمی کو برطرف کر کے اُس کے چچا حسین کامل کو کٹھ پتلی سلطان بنا دیا۔ اِس طرح برطانیہ نے مصر میں سیاسی اور دیگر کارروائیوں کی خود ساختہ اجازت حاصل کر لی تھی۔ سلطان حسین کامل کو مزید خوش کرنے اور اپنی نمک خواری پر آمادہ رکھنے کے لیے برطانوی حکام نے اُس پر مزید کرم نوازی یہ کی کہ اُسے بادشاہ کے خطاب سے مشرف کر دیا۔

برطانوی حکام اپنی پرانی سازشی، مکروہ اور شاطرانہ روش کے مطابق اپنی ہر نوآبادیات میں ملک دشمن عناصر کی تلاش میں رہتے تھے۔ جنھیں چاپلوسی اور لالچ کے جال میں پھنسا کر ملک و

ملت سے غداری کے ارتکاب پر راضی کیا جا سکے۔ ایسے اشخاص اپنے آقاؤں کے اشاروں پر ناچتے ہوئے اُن کی توقع سے ہمیشہ کچھ زیادہ کر دکھانے کے درپے رہتے رہے ہیں۔ اسی طرح کی ایک شخصیت حسین کامل کی بھی تھی۔ جس کے روبہ اقتدار آتے ہی برطانوی حکام کو نہ صرف نہر سویز پر بلکہ پورے مصر پر مکمل دسترس حاصل ہو گئی تھی۔

ترکی کی 20000 فوج ایک قابل جرمن جرنل بارون فریڈرک کریس وان کریسنسٹین کی قیادت میں نہر سویز پر حملہ کرنے کے لیے فروری 1915ء کو روانہ ہوئی۔ اِس فوج نے تحمّل کے راستے جزیرہ نمائے سِنائی سے اپنی بھرپور ترکی روایت کے مطابق گزرتے ہوئے گہرے پانی سے نہر کو پار کیا۔ جہاں برطانوی اور فرانسیسی بحری بیڑے نے ایک شدید حملے کے ذریعے ترک فوج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

گیلی پولی کے محاذ پر اتحادی افواج کی شکست نے مصر کی سالمیت اور نہر سویز کے برطانوی قبضے پر سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔ اِس لیے نہر کی حفاظت کے لیے مضبوط دیوار کی تعمیر اور 14 ڈویژن فوج جس میں گیلی پولی سے واپس بلائے گئے برطانوی اور فرانسیسی دستے بھی شامل تھے، ترتیب دی گئی۔ یہ فوج بہت تیز رفتاری سے مصر میں پھیلنے لگی۔ اور وسطِ سال میں 10 ڈویژن فوج نے آدھے مصر میں پھیل چکی تھی۔

دریائے نیل سے بننے والی تکون میں احمد الشریف جو سینوسی کے مضبوط گروہ کا سردار تھا، برطانوی افواج کے لیے سخت رکاوٹ بن رہا تھا۔ جنرل میکس ویل کو احمد الشریف کے ترک جرنیل جعفر پاشا کے اچانک اور بھرپور حملوں نے سخت عاجز کر دیا تھا۔ 1915ء کے کرسمس کے موقعہ پر وادیِ مجید کی لڑائی ہوئی جس میں جعفر پاشا 2500 افراد کو برطانوی افواج کے مقابلے میں لے آیا۔

23 جنوری 1916ء کو ہونے والی حلازن کی لڑائی میں جعفر پاشا نے برطانیہ کی جدید اسلحہ سے لیس فوج کو شدید نقصان پہنچایا اور اپنے محدود ذرائع سے دشمن کے 300 فوجیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ تاہم 26 فروری کو ایک حملے میں جعفر پاشا شدید زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ جس کے بغیر سینوسی کا محاذ مکمل طور پر خاموش ہو گیا۔

اتحادی افواج کی سِنائی میں پیش قدمی

1916ء کے آغاز پر برطانوی حکام نے فلسطین کے محاذ پر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پیش قدمی کا مقصد فلسطین کے مقام پر یورپ بھر کے یہودیوں کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کے بعد تمام عرب دنیا کے مسلمانوں پر بالعموم اور پوری دنیا کے مسلمانوں پر بالخصوص اپنی گرفت مضبوط کرنا تھا۔

اسرائیل کے قیام سے برطانیہ اور دیگر اتحادی ممالک اپنی من مانی کرنے کے لیے ایک ایسا ملک عرب دنیا اور خصوصاً مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقدس شہروں کے قریب قائم کرنا چاہتے تھے جو اُن کے مفادات کو بطریقِ احسن عملی جامہ پہناتے ہوئے اُن کی منافقانہ ساکھ کو بھی متاثر نہ کرے اور وہ مسلم دنیا سے اپنے مفادات بھرپور انداز سے حاصل بھی کرتے رہیں اور انہیں بے وقوف بھی بناتے رہیں۔

اسی ملک کے کندھوں پر رکھ کر اتحادی ممالک مسلم امہ پر اپنی بندوق کے فائر کرتے رہیں۔ اپنی نوآبادیات میں پہلے ہی وہ مسلمانوں کے گروہوں میں سے ایمان فروش افراد کو تلاش کر رہے تھے۔ اب مسلمانوں کے علاقوں میں یہودیوں کو بٹھا کر رہی سہی کسر بھی پوری کرنے کے مذموم عزائم رکھتے تھے۔

جنرل مرے کی قیادت میں اتحادی افواج فلسطین کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھیں۔ ابتدائی طور پر وہ ریلوے لائن اور پانی کی پائپ لائن کے ہمراہ سست رفتاری سے پیش قدمی کر رہے تھے۔ ماہ اپریل میں انہیں پہلی بار ترک افواج کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جب جنرل کریسنٹین نے 3500 افراد کی جمعیت کے ساتھ اچانک حملہ کر دیا۔ یہ اچانک حملہ بالکل اچانک ہی مار دھاڑ کر کے ابتدائی مڈھ بھیڑ کے بعد صحرا میں غائب ہو گیا۔

ماہ مئی کے اواخر میں جنرل مرے نے الرومانیہ کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ اب پانی کی سپلائی ٹرکوں اور اونٹوں کے کاروانوں کے ذریعے بہم پہنچائی جا رہی تھی۔ ماہ جولائی کے اواخر تک صورتِ حال مختلف ہو چکی تھی اور اتحادی فوج کو اپنے اردگرد جرمن اور ترک فوج کے 16000 سپاہیوں کی موجودگی کی اطلاعات نے سخت تردد اور پریشانی میں مبتلا کر دیا۔

تاہم جنرل مرے ایک سمجھدار اور کائیاں سٹاف آفیسر کی حیثیت سے دفاعی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہا تھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ ترک فوج اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد والے دشمن سے براہِ راست لڑائی کرنے کی بجائے سمندر کی جانب سے حملہ آور ہو کر پانی کی سپلائی کو ختم کرنے کی کوشش کرے گی۔

ایسی صورت میں دشمن کو دھوکہ دینے کے لیے جنرل مرے نے اپنی دو (2) ڈویژن فوج کو چار میل لمبے علاقے میں پیش قدمی کرنے کی ہدایت کی۔ اس فوج کے پیچھے ایک مضبوط محفوظ فوج تعینات کی۔ پیش قدمی کرنے والی فوج کے ذمے ترک افواج کو اُس وقت تک روکے رکھنا تھا جب تک کہ بقیہ فوج انہیں اپنے گھیرے میں نہ لے لیتی۔

اپنے منصوبے کے عین مطابق جنرل مرے نے ترک فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ اب ترک فوج کے عقب کے سپاہیوں نے بے جگری سے لڑنا شروع کیا مگر پانی کی شدید قلت کے باعث پیاس سے سخت نڈھال فوج نے ہتھیار ڈالنے شروع کر دیے۔ اِس طرح ترک حملہ بری طرح ناکام ہو گیا اور ترکوں کو 2000 فوجیوں کا جانی نقصان جبکہ 4000 کے قیدی بنائے جانے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ جبکہ برطانیہ کا نقصان صرف 1130 رہا۔

کٹ کا محاصرہ

1915ء کے برطانوی افواج کے حملے کے دوران جنرل نکس کی قیادت میں بغداد پر ایک ناکام حملے کے بعد واپسی پر ٹاؤن شینڈ کی فوج کٹ کے مقام پر رک گئی تھی۔ اب ترک افواج کٹ کو محاصرے میں لیے مقابلہ کر رہی تھیں۔ ٹاؤن شینڈ نے کٹ کے شمال مغرب کی جانب کھلے رستے پر بھرپور قلعہ بندی کر لی تھی اور تین (3) خندقیں کھود رکھی تھیں۔

ٹاؤن شینڈ کی فوج کی مدد کے لیے پہلی کوشش جنوری 1916ء میں جنرل فیفٹنن جان ایلمر نے کی۔ اُس کی افواج کا ترک افواج سے مقابلہ شیخ السعد کی لڑائی میں ہوا۔ اِس لڑائی میں جنرل ایلمر کی مددگار فوج کو 6000 جانوں کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اِس قدر بڑے نقصان پر آخرکار جنرل ایلمر کو پسپا ہونا پڑا۔

جنرل ایلمر نے مارچ میں ایک اور حملہ کیا مگر اس بار وہ شدید ترک مزاحمت کے باعث

دُوجیلہ قلعے کا اندرونی حصے تک جانے میں ناکام رہا۔ ترک افواج نے نہایت جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ اور جنرل ایلمر کو 3500 افراد کے نقصان کے باعث پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس وقت محصور ٹاؤن شینڈ کو اپنے فوجیوں کی جانیں بچانے کے لیے خوراک کے حصول کے لیے 1100 گھوڑوں اور خچروں کو مارنا پڑا۔

جنرل ایلمر کی جگہ اپریل گورنج کو برطانوی افواج کی قیادت سونپ پر کٹ میں محصورین کو چھڑانے کی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ گورنج نے کٹ کے دائیں طرف بیتِ اسد پر ایک کاری ضرب کے ذریعے ترک افواج کے محاصرے میں شگاف پیدا کر دیا۔ تاہم ترک افواج نے بائیں جانب سے بھرپور جوابی حملہ کر کے کٹ کی قلعہ بندی میں موجود ایک شگاف سے اندر داخل ہو کر مورچے سنبھال لیے۔

22 اپریل کو گورنج نے ایک اور کوشش کی مگر ترک فوج کے جوابی حملے نے اسے واپس اپنی پہلی جگہ پر دھکیل دیا۔ اب گورنج کی امدادی فوج کی حملہ آور صلاحیتیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ جبکہ محصورین بھوک سے سخت نڈھال ہو چکے تھے۔ گورنج کی رپورٹ پر لارڈ کچنر نے اجازت دے دی کہ وہ ترک افواج سے ہتھیار ڈالنے کی بابت گفتگو کا آغاز کرے۔

آخرکار 29 اپریل کو برطانوی افواج نے ترک افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور کٹ ترکوں کے حوالے کر دیا۔ برطانوی حکام نے میسوپوٹامیا کے محاذ پر اپنی افواج کی شکست اور ہلاکت پر سختی سے نوٹس لیتے ہوئے چھ (6) ماہ قبل وہاں بھیجے گئے کمانڈر جنرل پرسی لیک کو ہٹا کر اُس کی جگہ جنرل فریڈرک سٹینلے موؤد کو بھیج دیا۔ جنرل موؤد کے پاس 340000 فوج تھی جس میں سے 107000 ہندوستانی فوج تھی۔

جبکہ اس کے مدِ مقابل ترکی کی فوج صرف 42000 تھی جس میں سے نصف بغداد کی حفاظت کے لیے مختص تھی۔ اس ترک فوج میں بیماروں اور زخمیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی۔ اور کمک کی صورت میں بھی اِس قدر فوج نہ آتی تھی جس قدر جانی نقصانات محاذ پر پیش آ رہے تھے۔ تاہم وہ پورے جوش و جذبے سے لڑ رہے تھے اور ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ جنرل موؤد نے میسوپوٹامیا میں شمال کی جانب پیش قدمی کا آغاز 13 دسمبر کو کیا۔ تاہم سال کے اخر تک کوئی قابلِ ذکر لڑائی نہ ہوئی۔

کاکیشیاء میں کارروائیاں

گیلی پولی کے محاذ میں کامیابی کے بعد ترک افواج کا کاکیشیاء میں موجود رہنا روسی جرنیل کے لیے سخت تشویش ناک تھا۔ اُسے توقع تھی کہ ترک فوج کا بیشتر حصہ شام اور میسوپوٹامیا کے محاذوں پر منتقل کردیا جائے گا جبکہ کچھ حصہ یورپ میں بھجوادیا جائے گا۔

سابقہ روسی چیف آف سٹاف گرینڈ ڈیوک نیکولاس اب ٹرانس کاکیشیا کے وائسرائے کی حیثیت سے ایک معمولی کردار ادا کررہا تھا۔ اس کے ماتحت جنرل یوڈنیچ نے گیلی پولی کے محاذ کا بغور جائزہ لیا اور اندازہ لگایا کہ ترک افواج مارچ کے آخر تک کسی طور بھی حملہ آور ہونے کی پوزیشن میں نہیں آسکتیں۔ اُس نے فوری طور پر ترک حملے سے قبل روسی حملے کا پروگرام ترتیب دیا۔

جنرل یورڈنیچ نے اپنی فوج کو سمور کی ٹوپی، موٹے کپڑے کی شرٹ اور نمدے کے بوٹ پہنا کر کوپروکوئے پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ روسی افواج نے 17 جنوری کی دوپہر ترک افواج کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کرتے ہوئے شدید جانی نقصان پہنچایا۔ ترک جنرل عبدالکریم کو ہر ممکن تیز رفتاری سے پسپا ہونا پڑا۔ اِس پسپائی میں سردی اور روسی گولہ باری سے ہلاک ہونے والے فوجیوں کی تعداد تقریباً 25000 تھی۔

جنرل یورڈنیچ نے فروری 12 کو انتہائی جرأت سے ارزورم پر حملہ کیا اور 16 فروری کو بغیر توپ خانے اور محاصرے کے جنگی کرتب کی طرح ارزورم پر قبضہ کرلیا۔ اسی دوران اُس نے جنرل لائے خوف کو جنوب کی جانب سمندر کے کنارے بحیرہ اسود کے بیڑے کے ساتھ ایک مشترکہ محاذ کے لیے روانہ کیا۔ اِس حملے کا مقصد ٹریبیزونڈ پر قبضہ کرنا تھا۔

دوسری طرف ترکی کے وزیرِ جنگ انور پاشا نے بحیرہ اسود کے جنوب میں کھلے محاذ پر روسی افواج کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کے لیے گیلی پولی کے محاذ سے فارغ ہونے والی فوج کو بھرپور انداز سے حملہ کرنے کا منصوبہ دیا۔ ماہِ مئی کے آخر میں ترک تیسری آرمی نے اپنی کمک کا انتظار کیے بغیر ہی ارزورم پر حملہ کردیا۔ لیکن روسی افواج کی بھرپور جوابی کارروائی سے یہ حملہ بری طرح ناکام ہوگیا۔ اب انور پاشا نے جون میں ٹریبیزونڈ کو واپس ترک فوج کے قبضے میں لینے کے لیے حملے کا اعلان کیا۔ مگر ایک بار پھر ترک افواج کو شدید نقصان پہنچا۔

جنرل یوڈنچ اس دوران اپنے بھرپور حملے کی تیاری کر چکا تھا۔ اُس نے 2 جولائی کو بے برٹ پر حملہ کر دیا جو ٹربی زونڈ کے جنوب اور جنوب مشرق میں ارزورم اور ارزن کین کے راستوں کے اغاز پر واقع ہے۔ شدید حملے نے ترک فوج کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور 25 جولائی کو ارزن کین پر قبضہ کر لیا۔ ترک تیسری آرمی کو شدید نقصانات اٹھانا پڑے اور وہ عملی طور پر بالکل تباہ ہو گئی۔ اِس کے 17000 فوجی مارے گئے اور تقریباً اسی قدر قیدی بنا لیے گئے۔

ترکی کی دائیں بازو کی فوج میں دوسری آرمی تھی۔ جس نے اپنی مکمل تیاری سے قبل کوئی حملہ نہ کیا۔ اس آرمی کے ایک کور کمانڈر جنرل مصطفیٰ کمال پاشا نے موس اور بیٹلس کے علاقے 15 اگست کو فتح کر لیے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی گیلی پولی اور اِس محاذ کی فتح نے ثابت کر دیا کہ ایک اچھے کمانڈر کی قیادت میں ترک فوج انتہائی اعلیٰ جنگی مہارت اور جوانمردی سے لڑتے ہوئے دشمن کو شکست سے دوچار کر سکتی تھی اگر اِس کی منصوبہ سازی اور قیادتِ اعلیٰ انور پاشا کی نسبت کسی قدر قابل شخص کے ہاتھ میں ہوتی۔ جنرل یوڈنچ نے دوبارہ موس اور بیٹلس پر 24 اگست کو قبضہ کر لیا۔

عرب انقلاب اور فلسطین کا محاذ

5 جون 1916ء کو ترک حکومت کے گورنر حجاز شریف حسین نے برطانوی سازباز کے نتیجے میں ترک حکومت سے بغاوت کر دی اور تین (3) دِن مکہ معظمہ کی گلیوں میں خونریزی کے بعد مکہ معظمہ پر 10 جون کو قبضہ کر لیا۔ اب شریف حسین نے طائف کی طرف توجہ دی جہاں حسب روایت حجاز کی فوج موجود تھی۔ برطانوی ایما پر کٹھ پتلی مصری بادشاہ نے شریف حسین کی مدد کے لیے فوج روانہ کی۔ اِس ساری فوج کی قیادت شریف حسین کا دوسرا بیٹا عبداللہ کر رہا تھا جو بعد میں مصر کا بادشاہ بنا۔

شریف حسین کا تیسرا بیٹا فیصل مدینہ منورہ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔ اِس طرح مدینہ منورہ ترک افواج کے قبضے میں جنگ کے آخر تک رہا۔ شریف حسین کے ساتھ درپردہ لارڈ کچنر نے سازباز کر رکھی تھی۔ مگر برطانوی حکام نے جب شریف حسین سے بغاوت کروالی تو حسب عادت اس سے اپنی نظریں پھیر لیں اور شام کے علاقے فرانس کے حوالے کرنے کا خفیہ معاہدہ کر لیا۔

دسمبر تک برطانوی افواج سنائی میں العرش تک پہنچ چکی تھیں۔ یہ جگہ فلسطین کی سرحد سے صرف 27 میل کے فاصلے پر تھی۔ جنرل مرے کو برطانوی وزیرِ اعظم ڈیوڈ لائیڈ جارج کی جانب سے فلسطین پر جلد از جلد حملے کے احکامات شاہی چیف آف سٹاف جنرل ولیم رابرٹ سن کے ذریعے موصول ہوئے۔ جنرل مرے کے خیال میں اُس کی افواج اِس بڑے حملے کے لیے قطعاً ناکافی تھیں۔

تاہم جنرل مرے کو اپنے موجود سپاہیوں کے ساتھ ہی فلسطین پر حملہ کرنا پڑا۔ 23 دسمبر کو موصوف نے ماغد حابہ پر قبضہ کر لیا۔ اِس لڑائی میں 1300 ترک فوجی قیدی بنا لیے گئے۔ اور بہت کم بھاگنے میں کامیاب ہو سکے۔ جبکہ مدِ مقابل برطانوی افواج کو 146 فوجیوں کی جانوں کا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اِس کے بعد رفاہ پر حملہ 9 جنوری 1917ء کو کیا گیا۔ ایک شدید لڑائی کے بعد 1600 فوجیوں کو قیدی بناتے ہوئے رفاہ پر برطانوی قبضہ ہو گیا جس کے جنگی نقصان کا تخمینہ 500 سے زائد اموات ہر گز نہ تھا۔

بحری محاذ

دنیا کے سمندروں کے بارے میں بحریہ کے ماہرین کی رائے ایک مختلف نوعیت کی ہے۔ سمندروں کا استعمال تمام ممالک ہی کرتے ہیں۔ دو ممالک کی جنگ کے دوران متحارب ممالک کے علاوہ دیگر غیر جانب دار ممالک کے بحری جہاز بھی اپنے اپنے تجارتی سفر کے دوران سمندروں کے عمومی طے شدہ راستے اختیار کرتے ہیں۔ اِس طرح ایک خاص قسم کا رواج ظہور پذیر ہو گیا جسے "بین الاقوامی قانون برائے سمندری تجارت دورانِ جنگ" کہتے ہیں۔

عظیم بحری فلاسفر ایلفریڈ تھائر ماہان کے مطابق یہ قانون ایک شریکِ جنگ ملک کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے دشمن ملک کے جہاز کو اُس کی بندرگاہ یا سمندر میں کہیں بھی تجارتی سامان لانے یا لے جانے سے روک دے۔ اور تمام سامان جنگ ضبط کر لے۔ اِس طرح دورانِ جنگ کسی فریق کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی تجارتی جہاز کو روک کر اُس کی قومیت کی شناخت اور اُس کے سامان کی جانچ کرے۔

انیسویں صدی کے دوران اور بیسوی صدی کے آغاز میں اِس طرح کے قوانین بنائے

جانے کی کوششیں باہمی معاہدوں کے ذریعے جاری رہیں۔ مگر کسی بھی معاہدے کی دورانِ جنگ اہمیت ایک سادہ کاغذ سے زیادہ نہیں رہی۔ یہی کچھ صورتِ حال جنگِ عظیم اول میں بھی رہی۔ جب اتحادی اور مرکزی ممالک ایک دوسرے کی بحری ناکہ بندی میں مصروفِ عمل رہے۔

جنگِ عظیم اول کے آغاز سے ہی برطانوی بحریہ چھوٹے چھوٹے حملوں سے جرمن بحریہ کو میدانِ جنگ میں بڑے پیمانے پر کھینچ لانے کے لیے کوششیں کر رہی تھی۔ لیکن شاہی بحریہ کی بیشتر کوششوں کے باوجود جرمن بڑے سمندروں کے بیڑے کے کمانڈر ایڈمرل ہوگووان پوہل نے نہایت تحمل سے کوئی خطرہ مول نہ لینے کی پالیسی پر عمل جاری رکھا۔

فروری 1916ء میں جرمن امیر البحر ترپز کے ایما پر ایک جارحیت پسند ایڈمرل رین ہرڈ وان شکیر کو بڑے سمندروں کے جرمن بیڑے کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ ایڈمرل شکیر نے قیادت سنبھالتے ہی برطانوی حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کا فیصلہ کیا۔

جرمنی کی جانب سے پہلا بحری حملہ 25 اپریل 1916ء کو کیا گیا۔ تباہ کن کروزرز نے لووسٹوفٹ اور یارموتھ پر شدید گولہ باری کی اور واپسی کی راہ لی۔ اب شکیر کے منصوبے کے مطابق سنڈرلینڈ پر حملہ کیا جانا مقصود تھا۔ مگر موسم کی خرابی کے باعث یہ حملہ نہ کیا جا سکا۔ جرمن وائرلیس کے پوشیدہ کوڈز کی بابت برطانوی بحریہ کو پتا لگ چکا تھا۔ اور وہ جرمنی کی وائرلیس کے ذریعے ہونے والے تمام گفتگو سمجھ جاتے تھے اور اُس کے مطابق اپنی حکمتِ عملہ وضع کر لیتے تھے۔

جُوٹ لینڈ کی لڑائی

31 مئی تا یکم جون 1916ء کو ہونے والی جُوٹ لینڈ کی لڑائی بحری تاریخ کی سب سے بڑی لڑائی ہے۔ اِس بحری لڑائی نے بحریہ کے ماہرین کی توجہ سب سے زیادہ حاصل کی۔ دو (2) دِن تک جاری رہنے والی یہ لڑائی اپنی مثال آپ ہے۔

شکیر نے اپنے ماتحت ایڈمرل فرینز وان ہپر کو حکم دیا کہ وہ 29 بحری جہازوں کو بڑے سمندروں کے جرمن بیڑے کے ساتھ ڈینمارک کے ساحلوں کے ساتھ آگے بڑھتے چلیں۔ ایڈمرل جان جیلیکو کو یہ اطلاع ملی تو اُس نے اپنے شاہی بڑے سمندروں کے بڑے کو کھلے سمندروں میں جانے کا حکم دیا۔

اب برطانیہ کے 40 بڑے بحری جہاز جن میں سے 26 ڈریڈناٹس تھے، جرمن بحری بیڑے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایڈمرل بیٹی ایڈمرل جان جیلیکو کے ماتحت ایک بازو کی قیادت کررہا تھا۔ 31 مئی کو 2:00 بجے دِن ایڈمرل بیٹی کو جرمن بیڑہ نظر آیا۔ اب ایڈمرل بیٹی اور ایڈمرل ہپر آمنے سامنے تھے۔ ایڈمرل بیٹی جرمن چھوٹے بیڑے اور اُس کی بندگاہ کے درمیان آکر اسے اپنے نرغے میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔

ایڈمرل بیٹی نے اپنے بیڑے اور شکیر کے بیڑے کے درمیان حائل ہوتے ایڈمرل بیٹی کو روکنے کے لیے 17000 گز کے فاصلے سے گولہ باری شروع کردی۔ یہ باہمی گولہ باری ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ جرمن گولہ باری گارگر رہی اور شاہی بحریہ کے دو (2) جنگی بحری جہاز غرق ہوگئے۔ جبکہ ایڈمرل بیٹی کے جہاز کا ایک برج تباہ ہوگیا۔ اسی طرح ایک جرمن جہاز کا برج بھی شدید گولہ باری کی وجہ سے تباہ ہوگیا۔

اس وقت ایڈمرل ہپر کی قیادت میں جرمن بحری جہاز برطانوی بحری جہازوں کو کھلے سمندر میں موجود ایڈمرل شکیر کے جہازوں کی جانب دھکیلنے لگے اور قریب تھا کہ برطانوی جہاز بری طرح نرغے میں پھنس جاتے۔ مگر دوسرے ہلکے کروزرز کے سکواڈرن کے ایڈمرل گوڈ ایناف نے 4:33 منٹ پر جرمن جہازوں کو دیکھ کر اُن پر گولہ باری شروع کردی۔ 4:40 بجے ایڈمرل جیلیکو نے آکر ایڈمرل بیٹی کے عقب کو جرمن جہازوں کے خطرے سے محفوظ کردیا۔

اب ایڈمرل ہپر کا چھوٹا بیڑہ تین اطراف سے برطانوی بحری جہازوں کے نرغے میں تھا۔ اس کی مدد کے لیے آنے والا ایڈمرل شکیر ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ اسے لڑائی کے مقام تک پہنچنے میں 1:30 گھنٹے لگے۔ تاہم اِس دوران ایڈمرل ہپر نے بڑی جوانمردی اور ہوشیاری سے دشمن کی اپنے سے آٹھ گنا زیادہ قوت اور جدید جہازوں کو اُلجھائے رکھا۔

ایڈمرل شکیر کے بیڑے کے نظر آتے ہی برطانوی جہازوں نے شدید گولہ باری شروع کردی۔ اور 6:33 منٹ پر ایڈمرل ہپر کے جہاز میں گولہ باری کے باعث شدید خرابی پیدا ہوگئی۔ دوسری طرف برطانوی بیڑے کے عقب کے ایڈمرل ہوڈ کے جہاز کو جرمن گولہ باری نے غرق کردیا۔

اِس لڑائی میں 250 سے زائد بحری جہازوں نے حصہ لیا۔ اتنے بڑے پیمانے پر لڑی

جانے کی وجہ سے متوقعہ ہے کہ یہ آئندہ تاریخ کی بھی سب سے بڑی لڑائی ہی ثابت ہو۔ اِس لڑائی میں تقریباً 10000 پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ 300 سے زائد کارروائیوں کی رپورٹس دی گئیں۔ جبکہ 65 فیصد سے زائد بڑے پیمانے پر ہونے والی نشانہ بازی اور گولہ باری کا ریکارڈ دستیاب ہے۔

اِس لڑائی میں جرمن بحری بیڑی کامیاب رہا۔ اُس نے برطانیہ کے تین (3) جنگی بحری جہاز، تین (3) کروزرز اور آٹھ (8) تباہ کن بحری جہاز (ڈسٹرائرز) غرق کر دیے۔ اور 6100 افراد مارے۔ جبکہ برطانیہ نے جرمنی کا ایک (1) جہاز، ایک (1) جنگی بحری جہاز، چار (4) ہلکے کروزرز اور تین (3) تباہ کن بحری جہاز تباہ کیے۔ اور 2550 افراد مارے گئے۔

برطانیہ میں ایڈمرل جیلیکو پر بہت زیادہ تنقید کی گئی مگر اُس نے جواب دیا کہ سب سے اہم بحری بیڑے کی ہیبت اور اس کا وجود ہونے کے باعث اسے بچانا اُس کی اولین ذمہ داری تھی۔ دوسرے دن (2 جون کو) ایڈمرل جیلیکو نے برطانوی وزیرِ بحریہ کو اپنے بحری بیڑے کے دیگر کسی محاذ کے لیے تیار ہونے کی رپورٹ دی جبکہ جرمن بحری بیڑہ کئی دِن بعد تک کسی بڑے محاذ کے لیے تیار نہ ہو سکا۔

مجموعی صورتِ حال

1916ء کے دران جنگِ عظیم اول کی صورتِ حال گزشتہ سال کی طرح سرگرم اور خونریز رہی۔ مغربی محاذ پر جاری شدید لڑائیوں کے سلسلے میں اب تیزی لائی گئی۔ جرمن افواج اتحادی افواج کی فرنٹ لائن میں شگاف ڈالنے کے لیے درپے تھیں جبکہ اتحادی افواج فرانس کے تقریباً نصف حصے پر قابض جرمن افواج کی صفِ اول میں نہ صرف شگاف ڈالنے بلکہ اسے اپنے علاقوں سے پرے دھکیلنے کے لیے بھی بھرپور کوشش کر رہی تھیں

اس سال مغربی محاذ پر جرمن چیف آف سٹاف جنرل فالکن ہائنز کے منصوبے کے مطابق فروری میں ورڈن کے مقام پر حملہ کیا گیا۔ اِس حملے کا مقصد ایک لمبے عرصے کے لیے لڑائی لڑتے ہوئے دشمن کے حوصلے اور ہمت کو پست کرنے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی افواج کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک بہا ڈالنا تھا۔

جنگِ عظیم کی اِس سب سے لمبی لڑائی میں جرمن افواج کو کسی قدر کامیابی رہی۔ ایک تو وہ وردُن کی قلعہ بندیوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہے۔ دوسرے فرانسیسی افواج کے قتل اور خونریزی کے مقاصد میں بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ البتہ لڑائی کے صحیح ثمرات سے جرمن افواج محروم رہیں اِس کی بڑی وجہ اٹلی اور روس کی جارحیت اور سوم کے مقام پر مغربی محاذ میں ہی برطانوی مہماتی فوج کا شدید حملہ تھا۔

دوسری طرف اتحادی افواج نے جرمنی کی فوج کی قوت وردُن میں کم کرنے کے لیے ایک محاذ کا آغاز کیا جس کے مطابق سوم کے مقام پر برطانوی مہماتی فوج نے بھرپور حملے کیے۔ ابتدائی معمولی کامیابی کے بعد عددی برتری کے باوجود مسلسل ناکامیاں برطانوی فوج کا مقدر بنی رہیں۔ اِسی لڑائی میں پہلی بار ٹینکوں کا استعمال کیا گیا۔ جرمن اور فرانسیسی چیف آف سٹاف تبدیل کر دیے گئے اور جرمن فالکن ہائنز کی جگہ لیوڈنڈ روف جبکہ فرانس کے جنرل جوفر کی جگہ نیویل نے لے لی۔

بہت زیادہ جانی نقصانات کے پیشِ نظر ماہ نومبر کے وسط میں برطانوی حکام کو اِس حملے کو ختم کرتے ہوئے پسپائی اختیار کر کے اپنی پرانی دفاعی لائن پر آنا پڑا۔ دوسری جانب مشرقی محاذ پر فرانس کی خصوصی استدعا پر روس کے زار نیکولاس نے حملے کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ جنوب مغربی آرمی گروپ کے جنرل بروسیلوف نے از خود رضاکارانہ طور پر حملوں کی حامی بھری اور شکست خوردہ اور منتشر روسی افواج کو پہلی بار اپنی بہترین حکمتِ عملی اور دانشورانہ و بہادرانہ طریقِ جنگ کے باعث بھرپور فتح سے ہمکنار کیا۔

مشرقی محاذ کی کامیاب جنگ کے اصل ثمرات سے روس بہرحال محروم رہا۔ حسبِ سابق وحسبِ روایات روس کی اتحادی افواج میں حیثیت فرانس اور برطانوی امداد کے علاوہ کچھ بھی نہ تھی۔ روس کے دیگر اتحادی خود روسی قوت سے خائف تھے اور اسے کمزور کرنا چاہتے تھے۔ اِس طرح وہ ایک تیر کے ذریعے دو شکار کرنے کی حکمتِ عملی پر کاربند تھے۔ مشرقی محاذ پر روس اور جرمن افواج کے مدِ مقابل کھڑے ہونے سے دیگر اتحادی ممالک کے آنے والے وقت کی دو (2) عظیم قوتوں کے آپس میں لڑ کر کمزور ہو جانے کے مقاصد پوری طرح حاصل ہو رہے تھے۔

اٹلی کے محاذ پر فرانس کی استدعا پر دریائے ایسونزو پر پانچویں لڑائی کا آغاز اجلت سے

کیا گیا۔ آسٹریا۔ ہنگری کی افواج کی مدد کے لیے جرمن افواج کو مشرقی اور اٹلی کے محاذ پر فوراً مداخلت کرنا پڑی۔ اِس کے باعث ورڈن کے محاذ سے جرمنی کی قوت میں کمی ہوئی اور حملوں کی شدت اور متوقع نتائج کے حصول میں ناکامی کا سامنا رہا۔

اٹلی کے دریائے ایسونزو پر پانچویں لڑائی شروع کرنے کے فوراً بعد آسٹریا۔ ہنگری نے ٹرینٹینو کے مقام سے حملے کا پروگرام بنایا۔ اِس حملے ابتدائی کامیابیوں کے بعد اٹلی کی افواج کی بروقت محاذ پر آمد نے حملے کے اصل ثمرات کے آسٹریائی فوج کو محروم کردیا اور بعد ازاں انہیں اپنے ابتدائی طور پر مفتوحہ علاقے چھوڑ کر واپس دفاعی لائن پر آنا پڑا۔

دوسری طرف اٹلی نے آسیاگو کے محاذ کے خاتمے کے فوراً بعد ہی دریائے ایسونزو پر حملوں کا سلسلہ تیز کردیا۔ دریائے ایسونزو پر چھٹے حملے سے نویں حملے تک اٹلی کو تاریخی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اور اٹلی کی فوج آسٹریا۔ ہنگری کی دفاعی لائن میں شگاف بناتے ہوئے اسے پسپا کرنے میں کامیاب رہی۔

بلکان کے محاذ کی اِس سال میں خاص بات رومانیہ کا اتحادیوں کے حق میں مرکزی ممالک کے خلاف میدانِ عمل میں کود جانا تھا۔ رومانیہ کی 560000 فوج کے حملے کو روکنے کے لیے جنرل فالکن ہائنز ایک طرف سے جبکہ جنرل میکنسن دوسری طرف سے اپنی افواج کو لیکر روانہ ہوئے۔ ہر دو جرنیل اپنی بہترین افواج اور اعلیٰ جنگی ترتیب کے باعث کامیاب حملے کرتے رہے۔ اور آخر کار رومانوی افواج کو پسپا کرنے اور اُس کے علاقے فتح کرنے میں کامیاب ہونے لگے۔

یونان اور سیلونیکا کے محاذ پر ایک شدید لڑائی کا آغاز اُس وقت ہوا جب وہاں اتحادی فوج کے علاوہ سربیائی مہاجر فوجی اور دیگر اتحادی اثر ورسوخ کی افواج متحد ہو کر بلغاریہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنانے لگیں۔ اِس محاذ پر یونان کا بر طرف وزیر اعظم ساریل قیادت کے دشوار گزار مراحل سے گزر رہا تھا۔ بلغاریہ کی فوج ساریل کے دوطرفہ حملوں کے نتیجے میں سخت مشکلات کا شکار تھی اور ایک طرف اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کرتے ہوئے جوابی حملے کر رہی تھی۔

اسی دوران یونان میں جرمن حامی بادشاہ کنسٹنٹائن دوم کے خلاف اتحادی افواج بھر پور سازش اور حیلہ جوئی کے باعث بغاوت ہوئی۔ اتحادی افواج کے کٹھ پتلی زینی ویلو نے کریٹ پر

اپنے حکومت کا اعلان کر دیا۔ اِس طرح اِس سال کے آخر میں یونان میں دو حکومتیں قائم تھیں۔

اتحادی افواج نے مصر میں اپنی بھرپور کارروائیوں کا آغاز کر رکھا تھا اور وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی تھی۔ اب وہ ترکی میسوپوٹامیا اور دوسری جانب فلسطین پر حملے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ آخر الذکر حملے کی وجہ یہودیوں کے لیے ایک آزاد ملک کا قیام اور صلیبی جنگوں کی ہزیمت کی شرمندگی ختم کرتے ہوئے امتِ مسلمہ کو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچانا تھا۔

میسوپاٹامیا کے محاذ پر کٹ میں محصور برطانوی فوج کو ایک عرصے تک شدید مزاحمتی لڑائی لڑنے اور مدد ملنے کے باوجود ترک افواج کے بھرپور حملوں کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور کٹ کے علاقے سے دستبردار ہونا پڑا۔ جبکہ کاکیشیا کے محاذ پر روسی جنرل یوڈینچ کی قیادت میں روسی افواج کو ترک افواج کے خلاف خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور وہ کئی ترک علاقے فتح کرنے میں کامیاب رہا۔

اسی دوران اتحادی سازشوں کے نتیجے میں عرب انقلاب پھوٹ پڑا۔ شریف حسین نے لارڈ کچنر کے مہرے کے طور پر کام کرتے ہوئے بغاوت کر دی اور مکہ مکرمہ اور طائف پر قبضہ کر لیا۔ تاہم مدینہ منورہ پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے اور ترک افواج کا مدینہ منورہ پر جنگِ اختتام تک قبضہ رہا۔

1916ء بحری جنگ کے حوالے سے ایک اہم سال رہا۔ اِس سال بحری جنگ کی تعریف اور طریقہ کار از سرِ نو وضع کیا گیا۔ جُوٹ لینڈ کی شہرہ آفاق اور بحری تاریخ کی سب سے عظیم لڑائی بھی اسی سال جرمنی اور برطانیہ کے مابین لڑی گئی۔

بحری فلاسفروں کے مطابق بحری جنگوں اور تجارتی سفروں کا قانون ایک شریکِ جنگ ملک کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے دشمن ملک کے جہاز کو اُس کی بندرگاہ یا سمندر میں کہیں بھی تجارتی سامان لانے یا لے جانے سے روک دے۔ اور تمام سامان جنگ ضبط کر لے۔ اِس طرح دورانِ جنگ کسی فریق کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی تجارتی جہاز کو روک کر اُس کی قومیت کی شناخت اور اُس کے سامان کی جانچ کرے۔

انیسویں صدی کے دوران اور بیسویں صدی کے آغاز میں اِس طرح کے قوانین بنائے جانے کی کوششیں باہمی معاہدوں کے ذریعے جاری رہیں۔ مگر کسی بھی معاہدے کی دورانِ جنگ

اہمیت ایک سادہ کاغذ سے زیادہ نہیں رہی۔ یہی کچھ صورتِ حال جنگِ عظیم اول میں بھی رہی۔ جب اتحادی اور مرکزی ممالک ایک دوسرے کی بحری ناکہ بندی میں مصروفِ عمل رہے۔

سال زیرِ غور میں ہونے والی بحریہ کی تاریخ کی جُوٹ لینڈ کی عظیم لڑائی میں 250 سے زائد بحری جہازوں نے حصہ لیا۔ اور تقریباً 10000 پیغامات کا تبادلہ ہوا۔ 300 سے زائد کارروائیوں کی رپورٹس دی گئیں۔ جبکہ 65 فیصد سے زائد بڑے پیمانے پر ہونے والی نشانہ بازی اور گولہ باری کا ریکارڈ دستیاب ہے۔

اِس لڑائی میں جرمن بحری بیڑی کامیاب رہا۔ اُس نے برطانیہ کے تین (3) جنگی بحری جہاز، تین (3) کروزرز اور آٹھ (8) تباہ کن بحری جہاز (ڈسٹرائرز) غرق کر دیے۔ اور 6100 افراد مارے۔ جبکہ برطانیہ نے جرمنی کا ایک (1) جہاز، ایک (1) جنگی بحری جہاز، چار (4) ہلکے کروزرز اور تین (3) تباہ کن بحری جہاز تباہ کیے۔ اور 2550 افراد مارے گئے۔

7

1917ء کے دوران جنگ کی صورتِ حال

سال 1917ء جہاں میدانِ جنگ میں شدت اور سختیوں کا سال تھا وہیں اس سال امن کے قیام کے لیے کاوشوں کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ تاہم کوئی بھی فریق جنگ کے خاتمے کے لیے تیار نہ تھا۔ مرکزی ممالک صلح اور امن کے لیے اپنی شرائط کی تشہیر اور اظہار نہ کر رہے تھے جبکہ اتحادی ممالک کی جانب سے ناقابلِ قبول شرائط پیش کی جا رہی تھیں جن میں آسٹریا۔ ہنگری کی سلطنت کو دولخت کرنے کی شرط سب سے اہم تھی۔

اسی سال روس میں اُٹھنے والے بالشویکی انقلاب کے باعث روسی مدافعت دم توڑ چکی تھی اور جرمن افواج مشرقی محاذ میں اپنی فتح کے پھریرے لہرا رہی تھیں۔ دوسری طرف مرکزی ممالک کے حلیف بلغاریہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ترکی کے محاذ کی صورتِ حال بھی انتہائی ابتر اور غیر تسلی بخش رہی۔ ترک فوج کو بغداد سے پیچھے ہٹنا پڑا اور دوسری جانب غزہ اور یروشلم دشمن کے قبضے میں چلے گئے۔

اسی سال (6 اپریل 1917ء کو امریکی حکومت کی جانب سے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا) امریکہ کے میدانِ کارزار میں کود جانے کے باعث اتحادی قوتوں کو تقویت جبکہ مرکزی

ممالک کو شدید نقصان پہنچا۔ امریکہ نے مرکزی ممالک کی بحری تجارت کے خاتمے کے لیے بھرپور اقدامات کیے اور مرکزی ممالک کی بیرونی دنیا کی تجارت کی بندش کر دی۔

بحری تجارت کی بندش کے جواب میں جرمنی کی جانب سے سب میرین کی جنگ کا آغاز کر دیا گیا۔ جس کا مقصد برطانیہ کی بحری تجارت کی بندش تھا۔ اِس طرزِ جنگ میں جرمنی کو خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی تاہم اُس کے اصل اھداف حاصل نہ ہو سکے۔

برّی، بحری اور فضائی حملے

1917ء میں بھی جنگ کے شعلے تمام محاذوں پر پورے زور و شور سے بھڑکتے اور انسانیت کو لقمہ اجل میں لیتے رہے۔ بالادستی اور اقتدار کی جنگ نے بظاہر انسان صورت، سفید چمڑی میں ملفوف حیوانوں کو درندگی کی انتہا پر پہنچا دیا تھا۔ انسانوں کی مسلسل عظیم قربانیوں کا تقاضا کرتے حکام عقل و دانش اور بردباری میں اپنی اپنی قوموں کے لیے عظیم شخصیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ امریکی صدر ولسن جو گزشتہ سال کے آخری ماہ میں امن و امان کے قیام کی اپیل کر رہے تھے، اب خود میدانِ عمل میں کود کر جنگ کی تباہ کاریوں اور انسانی قتلِ عام کے بعد مالِ غنیمت کے حصول میں حصہ دار بننے کے خواہاں تھے۔

برطانوی حکام بھی جنگ کے محور کے گرد گھومتے ہوئے منصوبہ سازیوں میں مصروف تھے۔ دوسری جانب ولیم دوم جرمنی کو خونریزی اور تباہی کے راستے پر چلانے کا شدید خواہاں تھا۔ فرینز فرڈیننڈ جو گزشتہ سال نومبر میں وفات پا گیا تھا، بھی جنگ کی آگ و آتش بڑھانے کا خواہاں تھا۔ فرانسیسی تو گزشتہ پچیس (25) سالوں سے جرمنی سے جنگ کے لیے بالکل ہی تیار بیٹھے تھے اور اِس مقصد کے حصول کے لیے درپردہ سازشوں اور معاہدوں کا سلسلہ گرم کیے ہوئے تھے۔

تاہم یہ سال جنگ کی شدت اور سختی کا سال رہا۔ تمام تر محاذوں کے ساتھ ساتھ اِس سال فضائی محاذ بھی مستحکم اور قابلِ ذکر رہا۔ بحری بالادستی کی کوششیں اپنے عروج پر رہیں اور نوآبادیات کی بندر بانٹ پر قتل و غارت گری کا بازار خوب گرم رہا۔

مغربی محاذ

مغربی محاذ کی مجموعی صورتِ حال میں ایک تبدیلی جنرل جوفر کی ریٹائرمنٹ اور جنرل نیویل کے چیف آف سٹاف بننے سے رونما ہوئی۔ جنرل جوفر تمام احتیاطی تدابیر کو بروئے کار لاتے ہوئے آہستہ آہستہ دشمن پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا۔ جبکہ جنرل نیویل چاہتا تھا کہ چھوٹے پیمانے پر جو مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں اُن کے لیے بڑے پیمانے پر بھی کوششیں کی جاسکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک بڑا حملہ ترتیب دیا جائے تاکہ دشمن کے قدم اُکھاڑتے ہوئے اسے اپنے علاقوں سے نکال باہر کیا جاسکے۔

اِس مقصد کے حصول کے لیے مغربی محاذ پر 1917ء میں دریائے آئزن کے کنارے ایک بہت بڑے پیمانے پر فرانسیسی فوج کی جانب سے حملہ کیا گیا۔ اِس حملے میں جرمن افواج کی قوت کو کم کرنے کے لیے برطانوی فوج کو اراس کے مقام سے حملہ کرنا تھا۔ بعدازاں یپرس اور کیمبرائی کے مقامات سے حملے کر کے جرمن افواج کو مصروف کار رکھا گیا تاکہ وہ بڑھ کر جوابی حملہ نہ کرسکیں اور فرانس کی تباہ حال آرمی کو ازسرِ نو منظم ہونے کا موقع دیا گیا۔

آئزن کی دوسری لڑائی

جنرل نیویل کے حملے کی منصوبہ بندی کے دوران ایک خفیہ معاہدے کے تحت نئے برطانوی وزیرِ اعظم نے اپنے چیف آف سٹاف کے علم میں لائے بغیر جنرل ہیگ جو برطانوی مہماتی فوج کے فرانس میں آپریشن کا سربراہ تھا، کو جنرل نیویل کے ماتحت کردیا۔ اِس نئی صورتِ حال نے اتحادی افواج میں فاصلے اور دوری کو جنم دیا۔

دوسری جانب جنرل نیویل کے منصوبے کو جنرل پیٹین نے مسترد کردیا تھا۔ اِس وجہ سے جنرل نیویل نے جنرل جوزف ایلفریڈ مشلر کو اِس مقصد کے لیے چنا تھا۔ آئزن کی دوسری لڑائی کا آغاز 16 اپریل کو بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ جنرل مینگن اور اولیویئر کی افواج نے بڑی بہادری اور اعتماد سے حملہ کیا۔ لیکن جرمنی کی مشین گنوں کے بھرپور جواب نے حملے کو روک دیا۔ قبل ازیں اِس مقام پر جنگ جاری رہ چکی تھی مگر اس بار نیویل کی نئی پالیسی اور حکمتِ عملی کے باعث جنگ کا نقشہ مختلف تھا۔

فرانس کی فوج کی جانب سے ٹینک میدانِ کارزار میں جھونکے گئے۔ ٹینک قبل ازیں ورڈن کی لڑائی میں جنرل ہیگ نے متعارف کروائے تھے۔ اب فرانس کے ٹینکوں کا جرمن افواج کی جانب سے منہ توڑ جواب دیا گیا اور پہلے ہی روز 200 سے زائد ٹینک تباہ کر دیے گئے۔ تاہم فرانس کی افواج کی جانب سے حملے جاری رکھے گئے۔

اگلے روز فرانس کی فوج کو 2.5 (اڑھائی) میل پیش قدمی کا موقعہ مل گیا اور جرمن افواج اپنی مشہور دفاعی پٹی "ہنڈن برگ لائن" سے رضا کارانہ طور پر پسپا ہو گئے اور فرانس کی فوج کو مال میسن کے قلعے کو فتح کرنے کا موقع مل گیا۔ اس روز جرمن توپ خانے کو بھاری نقصان پہنچا۔ اسی دوران 29 مئی کو جنرل پٹین کو فرانس کا چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا۔

بعد ازاں 9 مئی کو حملے کو ماہِ مئی کے آخر تک مؤخر کر دیا گیا۔ اور جنرل نیویل سے چارج 15 مئی 1917ء کو لیتے ہوئے جنرل پٹین کے حوالے کر دیا گیا۔ جنرل پٹین نے ایک بار پھر جنرل نیویل کے منصوبے کے مطابق حملہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ بعد میں اس کی جگہ جنرل فوش کو ریٹائرمنٹ سے بلا کر چیف آف سٹاف کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

آئزن کی دوسری لڑائی میں فرانس کی افواج کو شدید نقصان پہنچا۔ آئزن کی لڑائی کے اعداد و شمار بہت حد تک مشکوک اور جنرل نیویل کے مخالفین کے جانب سے ہدفِ تنقید رہے ہیں۔ اُن کے مطابق فرانس کی سرکاری تاریخ کے اعداد و شمار 96000 سے کہیں زائد اِس حملے کے دوران اموات ہوئیں۔ جبکہ دوسری جانب جرمنی کی شرح نقصان 150000 کے لگ بھگ رہی۔

آئزن کی دوسری لڑائی کے دوان فرانسیسی افواج کے مورال بری طرح پست ہوئے کیونکہ 23385 بار کیے گئے حملوں میں ہر مرتبہ فرانسیسی افواج کو منہ کی کھانا پڑی تھی۔ اب ان کی تنظیم ختم ہو چکی تھی اور وہ شکست خوردہ اور تھکے ہارے گروہ کی مانند ہو گئے تھے۔ اب ان کی ازسرِ نو تنظیم کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

اریس کی لڑائی

جنرل ہیگ نے 1917ء کے سال کا آغاز بطور فیلڈ مارشل کیا۔ معاہدہ کیلیس کے بعد پیدا ہونے والے صورتِ حال کے پیشِ نظر جنرل ہیگ کو جارج پنجم کی جانب سے استعفٰے کی بابت

سوچنے سے منع کرتے ہوئے اُسے ایک عظیم اثاثہ قرار دیا گیا تھا۔اب جنرل ہیگ کو جنرل نیویل کے حملے کے باعث جرمن افواج کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانی تھی اور اسے دریائے ارلیس کے مقام پر جرمن جنرل بارون لیوووگ وان فالکن ہیوسن کی 6 ڈویژن فوج پر اپنی 14 ڈویژن فوج اور 2800 توپ خانے کے ساتھ حملہ آور ہونا تھا۔

برطانوی تیسری اور پہلی آرمی دائیں اور بائیں جانب سے حملہ آور ہوئیں۔تیسری آرمی کی قیادت جنرل ایڈماؤنڈ ایلینبے اور پہلی آرمی کی قیادت جنرل ہیمری ہسن کلریئر ہارن کر رہے تھے۔9 اپریل کو حملہ کامیابی سے شروع کیا گیا۔ٹینکوں کے مکمل طور پر ناکام ہو جانے کے باوجود بھی حملہ اب تک کے مغربی محاذ کا سب سے زیادہ گہرا اور دور تک شگاف ڈالنے والا تھا۔

برطانوی کور کمانڈر جنرل چارلیس فرگوسن نے ساڑھے تین میل (3.5) اندر تک دشمن کی تیسری خندق تک مار کرتے ہوئے علاقہ چھین لیا۔تاہم کینیڈا کے چار (4) ڈِجن پر حملے کا اصل دارومدار تھا، اپنے مطلوبہ اہداف حاصل نہ کر سکے۔اوروِمی کی پہاڑی کے بیشتر علاقے فتح کرنے میں ناکام رہے۔

اگلے دِن جنرل ہیگ کے پیغام کے مطابق جرمن شکست خوردہ فوج کا پیچھا کرنے کے لیے برطانوی افواج کو تیار کیا گیا مگر جنرل ہیگ یہ بھول گیا کہ دشمن کے پاس اسی قدر محفوظ فوج بھی موجود ہے۔یہ الگ بات کہ جنرل فالکن ہیوسن نے اپنے آفیسرانِ بالا کی حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی محفوظ فوج کو 15 میل مزید مشرق کی طرف صف بند کیا ہوا تھا جہاں سے بوقتِ ضرورت میدانِ جنگ میں طلب کرنے پر دیر ہو جائے۔

تاہم جنگ 23 اپریل تک بلا کسی خاص قابلِ ذکر بہتری کے جاری رہی۔تب کینیڈا کی فوج نے وِمی کی پہاڑی پر بھرپور حملے کرتے ہوئے دودِن کی لڑائی کے بعد اِس پر قبضہ کر لیا۔لڑائی کے آخری حصے میں 3 مئی کو ایک آخری ضرب کے دوران جرمن افواج کو مزید پیچھے دھکیل دیا۔جس کے بعد یہ حملہ ختم کر دیا گیا۔

میسنز کی لڑائی

جنرل ہیگ نے اپنے ذہن میں تیار شدہ منصوبے کے مطابق فلینڈرز کی جانب متوجہ

ہونے کا فیصلہ کیا۔ اِس حملے کا مقصد جہاں بیلجیم سے جرمن افواج کو نکال باہر کرنا تھا وہیں فرانسیسی افواج کے گرتے ہوئے مورال کے باعث جرمنی کے جوابی حملے کا سدِ باب بھی تھا۔ اُس پر فرانسیسی اور برطانوی حکومتوں کی جانب سے مسلسل دباؤ تھا کہ وہ جرمن افواج کو بھرپور انداز سے الجھائے رکھے ۔ اور بیلجیم کے ساحلی علاقوں سے انہیں نکال باہر کرے تاکہ ساحلی علاقوں سے جرمنی کے آبدوزوں کے حملے کی روک تھام کی جاسکے۔

اِس مقصد کے حصول کے لیے اُس کے نئے حملے کے پہلے مرحلے میں میسنز کی پہاڑی پر قبضہ کرنا تھا۔ اور بعد ازاں ایک بھرپور پیش قدمی کرتے ہوئے راؤسلر اور تھوروٹ کی جانب بڑھنا تھا۔ اِس حملے کی خاص بات بارودی سرنگوں کی بہت بڑی زنجیر تھی جو 7 جون کو صبح 3:10 منٹ پر پورے زور سے پھٹ گئیں ۔ اب جنرل پلمر کی دوسری آرمی کے نو (9) ڈویژن پہاڑی کی جڑوں سے چوٹی تک کی صفائی کرنے لگے تھے۔ جرمن کمانڈر بویریا کے شہزادے روپرٹ نے فوری طور پر اپنے دستوں کو یپرس۔ کومینز کی ندی کے کنارے تک پسپا ہونے کا حکم دیا۔

اِس موقعے پر جنرل ہیگ نے مرکزی حملہ کرنے کی ذمہ داری جنرل گوہ کو سونپ دی اور جنرل پلمر کے اختیارات کو تقسیم کرنے کے لیے پانچویں آرمی کو بھی شامل کرلیا۔ اب نئی صورتِ حال میں پلمر نے یپرس کے محاذ سے واپسی تو اختیار نہ کی مگر جنرل گوہ کو پلمر کے طریقہ کار کو سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ اس وقت تک جرمن افواج پر مزید بھرپور حملے کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ بعد ازاں جنرل پلمر کی جگہ جنرل سمتھ ڈورن نے لے لی۔ اور جنرل پلمر نے واپسی کی راہ لی۔

یپرس کی تیسری لڑائی

جنرل ہیگ نے ایک بار پھر فرانسیسی افواج کی استدعا پر جرمن افواج کو مصروفِ عمل رکھنے کے لیے یپرس کے مقام پر تیسری لڑائی لڑنے کا فیصلہ کیا۔ دس (10) دِن کی مسلسل بمباری کے بعد پہلے دِن کی لڑائی ممکن ہوئی ۔ 31 جولائی سے شروع ہونے والی پیش قدمی میں ابتدائی طور پر جنرل گوہ کی فوج کے بائیں بازو پر شدید جوابی حملوں اور پسپائی کے باوجود مجموعی طور پر برطانوی فوج نے اپنے پہلے دِن کے ہدف کو پالیا۔

اسی شام موسم پھٹ پڑا اور اگلے 14 دِن مسلسل موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ اب اِس

لڑائی کے منصوبے کے لحاظ سے ثمرات ختم ہو چکے تھے تاہم مسلسل فرانسیسی دباؤ کے باعث جرمن افواج کو مصروفِ کار رکھا گیا۔ 16 اگست کو موسم خشک ہونے پر دوبارہ لڑائی شروع ہوئی اور لینگ مارک کی لڑائی کے بعد ایک بار پھر موسم سخت خراب ہو گیا۔ میدانِ جنگ میں درکار اسلحہ بڑی مشکل سے لایا جا رہا تھا۔ کئی خچر اور انسان پانی میں ڈوب رہے تھے۔

جنرل پلمر جسے میسنز کے محاذ سے طلب کر لیا گیا تھا، نے بھرپور عرق ریزی سے یپرس کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ معمولی برسات کے باوجود سطحِ زمین پیش قدمی کے لیے مناسب تھی۔ 20 سے 25 ستمبر تک لڑی جانے والی مینن سڑک کی پہاڑی پر اور 26 ستمبر سے 3 اکتوبر تک پولی گن ووڈ کی لڑائیاں گرد کے اندھا کر دینے والے بادلوں میں لڑی گئیں۔

اِس لڑائی کے تیسرے حصے میں 26 اکتوبر تا 6 نومبر تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا جس میں پیسچنڈیل کا گاؤں فتح ہوا۔ اسی گاؤں کے نام سے یپرس کی تیسری لڑائی کو پیسچنڈیل کی لڑائی سے بھی یاد کرتے ہیں۔

جنرل ہیگ کو بہت زیادہ تنقید کا نشانہ اِس لڑائی کے اعداد و شمار کی وجہ سے بھی بنایا جاتا ہے۔ اِس لڑائی میں 240000 برطانوی اور اسی قدر جرمن نقصانات ہوئے جبکہ قیدی بنائے جانے والے فوجیوں کی تعداد 37000 رہی۔

کیمبرائی کی لڑائی

جنرل ہیگ نے 1917ء کے اختتام پر جرمن افواج کے مشرقی محاذ سے فارغ ہونے سے قبل ایک اور حملے کا پروگرام بنایا۔ وہ جانتا تھا کہ مشرقی محاذ پر خاموشی کے بعد جرمن افواج کا ایک بھرپور طاقتور ریلا آئے گا جس کے آگے بند باندھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کر لیا جائے اور جرمن افواج کے مقابلے میں دفاعی جنگ کی حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔

20 نومبر کی صبح اُس نے 500 ٹینکوں کے ساتھ حملہ کیا۔ ابتدائی طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر اگلے چند روز تک زوردار لڑائی جاری رہی۔ جرمن افواج کے بھرپور جوابی حملے کے باعث برطانوی افواج کو پسپا ہونا پڑا۔ اور آخر کار جرمن افواج نے اپنے ابتدائی طور پر چھنے ہوئے

علاقے نہ صرف حاصل کر لیے بلکہ دشمن کو اُس کی لڑائی سے قبل کی پوزیشن پر دوبارہ دھکیل دیا۔

اِس لڑائی میں برطانیہ کا نقصان 43000 افراد رہا جن میں سے 6000 فوجی قیدی بنا لیے گئے۔ جبکہ جرمن افواج کا نقصان 41000 ہوا۔ جن میں 11000 قیدی بھی شامل ہیں۔ برطانیہ میں اِس جنگ کے اعداد و شمار پر ایک بار پھر بہت تنقید ہوئی۔ 158 گنز دشمن نے چھین لیں جبکہ دشمن سے صرف 138 گنز چھینی جا سکیں۔

فرانسیسی فتوحات

جنرل پیٹین اپنی فوج کو ایک بار پھر منظم کر کے دشمن پر بھرپور حملے کرنا چاہتا تھا۔ اُسے فوج کو از سرِ نو منظم کرنے کے لیے مناسب وقت مل چکا تھا۔ اب اُس نے دشمن کی فوج پر بڑھ بڑھ کر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تاکہ فرانسیسی افواج کا گرتا ہوا مورال بلند کیا جا سکے۔

20 اگست کو وورڈن کے قریب اِس سلسلے کا پہلا تجربہ کیا گیا۔ فرانس کی دوسری آرمی نے ایک انتہائی اہم لڑائی میں بہترین کردار ادا کرتے ہوئے دشمن کو کسی قدر پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ دوسرا تجربہ 23 اکتوبر کو کیا گیا جس میں فرانس کی دسویں آرمی نے جرمن افواج پر بھرپور حملہ کر کے ملامیسن کا قلعہ دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

گو یہ لڑائیاں بہت وسیع پیمانے پر نہ ہی لڑی گئیں اور نہ ہی دشمن نے ابتدائی طور پر ان پر کوئی خاص توجہ دی مگر ان کی خاصیت یہ ہے کہ ان لڑائیوں نے جرمن افواج کے دلوں پر فرانسیسی افواج کے گرتے ہوئے مورال کی بجائے بلند ہمتی اور عزم کے نئے پہاڑ واضح کر دیے۔

مشرقی محاذ

جنرل بروسیلوف کے زبردست حملوں کے باوجود روسی افواج کے مورال پست ہو چکے تھے۔ معیشت بری طرح تباہ حال اور شکستہ تھی۔ فوجیوں کے پاس جوتے اور کپڑے تک نہیں تھے۔ خوراک کی فراہمی کا مسئلہ بھی اکثر و بیشتر درپیش رہتا تھا۔ اب فوج میں بڑھتی ہوئی شرح اموات اور خونریزی کے باعث یہ تاثر ابھر رہا تھا کہ اعلیٰ آفیسران کے نزدیک فوجیوں کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔

سیاسی حالات دگرگوں ہوتے چلے جا رہے تھے۔ بائیں بازو کی جماعتوں کی جانب سے اصلاحات کے نفاذ کے مطالبے متواتر مسترد کیے جا رہے تھے۔ اب روسی عوام کا ایک ہی نعرہ تھا "امن اور روٹی"۔ فسادات اور بغاوتوں نے سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ پیٹروگریڈ میں 12 مارچ کو باقاعدہ بغاوت ہو گئی اور تین (3) دِن بعد ہی نیکولاس زار کو دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔

سوشلسٹ الیگزینڈر کرانسکی کی قیادت میں ایک عبوری حکومت تشکیل دے دی گئی مگر اصل قوت پیٹروگریڈ کے روسی مزدوروں اور سولجرز ڈیپوٹیز کے ہاتھ تھی۔ ابتدائی طور پر اتحادی افواج کو روسی نئی حکومت کے دل و جان سے جنگ میں شریک رہنے کے عزم سے حوصلہ ہوا اور وہ امید بھری نگاہوں سے روس کی جانب دیکھنے لگے۔

مگر بعد ازاں روسی پیٹروگارڈز کی مجلس کے پہلے حکم نامے میں بہت زیادہ جمہوری قسم کی نئی آرمی کی تشکیل نے پہلے سے موجود تجربہ کار اور بہترین جرنیلوں کی برطرفی اور ہزاروں سپاہیوں کو سزا کے بعد برطرف کرنے کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

جرمن حکام روس میں آنے والی تبدیلی کا بغور جائزہ لے رہے تھے وہ جانتے تھے اِس موقعے پر جبکہ روسی مورال انتہائی پست ہو چکے ہیں اُن پر کوئی حملہ کرنا انہیں طیش دلانے کے لیے کافی ہو گا اور ایک سویا ہوا محاذ یک دم پھر سے جاگ اُٹھے گا۔ اِس لیے انہوں نے اِس دوران اپنی صفِ اوّل کو روسی افواج پر کوئی حملہ کرنے کا حکم نہ دیا۔

اب اچانک سوئٹزرلینڈ سے جلاوطنی سے بالشویک راہنما ویلادی میر لینن اور اُس کے لیفٹیننٹ ایک سربمہر ریل گاڑی کے ذریعے روس میں لائے گئے۔ روس کے باقی رہ جانے والے جرنیلوں میں جنرل روسکی، بروسیلوف، لیور کرنیلوف اور واسیلی گرکو وغیرہ کو کرانسکی کی جانب سے اتحادیوں کا ساتھ دینے اور روسی عوام کی خواہش کے برعکس جرمنی کے ساتھ امن قائم کرنے کی بجائے دشمنی روا رکھنے کا حکم دیا۔

کرانسکی نے جنرل بروسیلوف کو اختیار دیا کہ وہ لیمبرگ کے محاذ پر ایک نئے حملے کا آغاز کرے۔ یکم جولائی کو اُس نے نیم لسبل آسٹریا۔ ہنگری کی باقی ماندہ فوج پر بھرپور حملہ کر دیا۔ اِس حملے کے نتیجے میں روسی افواج کو تیس (30) میل اندر تک پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کے علاقے فتح کرنے کا موقع مل گیا۔

اسی دوران جرمنی کی جانب سے ایک بھرپور جوابی حملہ کیا گیا۔ جس نے لڑکھڑاتے ہوئی روسی افواج کو واپس گلیشیا کے پیچھے دھکیل دیا۔ اِس طرح سارا حملہ فضول اور بے مقصد رہا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ روسی افواج کا پہلی جنگِ عظیم کا آخری حملہ تھا۔

جنرل ہنڈن برگ اور لیوڈنڈروف نے اندازہ لگایا کہ روس پر ایک بھرپور حملہ کرانسکی کی حکومت کے خاتمے کا باعث بن سکتا ہے اور اِس طرح روس کو جنگ سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے یکم ستمبر کو جرمن آٹھویں آرمی نے ایک بھرپور حملہ ریجا کے شہر پر کیا اور دو دِن کی لڑائی کے بعد شہر پر قبضہ کرلیا۔ پھر مزید پیش قدمی شروع کردی۔ اِس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر حسب توقع کرانسکی کی حکومت کا 6 / 7 نومبر کو خاتمہ ہو گیا۔ اور لینن نے پیٹروگریڈ میں اقتدار پر قبضہ کرلیا۔

اگلے ہی دِن نئی روسی حکومت نے معاہدہ امن کرلیا۔ معاہدے کی شرائط طے کرنے کے لے روس کی جانب سے لیون ٹروٹسکی کو مقرر کیا گیا۔ جو 21 نومبر سے 22 دسمبر تک کامیابی سے شرائط معاہدہ طے کرنے میں لگا رہا۔ تاہم وہ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ جرمنی میں بالشویک تحریک کے زور پکڑنے کا انتظار کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح روس کو ذلت آمیز شرائط معاہدہ پر دستخط کیے بغیر ہی امن حاصل ہو جائے۔

جرمنی کی جانب سے جنرل میکس ہوفمین نے 10 فروری 1918ء کو اعلان کردیا کہ روس جرمنی کی شرائطِ امن تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔ لہٰذا روس سے حالتِ "عدمِ جنگ۔ عدمِ امن" کا بھی اعلان کردیا گیا۔ تاہم جرمن افواج نے اِس اعلان کو منفی انداز سے لیا اور غصے سے بھرپور ہو کر انہوں نے 18 فروری کی صبح روس کی سرحد میں جارحیت شروع کردی۔ شمال میں ڈوینسک اور جنوب میں لیوٹسک پر قبضہ کرلیا۔

اگلے روز لینن کی جانب سے ایک ٹیلی گراف جرمن ہیڈکوارٹر میں موصول ہوا جس میں بریسٹ۔ لیٹوسک کے مقام پر پیش کی گئی شرائط تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ جرمن پیش قدمی جاری رہی اور شمال میں جھیل پیپس اور ناروا تک جرمن افواج پھیل گئیں جہاں سے وہ بلاواسطہ پیٹروگریڈ پر حملہ آور ہو سکتی تھیں۔ جنوب میں جرمن افواج یوکرائن پر قابض ہو چکی تھیں۔

آخر کار 3 مارچ کو بریسٹ۔ لیٹوسک کے مقام پر ایک معاہدہ امن پر فریقین نے دستخط کر دیے۔ اِس معاہدے کے تحت جرمنی روس کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ اگر مغربی محاذ اور معاہدہ وارسیلز کے مطابق جرمنی کو روسی علاقوں سے واپس ہٹنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو وہ روس کی ایک تہائی آبادی، زرعی زمینوں اور نصف سے زائد صنعتوں پر قابض رہتا۔

اٹلی کے محاذ

اٹلی کے محاذ پر یہ سال مرکزی قوتوں کی فتوحات کا سال رہا۔ تاہم آسٹریا۔ ہنگری کی سلطنت اپنے آخری دموں پر ہونے کے باعث اٹلی پر ایک فیصلہ کن اور کاری ضرب لگانے سے نہ صرف محروم رہی بلکہ اس کا حملہ بری طرح ناکام ہو گیا اور اسے شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ جنگ کے اِس مرحلے پر اگر آسٹریا۔ ہنگری ثابت قدمی سے اٹلی پر حملہ آور ہو کر اسے میدانِ جنگ سے نکال باہر کرتا تو یقیناً نتائجِ جنگ آج کے تسلیم شدہ نتائج سے بہت مختلف ہوتے۔

یہی وہ آسٹریا۔ ہنگری تھا جس کا سابقہ چیف آف سٹاف اٹلی کو دھمکاتا رہتا تھا، دوسری طرف سربیا، رومانیہ، مانٹی نیگرو اور روس اُس کی دھمکیوں کی زد میں رہتے تھے۔ جبکہ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ جنگ کے تین (3) سالوں کے دوران باعثِ جنگ ممالک سربیا اور آسٹریا۔ ہنگری میں سے آخر الذکر بالکل ہی اپنے آخری سانس لے رہا تھا۔ سیاسی طور پر اس کی حالتِ زار انتہائی قابلِ رحم جبکہ معاشی طور پر جرمنی کے مضبوط سہارے کے باوجود ابتری کا شکار تھا۔

دریائے ایسونزو کی دسویں اور گیارھویں لڑائیاں

اٹلی کا چیف آف سٹاف جنرل کیڈورنا 1916ء کے اختتام پر اپنی بھرپور تیاریوں میں مصروف تھا۔ اب 1917ء کے آغاز پر وہ پورے اعتماد سے دشمن پر دریائے ایسونزو سے حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اتحادی حکام کی جانب سے اُسے تسلی دی گئی تھی کہ بہار 1917ء کے حملے باہمی مشاورت اور فوجی امداد کے ساتھ کیے جائیں گے۔

انہی حملوں کے سلسلے میں برطانیہ نے ارلیس کے مقام پر 9 اپریل کو حملہ کیا۔ 16 اپریل کو فرانسیسی افواج نے آئزن کے مقام پر حملہ کیا۔ اب اٹلی کے محاذ پر 12 مئی کو دریائے ایسونزو کی

دسویں لڑائی کا آغاز ہوا۔ حملوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اٹلی کی جانب سے دو طرفہ لڑائیوں کا آغاز کیا جائے۔ ایک کارروائی بین سیزا کی آڑ سے، جبکہ دوسری کارسو کے مقام سے۔

حملوں کا آغاز گزشتہ سال کے برانگیختہ کرنے والے حملوں کی طرز پر کیا گیا۔ تاہم اس بار آسٹریا۔ ہنگری کی جانب سے شدید مزاحمت اور بھرپور دفاعی لائن برقرار رکھی گئی۔ 28 مئی تک اٹلی کی فوج کو بھاری جانی و مالی نقصانات اُٹھانے پر حملہ ترک کرنا پڑا۔ 4 جون کو آسٹریا۔ ہنگری کی جانب سے ایک اچانک جوابی حملہ کیا گیا۔ یہ جوابی حملہ اچانک اور انتہائی شدید ہونے کے باعث اٹلی کی افواج کو بھاری جانی و مالی نقصان کے بعد فتح کیے ہوئے علاقوں سے پیچھے ہٹانے کا باعث بنا۔ آخر کار لڑائی کا اختتام 8 جون کو ہوا۔

اب جنرل کیڈورنا نے محدود پیمانے پر ٹرینٹینو کے علاقے میں حملوں کا آغاز کر دیا۔ یہ لڑائی 10 جون سے 29 جون تک جاری رہی۔ ابتدائی طور پر وہاں اٹلی کی افواج کو معمولی کامیابی حاصل ہوئی مگر یہ محاذ بھی اٹلی کے جنرل کیڈرونا کے لیے ندامت کا باعث بنا۔ یہاں بھی اٹلی کے نقصانات خطرناک حد تک زیادہ ہو جانے کے باعث لڑائی کو ختم کرنا پڑا۔

اب وقت تھا کہ کیڈورنا مزید حملے کیے بغیر اپنی بچی کھچی افواج کو مجتمع کرتے ہوئے اُن کے حوصلے اور عزم کو ازسرِ نو جوان کرتا اور فوج منظم کرنے کے بعد کسی دیگر کارروائی کا اعادہ کرتا۔ مگر اتحادیوں کی جانب سے مسلسل ایک مطالبہ چلا آ رہا تھا۔ کہ مغربی محاذ پر جرمن افواج کو فتح سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ اٹلی آسٹریا۔ ہنگری پر بھرپور حملہ کرے تاکہ آسٹریا۔ ہنگری کی مدد کو جرمن افواج کو مغربی محاذ چھوڑ کر آنا پڑے۔

اِس صورتِ حال میں کیڈورنا نے گیارہویں دریائے ایسونزو کی لڑائی کا آغاز کیا۔ اپنی تمام فوج اسی محاذ پر مجتمع کر لینے کے بعد اِس محاذ پر قبل ازیں اتنی زیادہ فوج کبھی بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ 51 ڈویژن اور 5200 توپ خانہ۔ حملے کا آغاز 19 اگست کو ہوا۔ دوسری آرمی کو بین سیزا کی سطح مرتفع پر قابض ہونا تھا۔ جو ٹارنووا پر قبضے کے لیے دروازے کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ تیسری آرمی کو کاسو پر قابض ہو کر ہرمیدا پر جھپٹنا تھا۔ اِس کے علاوہ محفوظ دستوں اور اِن آرمیوں کی جانب سے شمال میں ٹالمینو تک دشمن کی توجہ اصل محاذ سے ہٹانے کے لیے حملے لیے جانے تھے۔

تیسری آرمی کے حملے بری طرح ناکام ہو گئے۔ آسٹریا۔ ہنگری کی جانب سے

ایک زوردار جوابی حملے نے ایک بار پھر اٹلی کی افواج کو سطح مرتفع کی ڈھلوان پر نیچے کی جانب لڑھکنے پر مجبور کردیا۔ جبکہ دوسری آرمی کے ضدی اور خودسر کمانڈر جنرل لوگی کیپیلو نے اصل ہدف کی بجائے توجہ بٹانے والے حملوں کو ہی بنیادی مقصد بنالیا اور حملے کے ناکام ہوجانے کے باوجود بھی اپنی خودسری پر قائم رہا اور حملے جاری رکھے۔ جس سے اٹلی کی افواج کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑے۔

اب صرف محفوظ فوج ہی بچی تھی۔ جسے دیگر فوج کے ساتھ مل ایک بھرپور حملہ کرنا تھا۔ مگر اس نئی صورتِ حال میں محفوظ فوج کو تنہا میدان میں اتر کر کارروائی کرنا تھی۔ اِس حملے میں علاقائی لحاظ سے اٹلی کی فوج کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ تاہم بنیادی مقاصد کسی طرح بھی حاصل نہ ہوسکے۔ ایک بار پھر اٹلی کو بھاری جانی نقصان اُٹھانے پڑے۔

اب اٹلی کی فوج کی حالتِ زار انتہائی ابتر ہوچکی تھی۔ وہ بری طرح شکست خوردہ اور بے بس نظر آرہے تھے۔ اُن کے مورال بری طرح گرچکے تھے۔ وہ بے باکانہ انداز سے غیر جانب دار رہنے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ اندرونِ ملک، بیرونِ ملک اور محاذِ جنگ میں، ہر جگہ یہ شکست خوردگی کی کیفیت عام تھی۔

1917ء کی کیپوریٹو کی لڑائی

ایک طرف تو اٹلی کی فوج میں شکست خوردگی کا عالم تھا۔ دوسری جانب آسٹریا۔ ہنگری کی فوج بھی بری طرح تھکاوٹ سے چور تھی۔ شکست خوردی اور مسلسل جنگ کی چکی نے فوج، عوام اور حکومت سب کو ہی اپنی حیثیت کا پتا دے دیا تھا۔ اب وہ کسی قسم کے حملے کو روکنے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے۔ اور جنگ کا تکلیف دہ کام جرمنی کے ذمے لگا کر وہ اِس سے دست بردار ہونا چاہتے تھے۔

آسٹریا۔ ہنگری کی حکومت نے جرمن اعلیٰ حکام سے درخواست کی کہ وہ رومانیہ اور روس کے محاذ کو سنبھالیں جبکہ وہ اٹلی کی افواج کے حملے کا دفاع کرسکے۔ جرمن حکام سوچ رہے تھے کہ مغربی محاذ پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اٹلی کو ایک بھرپور حملے میں مسخر کرکے جنگ سے دستبردار کردیا جائے۔ اور اِس مقصد کے لیے آسٹریا۔ ہنگری اپنے دفاع اور ملکی سالمیت

کے لیے زیادہ وزن اُٹھاتے ہوئے بھرپور تیاری سے حملہ آور ہوں۔

اِس مقصد کے حصول کے لیے جرمن اور آسٹریائی فوج کے اشتراک سے ایک مشترکہ چودھوی آرمی تشکیل دی گئی۔ اِس آرمی میں سات (7) جرمن ڈویژین شامل تھے۔ اِس جرمن فوج میں مشہور ''الپین کور'' (کوہستانی کور) بھی شامل تھا۔ جبکہ باقی آٹھ (8) ڈویژن فوج آسٹریا۔ہنگری کی تھی۔ اس آسٹریائی۔جرمن فوج کی قیادت مغربی محاذ کے جنرل آٹو وان بلو کو سونپی گئی۔

18 ستمبر تک جنرل کیڈورنا کو معلوم ہو چکا تھا کہ جرمن اور آسٹریا۔ہنگری کی مشترکہ افواج لازماً اٹلی پر ایک زوردار حملہ کریں گی۔ اُس نے اسی روز جنرل کیپیلو کی دوسری اور جنرل ایمانویل فلیبر کی تیسری آرمی کو دریائے ایسونزو سے کچھ پیچھے مضبوط دفاعی صف بندی کرنے کی ہدایت کی۔ اور خود دیگر محاذوں کے معائنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

دوسری آرمی کے جنرل کیپیلو نے اپنی جارحانہ عادت کے باعث دفاعی انداز سے مورچہ بندی کرنے کے بجائے، دشمن پر جارحانہ انداز سے حملے کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ٹالمینو کے مقام سے حملہ کرنے کے دوران وہاں تعینات فوج کے کمانڈر نے اچانک جنرل کیڈورنا کو دریائے ایسونزو کے محاذ پر شدید کمک کی ضرورت کی استدعا کی، جس پر جنرل کیڈورنا جنرل کیپیلو کی بلاوجہ فوجی محاذ آرائی کے باعث فوری کمک روانہ کرنے کے قابل نہ تھا۔ بعد میں معاملہ تاخیر کے باعث اٹلی کی افواج کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

24 اکتوبر کی صبح سے کچھ دیر قبل آسٹرو۔جرمن چودھویں آرمی کی جانب سے اٹلی کی افواج پر پہلے گیس اور پھر بھاری گولہ باری کی گئی۔ گیس ماسکس نے کسی قدر اٹلی کی فوج کی حفاظت کی مگر پیش قدمی بہر حال نہ کرنے دی۔ 8:00 بجے جنرل بلو کی چودھویں آرمی نے ٹالمینو سے پلیزو کی جانب پیش قدمی شروع کی۔ اُس کی 15 ڈویژن فوج کے مقابلے میں اٹلی کی 25 ڈویژن فوج پر مشتمل دوسری آرمی جنرل کیپیلو کی قیادت میں سرگرمِ عمل تھی۔

جرمن جنرل کی قیادت میں آسٹرو۔جرمن فوج نئی جنگی تکنیک سے بڑھتی ہوئی اٹلی کی فوج کو اپنے قطر میں لیتے ہوئے زوردار حملے کرتی ہوئی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اِس نئے انداز سے اٹلی کی صفِ اوّل کے سپاہی گھبرا گئے اور پسپا ہونے لگے۔ 25 اکتوبر کی شام تک اٹلی کی صفِ

اوّل بری طرح تباہ ہو چکی تھی اور پسپائی ایک لازمی امر کی طرح نظر آنے لگی تھی۔

جنرل کیڈورنا نے پسپائی کا آرڈر کرنے میں مزید دو (2) دِن لگا دیے۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ اٹلی کی افواج پسپا ہوتے ہوئے دریائے ٹاگلیامینٹو کے پیچھے اپنے قدم جمانے کا موقعہ بھی گنوا بیٹھی اور دشمن نے اِس قدر بھگ دڑ مچادی کہ فوری پسپائی میں دفاعی پوزیشن میں آنا اُن کے لیے ناممکن ہوگیا۔ 4 نومبر کو جنرل کیڈورنا نے اپنی فوج کو مزید پسپا ہوتے ہوئے دریائے پی ایو کے دوسرے کنارے مورچہ بند ہونے کی ہدایت کی۔

اِس پسپائی میں کئی دستے اپنی فوج سے کٹ گئے۔ تاہم ایسونزو کے سوار دستے دیگر بچھی کھچی فوج کے ہمراہ 10 نومبر تک دریائے پی ایو کے دوسرے کنارے مضبوط دفاعی پٹی تک پہنچ کر مورچہ زن ہوگئے۔ یہاں جنرل کیڈورنا کو اپنے منصب سے ہٹا کر اُس کی جگہ جنرل آرمینڈو ڈیاز کو اٹلی کی فوجی قیادت سونپ دی گئی۔

آسٹرو۔ جرمن افواج جو 50 ڈویژن فوج تک مجتمع ہو چکی تھیں اپنی پیش قدمی کے باعث بڑھتے ہوئے محاذ کے علاقے میں اپنے پرزور حملوں کی شدت اور انجینئرنگ کی ضروریات کی بروقت تیاری کا سلسلہ برقرار نہ رکھ سکی۔ مزید 11 ڈویژن برطانوی وفرانسیسی فوج بھی اٹلی کی امداد کے لیے دوڑی ہوئی میدانِ جنگ میں پہنچ گئی تھی۔ اور اٹلی کے نئے چیف آف سٹاف نے چوتھی اور تیسری آرمی کو محاذ کی صفِ اوّل پر لاتے ہوئے بکھری ہوئی دوسری آرمی کو عقب میں ازسرِ نو منظم ہونے کا موقعہ بھی دے دیا تھا۔

تاہم اٹلی کی میدانِ جنگ میں مصروف مجموعی 65 ڈویژن فوج میں سے صرف 33 ڈویژن ہی لڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ جبکہ 5 ڈویژن فوج لڑنے صرف معمولی استعداد کی حامل رہ گئی تھی۔ اِس ساری صورتِ حال میں آسٹرو۔ جرمن فوج نے 26 دسمبر تک دریائے پی ایو کو پار کر کے دشمن کی صفوں میں شگاف ڈالنے اور انہیں تہس نہس کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

320000 فوجیوں کے نقصان اور ہزاروں بندوقوں اور مشین گنوں کے چھن جانے کے باوجود کیپوریٹو کی لڑائی جسے بعض اوقات دریائے ایسونزو کی بارھویں لڑائی بھی کہتے ہیں، اپنے ابتدائی ایام میں اٹلی کی فوج، عوام، حکومت اور معیشت کی کمر توڑ رہی تھی، اب دشمن کی افواج کے

سامنے بہادری سے سینہ سپر ہونے اور ''گراپا کی پہاڑی'' کو کسی بھی صورت دشمن کے حوالے نہ کرنے پر ایک بار پھر پُرعزم، باحوصلہ اور جواں ہمتی کے ساتھ سر اُٹھائے میدان میں ڈٹ گئی تھی۔

کیپوریٹو کی لڑائی کے آغاز اور انجام میں بہت فرق آچکا تھا۔

پہلے اٹلی کی فوج شکست خوردہ اور کم ہمتی کا شکار تھی۔ مگر طاقت ور دشمن کی افواج کے سامنے اُس کی ہزار کوششوں کے باوجود صرف ایک پہاڑی پر اُسے قدم نہ جمانے دینے کی حقیقت نے انہیں نڈر اور بہادر کر دیا تھا۔ اب وہ دشمن کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ازسرِ نو اپنے علاقوں کے حصول کے لیے پُرعزم ہو رہے تھے۔ اب اٹلی میں ہر لحاظ سے بہتری آ رہی تھی۔

ترکی کے محاذ

جنرل موؤد کو برطانوی اعلیٰ حکام کی جانب سے بغداد پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اِس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ اپنی ترسیل و سپلائی کی لائن کو بہرصورت محفوظ رکھا جائے۔ اور اِس لحاظ سے وہ خوش قسمت رہا کہ اسے ابتدائی طور پر 45 اور بعدازاں 64 چھوٹے دریائے بحری جہاز فراہم کر دیے گئے۔ اِس طرح اُس کی سپلائی لائن بالکل محفوظ اور بروقت ہو گئی۔

اب اُس نے کٹ پر قبضے کی کوشش کی۔ کٹ برطانوی افواج کے لیے ایک مشکل ہدف بن چکا تھا۔ جنرل موؤد نے 17 فروری کو کٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ترک افواج کی جانب سے بے جگری سے لڑنے پر کٹ پر حملے کو ختم کرنا پڑا۔ تاہم 5 دِن بعد 22 فروری کو کٹ پر بھاری بمباری اور گولہ باری کی گئی کہ کٹ کا شہر تباہ و برباد ہو گیا اور راکھ و مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ اب جنرل موؤد مارچ کے وسط میں اپنی فوج کو اِس قابل پاتا تھا کہ وہ بغداد پر کامیاب حملہ کر سکے۔

بغداد کی جانب فوری پیش قدمی کرتے ہوئے العزیزیہ کے مقام پر ترک افواج کی سخت مزاحمت کے باعث اسے رکنا پڑا۔ جنرل موؤد نے اپنی اور پورے علاقے میں موجود ترک فوج کا موازنہ کیا۔ ترک کی فوج کی مجموعی تعداد 35000 ہزار تھی۔ جبکہ جنرل موؤد کی قیادت میں 120000 فوجی بھاری زمینی توپ خانے، جنگی طیاروں اور چھوٹے دریائے جہازوں پر مشتمل تھی۔ جو دشمن سے کئی گنا زیادہ تھی۔

اب اُس نے دشمن پر حملوں کا منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کے تحت اس نے اپنی فضائیہ،

توپ خانہ اور دریائی بحری جہازوں کے ذریعے دشمن کی صفوں اور مورچوں پر بھاری گولہ باری کروائی۔ اور گولہ باری کی آڑ میں اپنی زمینی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ ترک فوج اِس شدید حملے سے نہ سنبھل سکی اور آخرکار 11 مارچ کو دیالا پر حملہ آور ہوتے ہوئے جنرل موؤ نے بغداد پر قبضہ کرلیا۔ اور 9000 فوجیوں کو قیدی بنالیا۔

غزہ کی پہلی لڑائی

مارچ 1917ء میں جنرل مرے آٹھ ماہ کی کٹھن اور دشوار گزار پیش قدمی کے بعد اِس قابل ہوگیا تھا کہ وادیٔ سنائی سے ترک افواج کو دھکیلتے ہوئے فلسطین کی سرزمین پر اپنی فتوحات کے لیے قدم بڑھا سکے۔ اب اُس نے فلسطین پر باقاعدے حملے کے سلسلے میں پہلے غزہ پر قبضے کے پیش قدمی کی۔ 26 مارچ کو حملے کا اغاز کیا گیا۔ اِس وقت برطانوی فوج 16000 پیادہ اور 6000 سوار سپاہوں پر مشتمل تھی۔ اِس فوج کے مقابلے میں ترک فوجی دستے کی تعداد صرف 4000 تھی۔

اِس حملے کا ایک اور جغرافیائی مقصد ترکی کو میسوپوٹامیا اور جزائرِ عرب، دو حصوں میں تقسیم کردینا بھی تھا۔ لیکن اصل ہدف ترکی میں انتشار کی فضا پیدا کرتے ہوئے مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی کے کسی وقت بھی پرجوش ہوجانے کے باعث مغربی اور اسلام دشمن قوتوں کے لیے شدید نقصاندہ ثابت ہونے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اِس قوت کا خاتمہ اور وہاں اپنی من مانی کرنے والی یہودی حکومت کا قیام تھا۔

غزہ پر پہلی لڑائی میں برطانوی فوج کی قیادت کی ذمہ داری جنرل مرے نے اپنے ماتحت جنرل ڈوبل کو سونپی تھی۔ جس کے پاس 3 ڈویژن پیادہ فوج جبکہ 2 ڈویژن سوار دستے جنہیں ''صحرائی ستون'' کا نام دیا گیا تھا، چیٹ ووڈ کی قیادت میں موجود تھے۔ جزائرِ سنائی کی طرح اِس جنگ میں بھی پانی کی ترسیل انتہائی ضروری اور جنگی لحاظ سے فتح کے لیے لازمی عنصر تھی۔ دوسری جانب غزہ کے اردگرد صحرائی جھاڑیاں ایک فصیل کا کام دیتی تھیں۔

26 مارچ کی صبح دھند ہونے کے باوجود حملہ آور افواج نے بلارکاوٹ غزہ شہر کو گھیرے میں لے لیا۔ حملے کی ترتیب یہ تھی کہ پیادہ فوج کو عقب میں رہتے ہوئے دفاعی ذمہ داری نبھانی تھی جبکہ سوار فوج نے حملہ اور پیش قدمی کرنی تھی۔ حملہ بہت شدید نوعیت کا تھا۔ سواروں کو اپنے گھوڑوں

کے پانی پلانے کے لیے پانی میسر نہ تھا۔پانی کے حصول کا صرف ایک ہی ذریعہ غزہ کے اندرونی تالاب تھے۔

10000 گھوڑے پیاس کی شدت سے بلبلا رہے تھے۔ برطانوی سوار فوج نے آگے بڑھتے ہوئے ایک بھرپور حملہ کیا۔ چند دستے قریبی تالاب تک پہنچ گئے اور اپنے جانوروں کو پانی بھی پلانے لگے مگر اسی دوران چیٹ ووڈ نے سوار دستوں کو پسپائی کا حکم دیا اور اگلے دن تک حملہ مؤخر کر دیا۔ اِس وقت یہ انتہائی غلط فیصلہ تھا۔ کیونکہ سوار دستے تھوڑی اور جدوجہد کر کے شہر پر قابض ہو سکتے تھے۔

دوسرے دِن تھکی ہاری افواج نے دوبارہ بڑی شدت سے حملے جاری رکھے مگر کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اور ترک فوج نے برطانوی افواج کو بڑی قوت سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ جنرل مرے نے اپنی ہائی کمانڈ کو ٹیلی گراف کیا کہ دشمن کو تین گنا زیادہ نقصان ہوا ہے مگر ابھی محاصرہ جاری ہے وہ جلد ہی صورتِ حال پر قابو پالے گا۔ تاہم اِس پیغام کے کچھ ہی دیر بعد برطانوی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔ برطانوی فوج کے نقصانات کی تخمینہ 4000 تھا جبکہ ترک فوج کو 2400 کا نقصان ہوا تھا۔

غزہ کی دوسری لڑائی

اِس کے بعد 19-17 اپریل 1917ء میں جنرل ڈوبل نے اپنے ایک ڈویژن سے دو (2) میل لمبے فرنٹ پر حملہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ ترک فوج کی دفاعی پوزیشن بھی اب پہلے جیسی نہ رہی تھی۔ وہ زیادہ خندقیں کھود چکے تھے اور غزہ شہر مکمل طور پر خندقوں کے گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔

اِس حملے کے لیے نہایت مدبرانہ اور باہمت منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ بروقت اور مکمل عملی اقدامات کیے جانے بھی از بس ضروری تھے۔ مگر برطانوی فوج اِس سلسلے میں مکمل طور پر ناکام رہی اور حملہ بالکل ہی فیل ہو گیا۔ اگرچہ اِس جنگ میں فرانس کے محاذ کے علاوہ پہلی اور آخری بار اسی لڑائی میں برطانوی افواج نے ٹینک استعمال کیے تھے۔

برطانوی فوج کو 6500 نفوس کا شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ اِس صورتِ حال سے آگاہی

پر جنرل موور کی جگہ مغربی محاذ پر برسرِ پیکار تیسری آرمی کے جنرل ایڈمونڈ ایلن بے کو مامور کر دیا۔
غزہ کی دوسری لڑائی میں ترک افواج کے نقصانات 2000 رہے۔

غزہ کی تیسری لڑائی

نئے کمانڈر کی قیادت میں فلسطین کے محاذ پر برسرِ پیکار فوج فوری طور پر اپنے عزم اور حوصلے کو جوان کرنے میں کامیاب رہی۔ وہاں موجود تین (3) ڈویژن فوج میں بھی برطانوی حکام کی جانب سے اضافہ کر دیا گیا اور چار (4) ڈویژن فوج مزید بھجوا دی گئی تھی۔ اب جنرل ایلن بے کے منصوبے کے مطابق غزہ اور بیر شیبا پر متوازی حملے کیے جانے تھے۔

اِس مقصد کے لیے اُس نے اپنی آرمی کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے بنیادی توپ خانہ، سوار اور پیدل فوج کو غزہ پر حملہ کرنے کے لیے جبکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوج کو مشرق کی جانب سے بیر شیبا اور وہاں کے کنویں اپنے قبضہ میں لینے کے لیے حملہ آور ہونے کا حکم دیا تھا۔

بیر شیبا کے حملے کا آغاز 31 اکتوبر کو ہوا۔ یہ بہت ہی اہم محاذ تھا کیونکہ سوار دستوں کی پیش قدمی کے لیے پانی کی موجودگی انتہائی اہم تھی۔ اور ممکن تھا کہ اگر ترک فوج زیادہ دیر تک برطانوی فوج کا حملہ روک لے تو اسے کنویں تباہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی اور اِس طرح ساری کوشش ہی بیکار چلی جاتی۔

مگر ترک کمانڈر ایسا کرنے میں ناکام رہے اور خوش قسمتی سے جنرل ایلن بے کی فوج بیر شیبا پر آسانی سے قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب ایلن بے نے سمندر کے کنارے کی طرف توجہ دی۔ اِس خصوصی مہم کا مطلب غزہ میں لڑنے والی ترک فوج کو اس کے عقب سے جدا کر دینا تھا۔ اِس مہم میں برطانوی اور فرانس کی طاقت ور بحریہ نے اپنی دور مار توپوں اور گنوں سے ترک افواج کے عقب کو خالی کرتے ہوئے غزہ شہر کو دیگر علاقے سے کاٹ دیا۔

نئی صورتِ حال میں غزہ بالکل ہی دشمن کے رحم و کرم پر تھا۔ اسی دوران انور پاشا نے کوشش کی کہ 14 ڈویژن ترک اور 6000 جرمن فوج کی فراہمی کے بعد بغداد پر بھرپور حملہ کر کے دشمن سے چھین لیا جائے۔ مگر یہ تجویز قابلِ عمل نہ تھی۔ کیونکہ اتنی زیادہ فوج کو اِس قدر عجلت میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔

تاہم جنرل فالکن ہائنز فوری طور پر فلسطین کے محاذ کی جانب بڑھا۔ اُس نے بروقت جنرل ایلن بے کے کھلے پہلو پر زوردار حملہ بھی کیا مگر فوجی قوت کی کمی کے باعث خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہوئے اور آخر کار 7 نومبر کو غزہ شہر پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا۔

جنرل فالکن ہائنز نے جنرل ایلن بے کی پیش قدمی میں بہت حد تک رکاوٹوں کا سلسلہ برقرار رکھا۔ اور مسلسل جوابی حملوں سے برطانوی فوج کو بوکھلاہٹ کا شکار رکھا۔ مگر عدد اور اسلحہ کی برتری کے باعث جنرل ایلن بے بہر حال پیش قدمی کرتا رہا۔ اور 16 نومبر کو اُس نے جافا پر قبضہ کرلیا۔

اب مزید پیش قدمی کے دوران برطانوی افواج نے مقدس شہر یروشلم پر قبضہ کرنے کے لیے تقدس کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے 9 دسمبر کو جافا روڈ پر یروشلم کی گلیوں میں قتل وغارت گری اور خونریزی کا بازار گرم کیے رکھا۔ اب ترک حکومت کی جانب سے شہر کے تقدس کو مزید پامال ہونے سے بچانے کے لیے شہر برطانوی حکام کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کے تحت 11 دسمبر کو جنرل ایلن بے نے یروشلم میں قدم رکھا اور شہر میونسپل اتھارٹیز کے حوالے کر دیا گیا۔

جنرل فالکن ہائنز نے ایک بار پھر اپنی بچی کھچی فوج مجتمع کر کے یروشلم شہر کو برطانوی استعمار سے چھڑانے کی کوشش۔ 26 سے 30 دسمبر تک ترک افواج نے بڑی دلیری اور جوانمردی سے حملے کیے۔ مگر اپنے سے چار گنا زیادہ افرادی اور اسلحہ کے حامل دشمن کی فوج کو پیچھے نہ ہٹا سکے۔ یروشلم میں برطانوی فوج کے کمانڈر چیٹ ووڈ نے جوابی زوردار حملہ کر کے ترک افواج کو 8 میل پیچھے دھکیل دیا۔

فلسطین کی مہم کے دوران ترک افواج کے مجموعی نقصانات 25000 رہے جبکہ اِن میں سے 12000 جنگی قیدی بنائے گئے۔ دوسری جانب برطانوی فوج کو 18000 کے نقصانات برداشت کرنے پڑے۔

عرب محاذ پر برطانوی حکام نے شریف حسین کو ذمہ داری سونپ رکھی تھی کہ ترک حکومت سے غداری کرے۔ 1917ء کے دوران عرب محاذ پر قابلِ ذکر یہی رہا کہ شریف حسین کے بیٹوں نے ترک فوج کو الجھائے رکھا۔ اور حجاز ریلوے پر متعدد حملے کر کے ترک رسل و ترسیل

کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ برطانوی نگران ٹی ای لاؤرینس کو مکمل طور پر شریف حسین کے بیٹے فیصل کے ساتھ رہنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

اسی طرح کاکیشیا کے محاذ پر جنرل یوڈنیچ کی قیادت میں لڑنے والی مضبوط فوج بھی اُس وقت خاموش ہوگئی جب ولادی میر لینن اور لی آن روس میں واپس آئے۔ کیونکہ کاکیشیا میں ان کی واپسی پر سب سے زیادہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اِس لیے لینن نے آتے ہی فوج کے تمام عہدے داران کو برطرف کر دیا۔ اب فوج میں قانون اور ضابطے کی کمی ہوگئی اور آفیسران اپنے اختیارات استعمال کرنے سے قاصر رہے۔ خود جنرل یوڈنیچ نے گھر کا راستہ لیا۔

اِس طرح یہ محاذ بھی ترک افواج کے لیے بالکل ہی خاموش ہوگیا۔ اور جنگ کے اختتام تک ترک افواج آرمینیا اور جارجیا کے علاقوں پر دندناتے رہے۔ آرمینیا اور جارجیا کے دورانِ جنگ ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد پر مؤرخین شدید اختلافات ہیں۔ تاہم اکثر امریکی مؤرخین کے مطابق کم از کم 5 لاکھ افراد کا قتلِ عام کیا گیا۔

بحری محاذ

سال 1917ء میں امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے سے سب سے زیادہ تقویت بحری محاذ پر اتحادیوں کو نصیب ہوئی۔ امریکہ نے میدانِ عمل میں کودتے ہی جرمنی کی دیگر ممالک سے بحری تجارت کی بندش کے لیے مناسب اور فعال کردار ادا کیا۔ جو قبل ازیں اتحادی ممالک کے لیے ممکن نہ تھا۔

اِس تجارتی بندش کے باعث مرکزی قوتوں کو بھاری مشینری، رسد اور دیگر جنگ کے لوازمات کی دستیابی میں شدید مسائل کا سامنا تھا۔ تاہم جرمنی کے لیے صرف بحری تجارت کی بندش ہی شکست کا باعث نہیں تھی۔ جرمنی کو شکست دینے کے لیے دیگر کئی محاذوں پر بھی بڑی دلیری اور جوانمردی سے لڑتے ہوئے فتح پانے کی ضرورت تھی۔

جرمنی کی جانب سے بحری تجارت کی بندش کے جواب میں آبدوزوں کی لڑائی کا آغاز کیا گیا۔ اِس کا مقصد برطانیہ کی بحری تجارت کو بند کر کے رکھ دینا تھا۔ برطانیہ جس کا تمام تر انحصار بحری تجارت پر تھا، کے لیے بحری تجارت کی بندش کے بعد یقیناً جنگ کو جاری رکھنا انتہائی مشکل

ہو جاتا۔ اِس طرح جرمن بحریہ اگر اپنے آب دوزوں کے حملوں میں ایک سال تک کامیاب ہو جاتی تو جنگ کے نتائج موجودہ اور معلوم نتائج سے کہیں مختلف ہوتے۔

دراصل جرمن حکومت اور نیوی کے درمیان ایک مسلسل تناؤ کی سی کیفیت چل رہی تھی۔ ایڈمرل ترپز جارحانہ اور سخت حملوں کے ذریعے دشمن پر جلد فتح پانے کے فلسفے پر چلتا تھا۔ جبکہ قیصر ولیم دوم اور جرمن چانسلر سفارتی تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے جنگ میں فتح کے آرزومند تھے۔ اِس کھینچا تانی میں ایڈمرل ترپز کو 16 مارچ 1916ء کو اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اس کی جگہ تعینات ہونے والے ایڈمرل شکیر نے آب دوزوں کے استعمال اور بین الاقوامی بحری تجارت کے قانون کو توڑنے سے انکار کر دیا۔

تاہم جرمنی کے خلاف برطانیہ اور فرانس کے ساتھ امریکہ کے بھی شامل ہو جانے سے جرمن عوام نے برطانیہ کی شکست کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کرنے پر زور دیا۔ برطانوی ٹی وی چینلو کے بہت زیادہ پراپیگنڈے کے باعث امریکہ کی عوام نے جرمنی کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی فیصلے کے جواب میں جرمن عوام نے بھی پرزور انداز میں برطانیہ کی بحری تجارت کی بندش اور آخر کار شکست کے لے ہر ممکن حربے کے اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

آبدوزوں کی جنگ کے اعلان کے بعد برطانوی عوام کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ 1917ء کے موسم بہار میں تو یہ کیفیت ہوگئی کہ برطانوی بندگاہوں سے روانہ ہونے والے ہر چار (4) جہازوں میں سے صرف ایک جہاز ہی واپس بندگاہ تک پہنچ پاتا تھا۔ اور برطانوی ایڈمرل جیلیکو کو یہ ماننا پڑا تھا کہ ایسے حالات میں جنگ نومبر میں ختم ہو سکتی ہے۔

جرمن بحریہ کی جانب سے آبدوزوں کی تعمیر و مرمت پر بہت خطیر رقم خرچ کی جانے لگی۔ اتحادی ممالک نے بحری جہازوں کو کاروانوں کی صورت میں روانہ کرنا شروع کر دیا۔ اب جرمن بحریہ کی جانب سے بھی تمام آبدوزوں کو کھلے سمندروں میں جھونک دیا گیا۔ اِس طرح موسمِ خزاں تک جرمن آبدوزوں کی تباہی کا تناسب بھی بہت بلند ہو گیا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، اتحادی افواج آبدوزوں کی موجودگی اور جگہ کا تعین کرنے کی ٹیکنالوجی کے حصول میں کوشاں رہیں اور کسی قدر اِس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئیں۔ اِس وجہ سے جرمن آبدوزوں کے عملے کے بڑھتے ہوئے جانی نقصانات اور آبدوزوں کی بڑے پیمانے پر

تباہی نے جرمن بحریہ کو مزید نقصان پہنچایا۔

اِس نئی صورتِ حال میں امریکی بحریہ کو اپنے 20 لاکھ فوجیوں کو فرانس پہنچانے کا موقعہ مل گیا۔ جو دراصل اتحادیوں کی فتح کا ضامن بنا جبکہ جرمنی کی دشمن بڑھانے والی حکمتِ عملی نے اسے نہ صرف فتح سے دور کر دیا بلکہ ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔

فضائی محاذ

جنگِ عظیم اوّل کے دوران فضائی جنگ کی انتہائی ابتدائی سٹیج تھی۔ جنگ سے صرف دس (10) سال قبل ہی جہازوں کی پہلی پرواز ہوئی تھی۔ اب فوراً بعد ہی جنگ کے چھڑ جانے پر جنگی جرنیلوں نے اسے بہتر طریقہ جنگ کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم فضائی حملوں نے اپنی حیثیت کا اعتراف کروالیا۔

جنگِ عظیم اوّل میں جہاں فضائی جنگ اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی وہیں جنگ کی ضروریات اور اُس کے مطابق فضائی جنگ کی تشکیل و منصوبہ سازی کے مرحلے نے بھی پروان چڑھنا شروع کیا۔ جنگ میں شریک ملکوں میں جرمنی، برطانیہ اور فرانس نے فضائی جنگ میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ روس، ترکی آسٹریا۔ ہنگری اور امریکہ نے فضائی جنگ میں معمولی کردار ادا کیا۔

جرمنی اپنی بری اور بحری فوجی بالادستی اور بہترین صورتِ حال کی طرح فضائی جنگ کی مہارت، مشین سازی اور فضائی بھرپور حملہ کرنے کی صلاحیت میں سب سے بہتر و ممتاز رہا۔

جنگ کے ابتدائی چار (4) سال تک فضائی حملوں کی اصل افادیت سامنے نہ آسکی اور فضائی حملوں کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں بری فوج کے جرنیلوں نے کوئی مثبت رائے قائم نہ کی۔ تاہم طیاروں کی رفتار، جنگی سامان لے جانے کی صلاحیت اور بلاواسطہ طور پر دشمن پر حملہ آور ہونے کی خاصیتوں میں خصوصی ترقی ہوئی۔

جرمنی، فرانس اور برطانیہ نے مغربی محاذ پر اپنی بری افواج کی مدد کے لیے لڑاکا طیاروں کا استعمال بھی شروع کیا۔ شروع شروع میں طیاروں سے دشمن کی پوزیشن کے بارے میں اطلاعات کی حد تک کام لیا جاتا تھا مگر بعدازاں اِن پر مشین گن نصب کر کے ایک گنر کو بھی بٹھا دیا

گیا۔ اب طیاروں کی ساخت میں ایک خاص تبدیلی لائی گئی۔ پائلٹ کے آگے گنر کے بیٹھنے اور مشین گن نصب کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تا کہ بلا رکاوٹ فائرنگ کا عمل جاری رہ سکے۔

1917ء کے وسط تک لڑاکا طیارے بہت حد تک اپنی بہترین جنگی صلاحیت کے باعث میدانِ جنگ میں اپنی ضرورت و اہمیت منوا چکے تھے۔ اٹلی کے خلاف کیپوریٹوں کی لڑائی میں جرمن فوج نے اپنی فضائیہ سے بھرپور کام لیا اور دشمن کے مورچوں پر فضاء سے حملے کرتے ہوئے اسے شدید نقصان پہنچایا۔

مغربی محاذ پر فریقین ایک دوسرے پر زمینی حملوں کے ساتھ ساتھ فضائی حملوں میں بھی پیش پیش تھے۔ اور وہاں فضائی حملوں کی ضرورت اور اہمیت انتہائی قطعی ہو گئی تھی۔ تاہم یہ مراحل ابھی بھی ابتدائی تھے طیاروں کی صلاحیت ابھی بھی جنگی زعما کے معیار کے مطابق کیے جانے کے لیے سر توڑ کوششیں کی جا رہی تھیں۔

سفارتی کوششیں

1916ء کے اختتام پر آسٹریا۔ ہنگری کی حالتِ زار انتہائی ابتری کا شکار ہو چکی تھی۔ دوہری سلطنت کے سربراہ بادشاہ چارلس اوّل نے اپنی ساس ماریہ اینٹونیہ کے ذریعے باربون پارما کے شہزادے سیکسٹس جو بیلجیم کی آرمی میں سروس کر رہا تھا کو اپنی جانب سے صلح کی شرائط پیش کر کے انہیں فرانس کے وزیرِ اعظم اور صدر کے پاس بھیجا۔ فرانس کے صدر پائن کیئر اور وزیرِ اعظم بری آنڈ نے اِس کوشش کو سراہا تاہم شرائط پر مزید بات چیت کے لیے سیکسٹس کو مارچ 1917ء کو واپس بادشاہ چارلس کے پاس روانہ کیا۔

اب فریقین کے نمائندوں نے ملاقات کی۔ فرانس کی جانب سے چند نکات پیش کیے گئے۔ جن میں الساس۔ لورین پر فرانس کے حق کو تسلیم کرنے، سربیا کی حسبِ سابق بحالی کے علاوہ علاقائی توسیع، بیلجیم کی آزاد خود مختار حیثیت کی بحالی اور روس کے قسطنطنیہ پر قابض ہونے کی بابت شرائط۔ یہ شرائط لے کر شہزادہ سیکسٹس نہ صرف آسٹریا۔ ہنگری کے بادشاہ چارلس کے پاس گیا بلکہ وہاں سے برلن میں بھی گیا جہاں وزیرِ خارجہ اور قیصر کے سامنے یہ شرائط پیش کیں۔

آسٹریائی حکومت نے اِن شرائط پر غور کرنے اور جرمنی سے رائے لینے کے لیے ہامی بھرلی تاہم جرمن حکومت کو یہ بتانے سے احتراض کیا کہ در پردہ وہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ گفت وشنید میں مصروف ہے۔ اسی دوران فرانس کے وزیرِ اعظم بری آنڈ کی جگہ الیگزینڈر ربی بوٹ مسند نشین ہوا۔ یہ شخص ظالم، جھگڑالو اور ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ باربون کے شہزادوں سے مخاصمت رکھتا تھا۔

اب صلح کی گفتگو برطانیہ کے علم میں لائی گئی۔ برطانیہ نے فرانس کے نئے وزیرِ اعظم کے ایما پر یہ نکات پیش کیے کہ جن اتحادیوں کو بڑے بڑے وعدوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کے لیے آمادہ کیا گیا تھا انہیں کیا مراعات پیش کی جا سکتی ہیں۔ اِس سلسلے میں اٹلی کا ذکر سب سے زیادہ اہمیت سے کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ صلح کی گفتگو کی بابت اٹلی کو بھی اعتماد میں لیا جائے۔

اٹلی نے صلح کی گفتگو کی بابت علم ہونے پر اپنے ساتھ کیے گئے معاہدہ لندن پر مکمل طور پر عمل درآمد کرنے پر زور دیا۔ اِس طرح عملی طور پر شہزادہ سیکسٹس کے ذریعے ہونے والی صلح کی گفتگو ناکام ہوگئی اور صلح کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

بعدازاں جرمنی میں رائخ سٹیگ میں مختلف پارٹیوں کی جانب سے ایک قرارداد پیش کی گئی جس کے مطابق جرمنی کے سفارتی محاذ پر امن کی گفتگو کی ضرورت اجاگر کی گئی مگر نئے جرمن چانسلر نے فتح کی امید پر اِس قرارداد کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے اِس کے خلاف خطاب کیا۔ اِس طرح یہ قرارداد اب وقت گزاری کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی۔

جون 1917ء میں پوپ بینیڈکٹ ویٹی کین پنج دہم (XV) نے مناسب وقت جانتے ہوئے شریکِ جنگ ممالک کی اندرونی صورتِ حال اور امن کے لیے رویوں کے مشاہدے کے لیے اپنے خصوصی ایلچی مونسیکو راو گینیو پیسیلی کو روانہ کیا۔ جس نے امنِ عامہ کے لیے شریکِ جنگ ممالک کی جانب سے آمادگی کے بارے میں رپورٹ دی۔ جرمنی کے بارے میں رپورٹ دیتے ہوئے پیسیلی نے بتایا کہ چانسلر تو اس سلسلے میں مثبت سوچ کا حامل ہے مگر قیصر اور اُس کے جرنیل ابھی جنگ بندی کی بابت سوچنا پسند نہیں کرتے۔ تاہم قیصر کو جنگ بندی پر مائل کیا جا سکتا ہے۔

ویٹی کین نے ان رپورٹس کی روشنی میں یکم اگست 1917ء کو ایک عوامی اپیل کی جس میں جنگ بندی اور امنِ عامہ کے قیام کی استدعا کی گئی اور تمام ممالک کو قیامِ امن کے لیے علاقائی

اور جغرافیائی معاملات میں رعایات دینے یا کم از کم قبل از جنگ کی صورتِ حال پر واپس آجانے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔

اتحادی ممالک کے ذرائع ابلاغ نے پوپ کی اپیل کے جرمنی کے زیرِ اثر ہونے کا خوب پرچار اور پراپیگنڈا کیا۔ امریکہ کے سوا باقی تمام اتحادی ممالک نے غیر عمومی جواب دیا۔ برطانیہ نے تو اپنے خفیہ پیغام میں بیلجیم سے جرمنی کی دستبرداری کے ساتھ ساتھ آئندہ جرمنی کے حملے کے سدِ باب کے لیے گارنٹی کی بنیاد پر قیامِ امن کے لیے مزید بات چیت کا عندیہ دیا۔

ویٹی کین نے اِس پیغام کی بابت جرمنی سے دریافت کیا تو جرمن اعلیٰ حکام کی اکثریت نے 11 ستمبر کو بیلجیم کے مسئلے پر متفق نہ ہونے کا فیصلہ دیا۔ اُن کا موقف تھا کہ وہ بیلجیم کی سرزمین واپس ہرگز نہ کریں گے۔ پوپ نے جرمن حکام کو ایک بار پر اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کی اپیل کی۔ اِس بار جرمن حکام نے اپنے جواب کو عوامی سطح پر مشتہر کر دیا اور کوئی تبدیلی نہ کی۔ اِس طرح قیامِ امن کے لیے کی گئی ایک اور کوشش ناکام ہوگئی۔

مجموعی صورتِ حال

1917ء میں مغربی محاذ پر فرانسیسی اور برطانوی افواج نے متعدد حملے کیے۔ اِن حملوں میں قابلِ ذکر پانچ حملے تھے۔ فرانس کی جانب سے 16 اپریل کو دریائے آئزن کے کنارے ایک بھرپور حملہ کیا گیا۔ جس میں جرمن افواج نے اپنی پوری قوت سے دفاع کیا۔ اِس لڑائی میں فرانسیسی افواج نے 23385 حملے کیے مگر ہر بار منہ کی کھائی۔ اِس لڑائی میں بڑے پیمانے پر ٹینکوں کو استعمال کیا گیا مگر جرمن افواج نے 200 سے زائد ٹینک تباہ کر دیے۔ یہ لڑائی فرانس کی ہائی کمان میں تبدیلی کا باعث بنی اور فرانسیسی فوج کا مورال بری طرح پست ہوا۔

فرانس کے دریائے آئزن پر حملے کے دوران جرمن فوج کی توجہ بٹانے اور اسے مصروف رکھنے کے لیے برطانوی فوج نے اریس کے مقام پر حملہ کیا۔ ایک عرصے تک جاری رہنے والی اِس لڑائی میں برطانیہ کی قیادت میں لڑنے والی کینیڈا کی فوج نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وِمی کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی فوج کو مزید کوئی کامیابی حاصل نہ ہونے پر

اِس حملے کو ختم کرنا پڑا۔

فرانسیسی افواج کے پست مورال کے باعث جرمن حملوں کے اندیشے اتحادی افواج کے سربراہان کی راتوں کی نیندیں حرام کیے ہوئے تھے۔ جرمن فوج کو حملوں سے روکنے اور فرانس کی شکست خوردہ فوج کو اپنے عزم کی بحالی کے لیے مکمل امن کا کچھ عرصہ درکار تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے برطانوی فوج کو اپنا حملہ مزید آگے بڑھانا پڑا۔

جنرل ہیگ فلینڈرز کی جانب متوجہ ہوا۔ اِس حملے کا ایک اور مقصد یہ بھی تھا کہ وہ بیلجیم میں سے جرمن فوج کو باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اِس طرح میسنز کے مقام پر ایک اور زبردست لڑائی لڑی گئی۔ جس میں برطانوی حکام نے میسنز کی پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ پسپا ہوتے ہوئے دشمن پر کاری ضرب لگانے کے وقت برطانوی قیادت میں تبدیلی کر دی گئی اور محاذ پر قیادت کے تبدیل ہونے سے جرمن فوج کو متوقعہ بھاری نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

اب برطانوی فوج پیرس کے مقام پر دشمن کی افواج کے سامنے صف آرا تھی۔ فرانس کی فوج کو ابھی مزید وقت درکار تھا۔ اِس لیے ضروری سمجھا گیا کہ برطانوی فوج پیرس پر تیسری لڑائی کا آغاز کرے۔ اِس لڑائی میں برطانوی فوج کو بہت زیادہ قربانی کے بعد تھوڑے سے اہداف حاصل ہوئے اور جنرل ہیگ پر شدید تنقید ہوئی۔

جنرل ہیگ پر مزید تنقید کیمبرائی کی لڑائی میں ہوئی۔ جب 500 ٹینکوں سے کیے گئے حملے کو جرمن افواج نے بہت خوبصورتی سے ناکام بناتے ہوئے برطانوی فوج کو نہ صرف پسپائی پر مجبور کر دیا بلکہ اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنی پہلی پوزیشن پر دھکیل دیا۔ اس کے بعد دورانِ سال برطانوی فوج اور فرانسیسی فوج کو جرمن فوج پر حملے کی جرأت نہ ہوئی۔

مشرقی محاذ اور ترکی میں کاکیشیا کا محاذ روس کے انقلاب اور دیوالیہ ہو جانے کے باعث اِس سال کے آخر تک مکمل طور پر خاموش ہو گیا۔ روس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے جنگ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور جرمنی کی شرائطِ جنگ کو مکمل طور پر ماننے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ جرمن افواج معاہدہ امن کی رو سے روس کے مفتوحہ علاقوں پر قابض ہو گئیں۔

اٹلی کے محاذ پر دریائے ایسونزو کی دسویں لڑائی میں اٹلی بھرپور حملے کے باوجود آسٹریا۔ ہنگری کی فوج کی طرف سے سخت مزاحمت اور شدید جوابی حملے کی وجہ سے اپنے گزشتہ

جنگوں میں مفتوحہ علاقوں سے محروم ہو گیا جن کی فتح کے لیے بہت بڑی قربانیاں دی گئی تھیں۔ اس شکست کے بعد اتحادی فوج کے اعلیٰ حکام کی فرمائش پر دریائے ایسونزو کی گیارہویں لڑائی کا آغاز بڑے پیمانے پر فوجی و تکنیکی برتری سے کیا گیا۔ لیکن اِس لڑائی میں بھی اٹلی کی فوج کو ہزیمت اور جنرل کیڈورنا کو سخت ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔

اب آسٹریا۔ جرمن فوج نے متحدہ طور پر اٹلی کو میدانِ جنگ سے باہر دھکیلنے کے لیے ایک بھرپور حملہ کیا۔ اِس حملے کو کیپوریٹو کی لڑائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جرمن جرنیل بلو کی قیادت میں جرمن اور آسٹریائی فوج نے بڑی مہارت، چابک دستی اور اعلیٰ جنگی تکنیک کے ساتھ دشمن کو بہت بڑی شکست دی اور دھکیلتے ہوئے دریائے پی ایو کے دوسرے کنارے جا کر دم لینے کا موقعہ دیا۔ اس وقت جرمن فوج اپنے 200 میل پھیلے ہوئے فرنٹ پر حملوں کی شدت برقرار نہ رکھ سکا اور افرادی قوت کی کمی کی وجہ سے اسے اپنے مطلوبہ مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔

ترکی میں برطانوی فوج فلسطین پر قابض ہو گئی اور بعد ازاں جزائرِ عرب اور ترک حکومت کے درمیان رسل و ترسیل اور رسد کے راستوں کو کاٹنے کی مہم شروع ہوئی۔ اِس مہم کے تحت حجاز ریلوے لائن کو تباہ کر دیا گیا۔ عمان، مصر، دمشق وغیرہ پر قبضہ کر لیا گیا اور برطانوی فوج اپنی فتح کے پھریرے لہراتے ہوئے انتہائی برق رفتاری سے ترکی کے اندر داخل ہوتی چلی گئیں۔

امریکہ کے میدانِ جنگ میں کود پڑنے سے پہلی بار اتحادی افواج نے جرمنی اور مرکزی ممالک کی بحری تجارت کی بندش کا اعلان اور عملی اقدامات کرنے شروع کیے۔ جوابی طور پر جرمنی نے آبدوزوں کی مہم کا آغاز کر دیا۔ یہ اِس قدر شدید اور نقصان دہ مہم تھی کہ ایک وقت پر برطانوی حکام کو اگلے چند ماہ میں اپنی واضح شکست نظر آنے لگی۔ مگر امریکہ فرانس اور دیگر اتحادی ممالک کی بروقت بحری امداد نے جرمنی کے حملے کو بے کار کر دیا۔

جنگِ عظیم اوّل کے دوران فضائی جنگ کو بتدریج اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ اِس سال جنگ میں بڑے پیمانے پر لڑاکا طیارے استعمال کیے گئے۔ ان کی رفتار، مضبوطی، استعمال اور حملہ کرنے کی صلاحیت میں بھرپور اضافے کیے گئے۔ تاہم ابھی فضائی جنگ کے لیے مزید محنت اور عرق ریزی کا کام کیا جا رہا تھا۔

سفارتی میدان میں اس سال امن کے قیام کے لیے متعدد کوششیں کی گئیں۔

آسٹریا۔ ہنگری، جرمن سیاسی جماعتوں اور پوپ ویٹی کین کی جانب سے قیامِ امن اور صلح کے لیے کوششیں کی گئیں۔ مگر فریقین کے جنگ سے وابستہ مطالبات اور فتح کی امید نے صلح کی تمام تر کوششوں کو وقتی طور پر خاموش کر دیا۔

تاہم قیامِ امن کی کوششیں جو گزشتہ سالوں میں بالکل ہی نہ ہونے کے برابر تھیں اب دنیا کو انسانی قتل و غارت گری کے اِس گھناؤنے کھیل سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اور متحارب ممالک کے توسیع، اقتدار اور خود پسند حکمران جنگ کے منطقی انجام اور اپنے بھرم بچانے کے چکر میں مناسب وقت اور شرائط کے منتظر تھے۔ شریکِ جنگ ممالک کی معاشی صورتِ حال ابتری کی جانب مائل تھی۔ کئی ممالک تباہی کے دھانے تک پہنچ چکے تھے۔

8

1918ء کے دوران جنگ کی صورتِ حال

سال 1918ء شدید لڑائیوں کے سال کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اِس سال ہر فریق نے دوسرے فریق کو شکست دینے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ یہ سال تاریخِ عالم میں اس لیے بھی اہم ہے کہ اسی سال جنگِ عظیم اوّل کا اختتام ہوا۔ انسانیت کا مزید قتلِ عام رک گیا۔ زبوں حال، تڑپتی، سسکتی اور لٹی پھٹی حیاتِ انسانی کو ایک بار پھر سانس لینے کا موقع ملا اور شریکِ جنگ ممالک پر عذاب کی طرح مسلط خونخواری اور خونریزی کا بھوت اتر گیا۔

گزشتہ سال اعلانِ جنگ کرنے والے امریکہ پہلے سے جنگ میں مصروف ممالک پر اِس ملک کی دہشت بھی تازہ دم اور بڑی طاقت ہونے کی حیثیت سے بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اتحادی ممالک امریکی فوجی کمک اور امداد کے انتظار میں تھے جبکہ مرکزی ممالک امریکی مدد اور کمک کی آمد سے قبل ہی اتحادی ممالک کو شکست دینے کے لیے کوشاں تھے۔

مجموعی طور پر آسٹریا۔ ہنگری، ترکی، فرانس اور برطانیہ اپنی خستہ حال معیشت، تباہ حال عوام، شکست خوردہ فوج اور بہت بڑے پیمانے پر ہونے والی جنگی اموات کے باعث سخت عاجز آ چکے تھے۔ قیامِ امن کی کوششوں کے آگے اُن کی انا اور فتح کی صورت میں حاصل ہونے والی

مراعات کے چھن جانے کا خوف، بند باندھے کھڑے تھے۔

گو جرمنی بھی بحری تجارت کی بندش کے باعث معاشی لحاظ سے شدید متاثر ہوا تھا۔ مگر ابھی بھی اِس ملک میں دیگر تمام پہلے سے شریکِ جنگ ممالک کی نسبت قوت اور معاشی استحکام دیکھا جاسکتا تھا۔ علاوہ ازیں ونو شریک امریکہ، دیگر تمام ممالک جنگ کے مضر اثرات کو شکار ہو چکے تھے اور کسی طرح جنگ سے چھٹکارا چاہتے تھے۔

اب ہم 1918ء کے دوران وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور حالات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں:

برّی، بحری اور فضائی حملے

اِس سال بری محاذوں پر حملوں کا شدید سلسلہ گزشتہ سالوں کی نسبت تھوڑا زیادہ زور پکڑ گیا۔ بحری محاذ پر جرمنی کی ناکہ بندی کرنے کی اتحادی ممالک کی کوشش عروج پر رہی جبکہ جوابی طور پر جرمنی کی آبدوزوں کی مہم بھی ابتدائی طور پر تیز رہی۔

جنگ کی سب سے اہم بات فضائی حملوں کی جنگ میں اہمیت کا واضح طور پر اجاگر ہونا اور کامیابی کے لیے لازم سمجھا جانا ہے۔ اِس سال کے آغاز پر فریقین اپنی اپنی فضائی فوج کی تیاری، بہترین تربیت، جنگی مہارت اور چالوں کے مطابق عمل درآمد کے علاوہ، بہترین مشین، آدمی اور تنظیم پر بھی پوری توجہ دیتے ہوئے ترقی کرتے گئے۔

ماسوائے مشرقی محاذ کے تمام محاذوں پر جنگ کے شعلے اپنی انتہائی حدت سے بھڑکتے رہے۔ خصوصی طور پر مغربی محاذ جنگ کا محورِ خاص رہا۔ مناسب ہوگا کہ اب ہم جنگ کے مختلف محاذوں پر ہونے والی لڑائیوں کا تفصیلی جائزہ لیں:

مغربی محاذ

1918ء کے آغاز میں شریکِ جنگ ممالک کی حالتِ زار انتہائی ابتر ہو چکی تھی۔ جرمنی، فرانس، برطانیہ، ترکی، آسٹریا۔ ہنگری، بلغاریہ اور اٹلی تمام کے تمام ممالک ہی نیم بسمل حالت میں

تھے۔ امریکہ نیا شامل ہونے والا واحد ملک تھا جو جغرافیائی بعد اور پہلے سے مستحکم معیشت کے باعث جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا تھا۔

امریکہ نے گزشتہ سال اپریل میں جنگ میں شریک ہونے کا اعلان کیا تھا۔ تاہم اُس کی جانب سے افواج کی روانگی کی کارروائی انتہائی سست اور غیر فعال تھی کہ اتحادیوں کی اُس سے قائم شدہ بہت زیادہ امیدیں اور توقعات دم توڑنے لگیں۔ دوسری طرف جرمن چیف آف سٹاف نے اتحادی افواج پر امریکی امداد اور کمک سے پہلے ہی شدید حملہ کر کے انہیں شکست دینے کا منصوبہ بنایا جس میں ہوٹیئر کی جنگی تدبیر کے مطابق حملہ کیا جانا تھا۔

ہوٹیئر کی جنگی تدبیر

جرمن جنرل اوسکروان ہوٹیئر اور اُس کے سٹاف نے ریگا کے مقام پر ایک نیا جنگی داؤ آشکار کیا تھا۔ یہ داؤ گزشتہ سال اٹلی کے محاذ پر لڑی جانے والی کیپوریٹو کی لڑائی میں کامیابی سے پرکھا جا چکا تھا اور اِس کے دشمن کی اولین صفوں میں شگاف ڈالتے ہوئے پیش قدمی کرنے اور دشمن کی قتل و غارت گری کرنے کے سلسلہ میں افادیت بہت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی۔

ہوٹیئر کے جنگی داؤ سے قبل رواج یہ تھا کہ حملہ آور فوج پہلے کئی دِن تک دشمن کی اولین صفوں پر شدید گولہ باری کرتی رہتی۔ اور جب یقین ہو جاتا کہ گولہ باری سے دشمن کی حالتِ زار بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے تو اپنی پیادہ فوج کے ذریعے اُس پر حملہ کر دیا جاتا جو لڑتے ہوئے پیش قدمی کرتی چلی جاتی اور اِس طرح دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا جاتا تھا۔

اِس طرح شدید گولہ باری کے لیے بھاری مقدار میں توپ خانے اور بارود کے استعمال کے علاوہ سب سے زیادہ قیمتی وقت کا بہت زیادہ ضیاء ہو جاتا تھا۔ اِس دوران دشمن اپنی محفوظ فوج کو میدان میں لے آتا یا کوئی اور ذریعۂ امداد ڈھونڈ لیتا تھا۔ اور ساتھ ہی ملکی معیشت بری طرح متاثر ہوتی تھی۔

اب ہوئیٹر کے نئے جنگی داؤ نے بہت سے معاملات آسان کر دیے تھے۔ اِس داؤ کے مطابق اپنے زیرِ ہدف علاقے میں دشمن کی پوزیشنز پر زیادہ مقدار میں گیس اور دھویں کے گولے پھینکے جاتے تھے جن سے دشمن کی فوج کو فوری طور پر بوکھلاہٹ اور بے حس و حرکت کرنے کا کام لیا

جاتا تھا۔ اِس حملے میں دشمن کی گنوں، مشاہدہ کرنے کی جگہوں، خندقوں اور ہیڈ کوارٹروں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔

اِس کے فوراً بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا جس میں توپ خانہ اپنی مناسب فائرنگ اور گولہ باری سے دشمن کی فوج کو بیلنے انداز میں دباتے ہوئے ایک بند باندھ دیتا تھا۔ تا کہ دشمن کی صفوں میں گھسنے پر دشمن پریشانی، بوکھلاہٹ اور جان بچانے کی کوشش میں فوری طور پر بے ربط انداز سے پسپاء ہو جائے۔ اِس پسپائی کے دوران توپ خانہ ایک طے شدہ تناسب سے پیش قدمی کرتا جائے۔ اپنے پہلوؤں پر دشمن کے حملے سے قطع نظر طے شدہ تناسب سے عمومی طور پر ایک کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پیش قدمی کر جاتا تھا۔

تیسرے مرحلے میں فوری طور پر بلا کوئی فاصلہ پیدا کیے پیادہ فوج اپنے توپ خانے کے پیچھے اُس کی پہلوؤں سے حفاظت کرتے ہوئے اور دشمن کے بچے کھچے سپاہیوں کو قیدی بناتے ہوئے مقبوضہ علاقے پر باقاعدہ کنٹرول قائم کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اِس طرح آخر میں علاقے کا کنٹرول محفوظ فوج کے رجمنٹ اور بٹالین کمانڈر کے ہاتھ آجاتا اور مزید پیش قدمی اور حملہ کامیاب رہتا تھا۔

اِس جنگی داؤ کی خاص بات یہ تھی کہ اِس کے لیے ایک مشاق فوج کی ضرورت تھی جبکہ اِس داؤ کے ذریعے توپ خانہ گولہ باری کرتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس جاتا جس کی حفاظت کی ذمہ داری پیادہ فوج پر ہوتی تھی۔ محفوظ فوج فوراً ہی آگے آ کر پیادہ فوج سے کنٹرول حاصل کر لیتی اور پیادہ فوج ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ یہ ایک مسلسل اور جاری عمل ہوتا جو مطلوبہ مقام تک پہنچ جانے کے بعد چوتھے مرحلے میں داخل ہو جاتا تھا۔

چوتھے مرحلے میں حملہ آور فوج کو ایک خاص (پہلے سے طے شدہ) سمت میں پوری رفتار سے جہاں تک جانا ممکن ہو، پیش قدمی کر جانے کی ہدایت دی جاتی تھی۔ جس کا کوئی خاص ہدف متعین نہیں کیا گیا ہوتا تھا۔ اِس پیش قدمی کے دوران دشمن کی جانب شدید مزاحمت والے رقبوں سے ہراوّل دستوں کو نہایت تیزی سے آگے گزر جانے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اور اُن کے پیچھے آنے والے یونٹس کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ دشمن کی مزاحمت کو ختم کریں۔

اِس نئے داؤ کے مطابق ہر حملہ آور بٹالین کو اپنا چھوٹے پیمانے پر توپ خانہ، اُس کے

پیچھے پیچھے آنے والے پیادہ دستے جو مشین گنوں کے حساب سے مختلف گروہوں میں منقسم کیے ہوئے ہوتے تھے، فراہم کیے گئے تھے۔ اب جرمن ہلکی مشین گن کو پیادہ فوج کے حملہ آور ہونے کے لیے سب سے بہترین ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے جبکہ قبل ازیں اِس کا استعمال صرف دفاعی نقطۂ نظر سے ہوتا تھا۔

پہلا جرمن حملہ (سوم کا حملہ)

موسمِ بہار 1918ء میں جرمنی نے امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے سے قبل مغربی محاذ پر فیصلہ کن حملے کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے کے مطابق 71 جرمن ڈویژنز پر مشتمل تین آرمیوں کو دریائے سوم کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے شمال میں برطانوی فوج اور جنوب میں فرانسیسی فوج کو منقسم کر دینا تھا۔

جرمن چیف آف سٹاف جنرل لیوڈنڈروف جانتا تھا کہ اتحادی فوج کی ترجیحات میں فرق ہونے کے باعث وہ مشترکہ دفاعی محاذ قائم کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ فرانس کی فوج کے لیے سب سے اہم پیرس کو بچانا جبکہ برطانوی فوج کے لیے اپنی بندرگاہوں کو بچانا انتہائی ضروری ہونے کے باعث دونوں ایک نقطۂ نظر پر متفق نہ ہوں گے۔ اور اُن کے اسی انتشار اور بُعد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جرمن فوج انہیں دو حصوں میں بانٹ دے گی۔

حملے کا منصوبہ ابتدائی طور پر سادہ تھا۔ جرمنی کی تین افواج کو ارلیس سے لافیئر تک کی دفاعی پٹی کے درمیان حملہ آور ہو کر برطانوی فوج کو تباہ کرتے ہوئے پسپا کرتے جانا تھا اور انہیں فرانس کی فوج سے کاٹ دینے کے بعد اُن پر بھرپور حملے کرتے ہوئے فرانس سے نکال دینا تھا۔ جنرل آٹو وان بلو کی قیادت میں جرمن سترہویں آرمی جو 25 ڈویژن پر مشتمل تھی، شمال میں صف آرا کی گئی تھی۔ درمیان میں جنرل جارج وان ڈر مارو ٹز کی قیادت میں دوسری آرمی کی 21 ڈویژن فوج مورچہ بند تھی۔ جنوب میں جنرل اوسکر وان ہوٹیئر کی سربراہی میں آٹھارہویں آرمی کے 25 ڈویژن دشمن کی صفوں میں شگاف ڈالنے کے لیے تیار تھے۔

منصوبے کے مطابق بنیادی طور پر جرمن سترہویں اور دوسری آرمی نے دشمن کو پسپا کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا تھا۔ جبکہ جنرل ہوٹیئر کی اٹھارہویں آرمی کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ

اُن کے جنوب میں پیش قدمی کرتے ہوئے اُن کے جنوبی پہلوؤں کی دشمن سے حفاظت کرے۔اور جوابی حملوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہوئے دوسری اور سترہویں آرمی کی پیش قدمی میں رکاوٹ نہ آنے دے۔

برطانوی جنرل ہیگ اپنی پانچویں آرمی پر دشمن کے حملے کی توقع رکھتا تھا۔اسی لیے اُس نے جنرل گوہ کی قیادت میں 15 ڈویژن فوج پر مشتمل پانچویں آرمی کے ساتھ 14 ڈویژن فوج پر مشتمل برطانوی تیسری آرمی جنرل بینگ کی قیادت میں شمالی جانب صف آرا کی تھی۔ جنرل گوہ کی پانچویں آرمی کے جنوب میں فرانس کی چھٹی آرمی مورچہ بند تھی۔فرانس اور برطانیہ کی دفاعی تدابیر کے بہت زیادہ مختلف ہونے کے باعث جنرل گوہ کے ذمے 41 میل لمبی فرنٹ لائن کی حفاظت تھی۔جس کے باعث مجموعی طور پر وہ کمزور پوزیشن میں تھا۔

21 مارچ کی صبح 4:40 منٹ پر جرمن توپ خانے نے 6000 توپوں اور 3000 مارٹر گنوں سے ساڑھے پانچ گھنٹے تک گیس، دھویں اور گولہ بارود کی بارش جاری رکھی۔ 9:40 منٹ پر 32 جرمن ڈویژنوں نے دھویں کے گھپ اندھیرے میں پیش قدمی شروع کی۔ان کے پیچھے ہوٹیئر کی جنگی تدبیر کے مطابق 28 ڈویژن مزید فوج ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتی چلی جارہی تھی۔دھویں نے برطانوی دفاعی گولہ باری اور فائرنگ کو شدید متاثر کردیا تھا۔

حملے کے پہلے روز برطانوی دفاع کی ساری پٹی کی دھجیاں بکھر گئیں۔22 مارچ کی شام تک جنرل گوہ کی پانچویں آرمی کے پاؤں اکھڑ چکے تھے اور اُس نے اپنی آرمی کو اگلے روز دریائے سوم کے پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔جنرل بینگ کی تیسری آرمی ابھی اپنی دفاعی پٹی کے تقریباً چوتھائی حصے کے سواء باقی حصے پر ڈٹی ہوئی تھی۔اور اس کے مقابل جرمن دوسری اور سترہویں آرمی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔

جنرل لیوڈنڈروف کے منصوبے اور توقعات کے برعکس سترہویں اور دوسری آرمی سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے تھے۔جبکہ ان کی حفاظت پر مامور جنرل ہوٹیئر کی اٹھارہویں آرمی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔اِس لیے اب منصوبے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔لہٰذا جنرل لیوڈنڈروف نے جنرل ہوٹیئر کو دریائے سوم کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے فرانسیسی اور برطانوی افواج پر حملے جاری رکھنے اور سمندر تک پہنچنے کی

ہدایت کی۔

23 اور 24 مارچ کو جرمن افواج کی پیش قدمی جاری رہی۔ خصوصاً برطانوی پانچویں آرمی کے تعاقب میں جنرل ہوٹیئر کی فوج بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ اس طرح ایک مرحلے پر پانچویں آرمی کی تیزی سے پسپائی کے باعث تیسری آرمی کا جنوبی بازو غیر محفوظ ہوگیا مگر فوراً ہی برطانوی توپ خانے کی بروقت پیش قدمی کے باعث شگاف کو پر کرلیا گیا۔

26 مارچ تک جنرل ہوٹیئر کی شاندار پیش قدمی کے باعث برطانوی اور فرانسیسی فوج کے درمیان اہم رابطے کے مقام ایمنز پر شدید خطرات منڈلانے لگے۔ اِن فتوحات نے جنرل لیوڈنڈروف کو اپنے منصوبے میں توسیع کرنے پر مائل کردیا۔ اُس نے اریس پر حملے کے لیے 20 جرمن ڈویژن کو مامور کردیا۔ اس کے منصوبے کے مطابق اس نئی فوج کو ہوٹیئر کے جنگی داؤ کے تحت پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کرنا تھا۔

مگر ہوٹیئر کی تدبیر کے استعمال کے لیے ماہر اور تربیت یافتہ فوج درکار تھی۔ جبکہ حملہ آور فوج کے بیشتر ڈویژن نئے بھرتی شدہ تھے جو بہرحال تربیت یافتہ نہ ہونے کے باعث اِس مہم کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اِس لیے جنرل بینگ کی فوج جو برطانیہ کے بہترین یونٹس پر مشتمل تھی انہیں روکنے میں کامیاب رہی۔

جنرل ہوٹیئر کی فوج کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے فرانس نے 6 ڈویژن فوج روانہ کی جسے خصوصی طور پر ہدایت کی گئی کہ وہ جرمن فوج کی پیرس کی طرف پیش قدمی کو روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے بصورتِ دیگر اپنی دفاعی پٹی پر مورچہ بند رہے۔ 27 مارچ کو جنرل ہوٹیئر ماونٹڈ یڈیئر پر قابض ہوچکا تھا۔ اب جرمن اٹھارویں آرمی بری طرح تھک چکی تھی۔ اور جرمن سپلائی کا سلسلہ بھی تسلسل کے عمل سے عاری ہوچکا تھا۔

درمیان میں جنرل ماروٹز ایمنز کی جانب بڑھ رہا تھا مگر اسے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ 28 سے 30 مارچ تک ماروٹز کی فوج کو جنرل سینڈمین کیری کی امریکی فوج نے شدید گولہ باری اور حملوں کے باوجود پرانی خندقوں میں داخل نہ ہونے دیا۔ اِس طرح جنرل لیوڈنڈروف کا منصوبہ اپنے اہداف حاصل کرنے میں ناکام ہوگیا۔

لیوڈنڈروف نے 30 مارچ کو ماونٹڈ یڈیئر اور نویون کے درمیان ایک اور زبردست قسم

کا حملہ کیا۔ مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی ۔ 4 اپریل کو ایک بار پھر البرٹ کے نزدیک برطانوی فرنٹ لائن میں شگاف ڈالنے کی بھرپور کوشش کی گئی مگر ایک بار پھر کوئی خاص کامیابی نہ ہونے پر مہم ختم کرنے کا حکم دے دیا۔
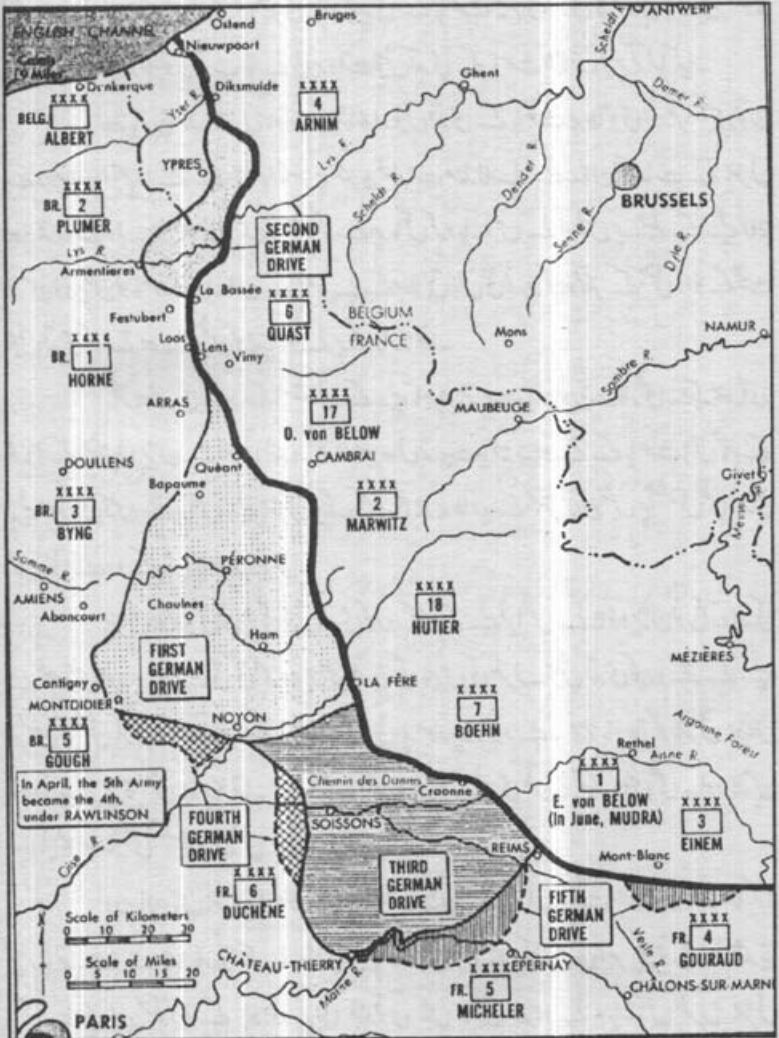
(جرمن فوج کے 1918ء کے حملے)

اِس مہم کے آٹھ (8) دِنوں میں جرمن افواج 40 میل تک پیش قدمی کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ 70000 ہزار قیدی اور 1100 گنز ہاتھ آئیں۔ دوسری جانب برطانیہ کی فوج کو تقریباً 200000 فوجیوں کی قربانی دینی پڑی۔ جرمنی کے جنگی نقصان کے اعداد و شمار بھی اسی قدر رہے تاہم جرمن فوج کا نقصان اِس لیے زیادہ تھا کہ اس کے مشاق اور تربیت یافتہ فوجی اِس جنگ میں بڑی تعداد میں مارے گئے جن کی کمی کو پورا نہ کیا جاسکا۔

اتحادی افواج کو جرمن حملے نے اپنی کمزوریوں پر نظرِ ثانی کرنے اور اپنی قیادت کے غیر مربوط اور باہمی عدم تعاون کے شکار نظام کو بدلنے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اِس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اتحادی افواج کی قیادت ایک مرکزی قیادت کے تابع ہو جس کے احکام اور منصوبوں کے مطابق تمام جرنیل لڑائی میں شریک ہوں۔

اِس سلسلے میں غور و خوض اور باہمی رضامندی کے بعد جنرل فوش کو ریٹائرمنٹ سے واپس بلا کر فرانس میں موجود اتحادی افواج کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ بعد ازاں جولائی میں جنرل فوش کو تمام اتحادی افواج کا سپریم کمانڈر بنا دیا گیا۔ اِس طرح اتحادی افواج نے اپنی قائدانہ کمزوری کا سدِ باب کرتے ہوئے اپنی پوزیشن مستحکم کرلی۔

دوسرا جرمن حملہ (لیز کا حملہ)

جرمن پہلے حملے کے اپنے مقاصد میں ناکام ہوجانے کے بعد جنرل لیوڈنڈروف نے ایک اور حملہ کر کے برطانوی فوج کو تہس نہس کرنے کا پروگرام بنایا۔ اسے یقین تھا کہ وہ تھکی ہاری برطانوی فوج پر ایک آخری ضرب لگا کر اُن کے اوسان خطا کرسکتا ہے۔

اُس نے پیرس کے قریب دریائے لیز کے مقام پر 35 ڈویژن پر مشتمل چوتھی اور چھٹی آرمی کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ چوتھی آرمی کی قیادت جنرل سِکسٹ وان ارنم کررہا تھا جبکہ چھٹی آرمی کی قیادت جنرل فرڈیننڈ وان کوئزٹ کے ذمے تھی۔ چوتھی آرمی کو آرمنٹیرز کے شمال میں حملہ آور ہونے کی ہدایت کی گئی تھی۔ جبکہ چھٹی آرمی کو اس قصبے کے جنوب سے حملہ آور ہونا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے یہ جگہ کانٹے دار جھاڑیوں، ندیوں نالوں اور اونچے نیچے ٹیلوں پر مشتمل ہونے کے باعث حملے کے لیے مشکل تھی۔

9 اپریل کی صبح پونے نو بجے گیس اور گولہ بارود کی بھاری مقدار کی فائرنگ کے بعد جرمن چھٹی آرمی کے 8 ڈویژن آرمینٹیئر ز کے جنوب سے حملہ آور ہوئے۔ ان کے مدِ مقابل برطانوی پہلی آرمی کی 3 ڈویژن فوج مورچہ بند تھی۔ برطانیہ کے درمیانی ڈویژن میں پرتگالی فوج مورچہ بند تھی جسے دو ڈویژن فوج کے متناسب جگہ کا دفاع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

جرمن چھٹی آرمی نے تین گھنٹے کے زوردار حملے میں برطانوی فوج کے دفاعی نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا اور اب وہ تمام خندقوں پر قابض ہو چکے تھے۔ دِن کے اختتام پر وہ 5 میل تک برطانوی فوج کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

اگلے دِن جنرل ارنم کی چوتھی آرمی نے آرمینٹیئر ز کے شمال میں دشمن کی 1 ڈویژن فوج پر 4 ڈویژن فوج سے حملہ کر دیا۔ گزشتہ روز کے حملے کے باعث تمام محفوظ فوج جنوب کی جانب طلب کر لی گئی تھی اور اب اِس ڈویژن کے پاس کوئی محفوظ فوج نہ ہونے کے باعث بری طرح پسپا ہونا پڑا۔ 11 اپریل کو دو سمتوں سے پیش قدمی کرنے والی جرمنی کی دونوں افواج ایک دوسرے سے مل گئیں اور جنوب کی جانب مزید پیش قدمی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

12 اپریل کو برطانوی فوج کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ کیلائس خالی کر کے دیہاتی علاقوں کی طرف بھاگنے لگے۔ جنرل ہیگ نے اپنی تمام موجود محفوظ فوج کو جنگ میں جھونک دیا۔ اور برطانوی فوج کے اکھڑے ہوئے قدم ایک بار پھر کسی قدر جم گئے۔ جرمن حملوں کا سلسلہ 29 اپریل تک جاری رہا مگر مزید کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

ایک بار پھر جرمن افواج کو علاقائی لحاظ سے بہترین فتح حاصل ہوئی مگر اُس کے اہداف و مقاصد حاصل نہ ہو سکے۔ جرمن دوسرے حملے میں جرمنی کے 350000 فوجی کام آئے جبکہ برطانوی فوج کے صرف 305000 فوجی جنگ کی بھٹی کا ایندھن بنے۔ جرمنی کے پاس اپنی افرادی قوت کی کمی پوری کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا جبکہ اتحادی افواج کو امریکی تازہ دم اور تربیت یافتہ فوج کی بھاری کمک بڑے پیمانے پر حاصل ہونا شروع ہو چکی تھی۔

تیسرا جرمن حملہ (آئزن کا حملہ)

جنرل لیوڈنڈروف نے ایک بار پھر دشمن کی قوت کو منتشر کرنے اور اُس پر کاری ضرب

لگانے کے لیے فلینڈرز کے علاقے میں دو نئے حملے کا فیصلہ کیا۔ مرکزی حملوں سے قبل توجہ بٹانے والے حملے کے لیے چیمن ڈیس ڈامیس جو دریائے آئزن کے کنارے پوٹھوہاری علاقہ تھا، چنا گیا۔ جہاں دریائے آئزن کے ساتھ ساتھ سوئزون اور رائمز کو ملانے والی بڑی شاہراہ پر قبضہ کر لینے سے جرمنی کو بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ اور لازمی طور پر دشمن کے تمام محفوظ دستے اِس حملے کو روکنے کے لیے وہاں بھیجے جانے متوقع تھے۔

27 مئی کی صبح جنرل وان بلو کی قیادت میں پہلی آرمی اور جنرل میکس وان بوہیمن کی قیادت میں ساتویں آرمی اپنے 17 ڈویژن حملہ آور اور 13 ڈویژن عقبی فوج اور 4600 گنز کے ساتھ اتحادی جنرل اگسٹ ڈوچین کی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ جنرل ڈوچین اپنے علاقوں کی بہر صورت حفاظت کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی افواج کی تمام افرادی قوت دشمن کے سامنے دفاعی پٹی پر صرف کر دی اور عقب خالی چھوڑ دیا تاکہ بھرپور انداز سے دشمن کا مقابلہ کر سکے۔

جرمن حملے نے جنرل ڈوچین کی فرنٹ لائن کو تہس نہس کر دیا اور شام تک 13 میل تک پیش قدمی کرتے ہوئے دریائے ویسل کے کنارے فِس میس کے قریب پہنچ گئے۔ جنرل لیوڈنڈروف کے منصوبے کے مطابق اسے اپنے اِس توجہ بٹانے والے حملے کو وہیں ختم کرتے ہوئے فلینڈرز کے مقام پر اصل حملے کا حکم دینا تھا۔

مگر پیش قدمی کرتی ہوئی مشتعل فوج کے بھڑکتے ہوئے جذبات، خودسری اور ایک طرح کی بغاوت کے سامنے اُس نے پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے حملے کو اپنے منطقی انجام تک جانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

جرمن فوج پیرس سے صرف 37 میل کی دوری تک کسی خاص مزاحمت کے بغیر ہی پہنچ گئی۔ اب وہ دریائے مارن کے کنارے کیٹیو تھیری کے علاقے میں پیش قدمی کر رہے تھے۔ اس مشکل ترین گھڑی میں اتحادی افواج نے امریکی فوج سے مدد کی استدعا کی اور امریکی افواج نے فوری طور پر 110 میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میدانِ کارزار میں پہنچ کر دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا۔ جرمن افواج اگلے تین دنوں تک مزید آگے بڑھنے کے لیے کوشاں رہیں مگر انہیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

ایک بار پھر جنرل لیوڈنڈروف کو علاقائی اور جنگی چالوں کے حوالے سے کامیابی ہوئی

مگر لشکر کشی کے اہداف حاصل نہ ہو سکے۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی اُس کے قبضے میں پوٹھوہاری علاقے آئیں گے جہاں پیش قدمی اور دفاع دونوں ہی انتہائی کٹھن اور دشوار گزار ہونے کے باعث ان کی حفاظت بھی جرمن فوج کے لیے کافی مشکل تھی۔

چوتھا جرمن حملہ (نویون۔ماؤنٹڈیڈیئر کا حملہ)

اب جنرل لیوڈنڈروف کی صورتِ حال بہت نازک رخ اختیار کر گئی تھی۔ حاصل شدہ علاقے فوجی نقطہِ نظر سے بے کار ہی نہیں بلکہ زیرِ انتظام رکھنے میں بہت دشوار بھی تھے۔ اِس لیے بہتر تھا کہ انہیں چھوڑتے ہوئے واپس محفوظ دفاعی لائن پر آجایا جائے۔ مگر یہ امر ملک کے اندر شدید عوامی ردِعمل، فوج کے اندر پست ہمتی اور دشمن کے لیے خوشی، احساسِ فتح اور بلند ہمتی کا باعث بن جاتا۔

لہٰذا اُس کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنی مقبوضات کو برقرار رکھنے اور اپنے فوجی مقاصد کے حصول کے لیے مزید پیش قدمی کرتے ہوئے دفاعی نقطہِ نظر سے مناسب جگہوں تک رسائی حاصل کرے۔ ساتھ ہی ساتھ دشمن کو بہت زیادہ کمزور بھی کر دے۔ اس سوچ کے تحت اُس نے مناسب سمجھا کہ ماؤنٹڈیڈیئر۔ نویون کے علاقے سے دوشاخہ نما حملہ کیا جائے جو شمال اور جنوب دونوں جانب دشمن کی افواج کو کاٹتا ہوا پیرس کی جانب بڑھے۔

اِس حملے کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ اپنے تیسرے حملے کے بعد وہ فلینڈرز کے علاقے پر بڑے پیمانے پر حملہ آور ہو کر برطانوی فوج کا شیرازہ بکھیرنا چاہتا تھا۔ اِس طرح اِس حملے سے دشمن کی تمام محفوظ فوج کے جنوب کی جانب منتقل ہو جانے کے باعث شمال میں فلینڈرز سے کامیاب حملہ کیا جا سکتا تھا۔

9 جون کو جنرل ہوٹیئر کی اٹھارہویں آرمی نے ماؤنٹڈیڈیئر۔ نویون کے علاقے سے حملہ کیا اور جنرل بوہیمن کی ساتویں آرمی نے سوئزون پر دھاوا بول دیا۔ اِس بار اتحادیوں کو حملے کی پہلے خبر ہو چکی تھی اور وہ بھرپور تیار تھے۔ جنرل فائے یول کی قیادت میں فرانسیسی فوج نے ہوٹیئر کے جنگی داؤ کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد اس کے توڑ کے لیے ایک خاص تکنیک اختیار کی۔ جنرل فائے یول نے دفاع کے لیے گہری پٹی منظم کی جو بڑھتے ہوئے دشمن کی فوج کو دور اندر تک

فائرنگ کے ذریعے تراشتے ہوئے بالآخر کار ختم کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

جرمن افواج کا حملہ جنرل فائے یول کی دفاعی تدبیر کے آگے کارگر نہ ہو سکا اور جرمن فوج کو بہت زیادہ نقصانات اُٹھاتے ہوئے صرف 9 میل تک پیش قدمی کرنے کا موقعہ ملا۔ بعد ازاں فرانسیسی فوج کے جوابی حملوں کا سلسلہ بڑھ گیا اور جرمن فوج کو اپنی پیش قدمی کو روکنا پڑا۔ 13 جون کو حملے کے خاتمے کا حکم دیا گیا۔ اِس لڑائی میں جرمن فوج کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا جبکہ اُن کے مدِ مقابل فرانسیسی فوج کا نقصان بہت کم تھا۔

پانچواں جرمن حملہ (چیمپین۔مارن کا حملہ)

جرمن چوتھے حملے کے بعد تقریباً ایک ماہ تک محاذِ جنگ میں کسی قدر خاموشی چھائی رہی۔ جرمنی میں بہت سے راہنما امن کی ضرورت اور قیامِ امن کے اقدامات کے لیے آواز بلند کرنے لگے۔ تاہم جنرل لیوڈنڈروف ابھی بھی اپنے فلینڈرز پر حملہ کرنے کے اپنے دیرینہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکمتِ عملی وضع کر رہا تھا۔

جرمن افواج چوتھے حملے کے دوران شدید موسمی حالات اور جنگی صعوبتوں کے باعث فلو اور دیگر وبائی امراض کا شکار ہو رہے تھے۔ اِس کمزور صورتِ حال میں اتحادی ممالک کی جانب سے بڑے پیمانے پر پراپیگنڈا کیا جا رہا تھا۔ جہازوں کے ذریعے جرمن فوج کے سپاہیوں پر پرچیاں پھینکی جاتی تھیں جن میں اُن کے گھروں میں بھوک، افلاس اور وبائی امراض سے اموات کی منظر کشی کی ہوتی تھی۔

امریکی افواج کی آمد سے افرادی قوت کا تناسب برابر ہو چکا تھا۔ اتحادی فوج میں تازہ دم امریکی دستے اور مسلسل دشمن کے عزائم کے خلاف دیوارِ چین بننے والے برطانوی اور فرانسیسی سپاہی بہر حال اپنے مدِ مقابل پے در پے اپنے مقاصد میں ناکام ہونے والی پست ہمت جرمن فوج سے کئی گنا زیادہ طاقتور ہو چکے تھے۔

امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے سے جنگ کا انداز یکسر بدل گیا تھا۔ اب جنگ پرانی اور فرسودہ طرز سے لڑی جانے کی بجائے جدید سائنسی طریقوں سے لڑی جا رہی تھی۔ اور اب جنرل فوش نے جدید تکنیکی سہولیات کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے جرمن حملوں کی رفتار تصاویر پر

عرق ریزی کے بعد اُن کے حملے کا انداز اور اُس کے توڑ کے لیے حکمتِ عملی وضع کر لی تھی۔

مسلسل بگڑتے ہوئے حالات کے باوجود جنرل لیوڈنڈروف نے ایک بار پھر بہت بڑے پیمانے پر دو مختلف مقامات پر حملہ کرنے کا منصوبہ مرتب کیا۔ اِس مہم میں 52 ڈویژن جرمن فوج کو جھونکنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جن کے مدِ مقابل اتحادی افواج کے کُل 36 ڈویژن مورچہ بند تھے۔ اِن میں سے 23 فرانسیسی 9 برطانوی، 2 اطالوی (اٹیلین) اور 2 امریکی ڈویژن تھے۔

منصوبے کے مطابق جرمن ساتویں آرمی کو ریمز پر قبضہ کرنے کے لیے مارن کے پوٹھوہاری علاقے میں اِسپرنے پر حملہ کرنا تھا اور دس (10) دِن بعد بہت بڑے پیمانے پر جرمن پہلی آرمی نے مارن کے علاقوں میں مشرقی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ آور ہونا تھا۔ اِن لڑائیوں میں دشمن کی محفوظ فوج کے فلینڈرز سے طلب کیے جانے پر اصل ہدف "فلینڈرز" پر بعد میں حملہ کیا جانا مقصود تھا۔ اِن توجہ بٹانے والے حملوں کے لیے 15 جولائی کا دن مقرر کیا گیا۔

جرمن ساتویں آرمی کے حملے کے آغاز پر حسبِ دستور گولہ باری کی جانی تھی۔ مگر اِس بار جنرل فوش نے پہل کرتے ہوئے از خود شدید گولہ باری شروع کر دی۔ اِس طرح اتحادی افواج کی گولہ باری نے جرمن فوج کو جو قریب قریب صف آرا تھی، بری طرح جانی نقصان پہنچاتے ہوئے اُن کی پیش قدمی کرنے والی صفوں میں افراتفری مچادی۔

اِس طرح پانچویں حملے کی مہم کی پہلی لڑائی بری طرح ناکام ہو گئی۔ دوسری جانب پہلی آرمی نے ابتدائی طور پر کامیابی حاصل کی مگر بعد ازاں اتحادی فوج کی جانب سے انتہائی شدید مزاحمت اور دفاعی تدابیر کے آگے جرمن حکمتِ عملی اور فوجی کارروائیوں کی کوئی پیش نہ پڑی اور انہیں مزید کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اِس طرح اِس حملے کو بھی ختم کرنا پڑا۔

جرمن فوج کا مورال بری طرح پست ہو چکا تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں موجود توجہ بٹانے والے حملوں کو ہی اصل حملے گردانتے ہوئے بھر پور طور پر افادیت حاصل کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگاتے چلے آرہے تھے۔ مگر اب دشمن کی جانب سے شدید مزاحمت اور دفاعی تدابیر اُن کے آگے بڑھنے کی صلاحیت کو بری طرح مجروح کر چکی تھیں۔ اس طرح جنرل فلینڈرز اِس کے بعد اپنی مزید مہم جوئی نہ کر سکا۔

مجموعی طور پر 1918ء کی پانچ مہموں کے دوران جرمن فوج کے 8 لاکھ بہترین، مشاق،

تجربہ کار اور تربیت یافتہ سپاہی لقمہ اجل بن گئے جبکہ اس قدر قیمت پر صرف چند صحرا ہی حاصل ہوئے تھے جو وہاں صف آرا فوج کے لیے مزید دشواریوں اور وبائی امراض کا باعث بن رہے تھے۔ جرمن فوج اب حملے کرنے کی حالت میں نہیں رہ گئی تھی۔ اور حصولِ فتح ایک ٹوٹتے ہوئے خواب کی طرح قیصر ولیم اور لیوڈنڈروف کو محسوس ہونے لگی تھی۔

اتحادی افواج کا پہلا جوابی حملہ (آئزن۔مارن کا حملہ)

جرمن پانچویں حملے سے قبل ہی جنرل فوش جرمن افواج پر بھرپور جوابی حملے کرتے ہوئے اپنی چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے منصوبہ سازی میں مصروف تھا۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ کب جرمن حملے ناکام ہوں اور وہ فوراً تھکی ہاری فوج پر بھرپور انداز سے حملہ آور ہو جائے۔ اس لیے جرمن پانچویں حملے کے فوراً بعد 18 جولائی کو مارن کے چھنے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے تین اطراف سے حملہ کرنے کا منصوبہ روبہ عمل لایا گیا۔

فرانس کی دسویں اور چھٹی آرمی نے مغربی جانب حملہ آور ہونا تھا جبکہ نویں اور پانچویں آرمی نے مشرقی سمت واقع بقیہ نصف پر حملے کرتے ہوئے دشمن کو وہاں سے پسپا ہونے پر مجبور کرنا تھا۔ منصوبے کے مطابق 18 جولائی کی صبح دسویں آرمی نے حملے کا آغاز کیا۔ ایک گھنٹے بعد چھٹی آرمی نے بھی حملہ کر دیا۔ مارن کے جرمن مقبوضہ علاقوں پر مغربی نصف پٹی آتش و آہن کے مناظر سے لبریز ہونے لگی۔

اِس لڑائی میں 350 ٹینک اتحادی افواج نے استعمال کیے۔ جنگِ عظیم اوّل میں ٹینکوں کا اِس سے بہتر استعمال قبل ازیں اتحادیوں کی جانب سے کبھی بھی نہیں کیا گیا تھا۔ رات ہونے تک اتحادی افواج 2 سے 5 میل تک پیش قدمی کر چکی تھی۔ اگلے روز دسویں آرمی جرمن فوج کی موجودہ پوزیشن کے لیے سب سے اہم رابطے کی سوئزون۔ کیٹیو۔ تھیری سڑک پر حملے کے لیے بڑھ رہی تھی۔

اِس سڑک پر دشمن کے حملے کے باعث سوئزون میں موجود دشمن کی فوج کی رسد و کمک کا راستہ بند ہو جاتا۔ لہٰذا اِس خدشے کے پیشِ نظر اِس علاقے سے دستبرداری کا فیصلہ کیا گیا۔ جرمن افواج نے بہترین انداز سے پسپائی اختیار کی اور مختلف مقامات جہاں سے انہیں اپنے اسلحہ، راشن

اور دیگر اشیاء کو بڑے پیمانے پر عقب میں منتقل کرنا تھا، دشمن کے حملوں کے جواب میں سخت مزاحمت بھی کی گئی۔

3 اگست تک جرمن افواج پسپا ہوتی ہوئی دریائے ویسل اور دریائے آئزن کے پیچھے اپنی مضبوط دفاعی پوزیشن پر مورچہ زن ہو گئیں۔ 6 اگست کو دو امریکی ڈویژن فوج نے جرمن افواج پر شدید حملہ کیا مگر کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اس طرح اپنے چھنے ہوئے ایک علاقے کی واپسی نے اتحادی افواج کو فتح کے جشن میں مصروف کر دیا۔ پیرس میں آتش بازی کی گئی اور شہر میں خوشی کی شدید لہر دوڑ گئی۔ جنرل فوش کو فرانس کے ''مارشل'' کا فوجی خطاب دیا گیا۔

اتحادی افواج کا دوسرا جوابی حملہ (ایمنز کا حملہ)

اتحادی افواج نے جولائی میں ہی ایمنز کے علاقے دشمن سے چھین لینے کا منصوبہ مرتب کر لیا تھا۔ منصوبے کے مطابق برطانوی چوتھی آرمی کو ایمنز کے مشرقی جانب دشمن پر حملہ کرنا تھا۔ اس فوج کو دائیں جانب سے فرانس کی پہلی آرمی نے سہارا فراہم کرتے ہوئے حملہ کرنا تھا۔ فرانس کی تیسری آرمی کو جنوبی کنارے سے دشمن پر دباؤ بڑھانا تھا۔

اِس حملے میں 600 سے زائد جدید ساخت کے ٹینک استعمال کیے گئے۔ جبکہ فضائی قوت بھی لاجواب اور بہت مؤثر تھی۔ 1900 لڑاکا اور بمبار طیارے دشمن پر آگ اور بارود برسانے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ جبکہ جرمن فوج تعداد اور تکنیکی سہولتوں کے لحاظ سے کمزور ترین تھی۔ اِس علاقے میں جرمن دوسری اور اٹھارہویں آرمی مورچہ بند تھیں۔ جن کے پاس چند ایک ٹینک اور 350 کے قریب طیارے تھے۔

اِس طرح بظاہر یہ لڑائی یک طرفہ دکھائی دیتی تھی۔ 8 اگست کی صبح 4:20 پر برطانوی فوج کے حملے کا آغاز ہوا۔ عمومی انداز کی بجائے حملے کے لیے خاص طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا۔ جس کے تحت برطانوی فوج کو اپنی پیادہ فوج کے پیچھے پیچھے ٹینکوں کے ذریعے پیش قدمی کرنی تھی۔ اِس کے ایک گھنٹے بعد فرانس کی پہلی آرمی نے حملہ شروع کیا۔

اِس جنگ میں جرمن فوج کو شدید نقصان پہنچا۔ ٹینکوں کی کثیر تعداد نے جرمن پیادہ فوج کو لوہے اور آہن کے سیلاب کے سامنے بے بس کر دیا۔ اور چھ (6) ڈویژن فوج نے فوراً ٹینکوں

کے مقابلے میں پسپائی یا ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر 16000 جرمن فوجی قیدی بنا لیے گئے اور دوپہر تک اتحادی فوج جرمن فوج کے عقب سے صرف 9 میل کے فاصلے تک پہنچ چکی تھی۔

جنرل لیوڈنڈروف کو کہنا پڑا کہ 8 اگست جرمن تاریخ کا ''سیاہ ترین دن'' ہے۔ اتحادی افواج کی اِس عظیم فتح نے اُن کے حوصلے بلند کردیے جبکہ جرمن افواج اور حکام کو شکست سامنے نظر آنے لگی۔ 10 اگست تک اتحادی فوج مزید 12 میل تک پیش قدمی کرچکے تھے اور دشمن پر سخت ضربیں لگاتے ہوئے اسے مسلسل پسپائی پر مجبور کررہے تھے۔

جنرل فوش نے جنرل ہیگ کو ہدایت کی کہ وہ مزید پیش قدمی جاری رکھتے ہوئے دشمن کی شکست خوردگی سے بھرپور فائدہ اُٹھائے۔ مگر جنرل ہیگ اِس حملے کو ختم کرتے ہوئے 21 اگست کو ازسرِنو حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اِس حملے میں جرمن افواج نے اپنی بھرپور دفاعی پوزیشن سنبھال لی تھی۔ اب انہوں نے اتحادی فوج کے حملے جا بھرپور جواب دیا اور اسے دھکیلنے لگے۔ جنرل ہیگ نے 22 اگست کو اپنے محفوظ دستوں کو لڑائی میں جھونک دیا جس سے جرمن حملے کی روک تھام ممکن ہوئی۔

23 اگست کو جنرل ہیگ نے 30 میل لمبے فرنٹ پر ایک عمومی حملے کا حکم دیا۔ اِس فرنٹ پر شمال کی جانب سے شدید حملے کے باعث جرمن فوج نے رئے۔ کولنیس کا علاقہ خالی کردیا۔ 31-30 اگست کو اتحادی فوج نے سینٹ کوئنٹن کی بلند پہاڑی پر قبضہ کرلیا۔ اگلے دو (2) دنوں میں وہ اریس پر اپنی بہترین مورچہ بندی سے پیچھے ہٹ چکے تھے۔ اور اب وہ پانچ ماہ قبل شروع ہونے والے حملوں سے قبل کی پوزیشن پر مشہور ہنڈن برگ لائن تک پسپا ہوچکے تھے۔

پے در پے شکستوں کے باعث ماہِ اگست کے دوران ایک کراؤن کونسل بنائی گئی جس میں جنگ کی صورتِ حال اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کیا گیا۔ جنرل لیوڈنڈروف نے استعفیٰ پیش کردیا جو نامنظور کرتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ جرمن افواج آخری دم تک فرانس میں اپنی دفاعی پوزیشن برقرار رکھنے کے لیے لڑائی جاری رکھیں گی۔

تاہم غیر جانب دار ممالک کی طرف سے امن و امان کے قیام کے لیے سفارتی کوششیں بھی بروئے کار لائی جائیں گی۔ جن میں ابتدائی طور پر تو کچھ پیش رفت ہوئی مگر بعد میں

کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔

اتحادی افواج کا تیسرا جوابی حملہ (سینٹ می ہیل کا حملہ)

جرمن افرادی قوت کی کمی کے باعث وہ درجہ بدرجہ سینٹ می ہیل کے علاقے سے پسپائی اختیار کر رہے تھے۔ امریکہ کی نو آموز فوج نے اِس خبر کو سنتے ہی مناسب سمجھا کہ بھاگتے ہوئے دشمن پر حملہ کر کے اُس کے پہلے سے پسپا اور دستبردار ہونے کے پروگرام کا سہرا اپنے سر لیا جائے اور اپنی فوج کا مورال بلند اور اتحادیوں میں اپنی قیمت میں اضافہ کیا جائے۔

اِس مقصد کے لیے امریکی جنرل پیر شنگ نے جنرل فوش سے حملے کی منظوری لے لی۔ ادھر جرمن پسپائی اور اس علاقے سے دستبرداری اپنے آخری مراحل میں تھی۔ 11 ستمبر کو جرمن فوج اپنے آخری توپ خانے کے بھاری ہتھیار بھی عقب کی جانب منتقل کر رہے تھے۔ اگلے ہی روز امریکی جنرل پیر شنگ نے جرمن فوج پر بھاری حملہ کر دیا۔ پسپا ہوتے ہوئے جرمن فوجیوں نے ہلکی ہلکی مزاحمت کرتے ہوئے کامیابی سے پسپائی کا عمل جاری رکھا۔

اتحادی افواج کے آخری حملے

جنرل فوش اور دیگر اتحادیوں کے خیال کے مطابق مارچ 1919ء تک آخری حملوں کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔ مگر گزشتہ تین جوابی حملوں میں جرمن فوج کی پے در پے شکست نے جہاں اُن کے حوصلے بلند کیے وہیں انہیں جرمن فوج کی اِصل صورتِ حال سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اب فوش نے قدم بقدم آگے بڑھتے ہوئے دشمن پر کاری ضربیں لگانے اور اسے پسپا کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ جرمن فوج کو افرادی قوت کی کمی اور بحری تجارت کی بندش کے باعث معاشی تنگدستی کے شدید بحران کا سامنا ہے۔

اِس صورتِ حال نے اسے یہ سوچنے پر قائل کیا کہ وہ اسی سال دشمن پر آخری حملوں کا سلسلہ کامیابی سے شروع کر سکتا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ ابھی بھی 1919ء میں فیصلہ کن لڑائی لڑنے پر مصر تھی۔ لہٰذا وہاں جنگ کی اصل صورتِ حال واضح کرنے کے لیے میدانِ جنگ سے جرنیل روانہ کیے گئے جنہوں نے صورتِ حال بتاتے ہوئے اسی سال فیصلہ کن حملوں کا سلسلہ

شروع کرنے کی منظوری حاصل کی۔

اب اتحادی فوج 220 ڈویژن پر مشتمل تھی۔ جن میں سے 102 فرانسیسی، 60 برطانوی، 42 امریکی، 12 بیلجیئن، 2 اطالوی اور 2 پرتگالی تھے۔ اِن میں سے تمام امریکی ڈویژن اپنی پوری قوت کے حامل تھے جبکہ دیگر اتحادی ڈویژن مطلوبہ قوت سے نسبتاً کمزور تھے۔ 160 ڈویژن فوج کو محاذِ جنگ میں لڑائی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ جبکہ 60 ڈویژن فوج بطور محفوظ فوج عقب میں تعینات کی جانی تھی۔

دوسری جانب جرمنی کے کل 197 ڈویژن تھے۔ 184 ڈویژن فوج کو لڑائی کے لیے مورچہ بند رہنے اور 84 ڈویژن کو عقب میں بطور محفوظ فوج صف آراء کیا گیا تھا۔ اِن تمام ڈویژنوں میں سے صرف 51 ڈویژن ہی بہتر طور پر لڑنے کی صلاحیت کے حامل تھے جبکہ بقیہ تمام ڈویژن نسبتاً کمزور واقع ہوئے تھے۔

اتحادی افواج کی ازسرِ نو ترتیب اور تنظیم کی گئی اور جنرل فوش نے بلا تخصیص نسل و ملک تمام افواج کو یکساں مخلوط انداز سے منظم کیا کہ فرانسیسی فوج کی سربراہی برطانوی، امریکی یا دیگر جرنیلوں کے سپرد کر دی گئی۔ اسی طرح برطانوی فوج فرانسیسی یا دیگر جنرل کی قیادت میں دے دی گئی۔ امریکی کسی دیگر نسل کے جرنیل کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اِس طرح باہمی ربط اور شیر و شکر کرتے ہوئے کمانڈ اور کنٹرول کا کام انتہائی آسان ہو گیا۔

26 ستمبر سے 31 اکتوبر کی کارروائیاں:

ا۔ جنوبی پنسر (میوز۔آرگان)

دریائے میوز کے ساتھ جنوبی پنسر کے علاقے پر جرمن فوج پر شدید حملوں کے لیے امریکی تازہ دم اور نو آموز فوج کو ہدایت کی گئی تھی۔ جو ابھی تک سینٹ می ہیل کے محاذ پر مورچہ بند تھی۔ اِس نئی مہم کے لیے فرانس کی 220000 فوج جو پہلے اِس علاقے میں تعینات تھی، کو فوری طور پر اپنے نئے محاذ کی جانب روانہ ہونا تھا جبکہ اس کی جگہ 600000 امریکی فوج کو سینٹ می ہیل سے یہاں آکر مورچہ بند ہوتے ہوئے دشمن پر حملہ کرنا تھا۔

اِس محاذ پر حملے کے لیے امریکی فوج کی ہمت افزائی، قیادت اور نگرانی کے لیے فرانس

کی چوتھی آرمی کو بھی دائیں جانب سے امریکی فوج کے سہارے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ 26 ستمبر کی صبح 5:25 بجے فرانس کی آرمی نے ابتدائی شدید ترین گولہ باری کے بعد پیش قدمی شروع کی۔ چند منٹ بعد امریکی فوج نے جنرل پرشنگ کی قیادت میں جرمن فوج پر حملہ کر دیا۔ فرانسیسی فوج کے راستے میں بارودی سرنگوں کے باعث پیش قدمی کی رفتار آہستہ رہی۔ 27 ستمبر کی شام تک وہ صرف 3 میل تک ہی پیش قدمی کر سکے۔

اگلے تین روز شدید لڑائی جاری رہی۔ یکم اکتوبر تک فرانس کی چوتھی آرمی صرف 6 میل کا مزید فاصلہ طے کر سکی تھی۔ اب جرمن مزاحمت شدید ترین ہو چکی تھی اور فرانس کی چوتھی آرمی کو ایک ایک انچ کے لیے سخت دشواریوں کا سامنا اور بہت زیادہ قربانیاں پیش کرنی پڑ رہی تھیں۔ 9 اکتوبر تک مزید ڈیڑھ میل ہی پیش قدمی کی جا سکی۔ تاہم فرانسیسی فوج عزم اور حوصلے کے ساتھ لڑتی رہی دوسری جانب جرمن فوج دفاع کے لیے ہر ممکن اقدامات کر رہی تھی۔ 31 اکتوبر تک چوتھی آرمی کل 20 میل تک پیش قدمی کر چکی تھی۔

امریکی پہلی آرمی کے مقابلے میں صرف 4 ڈویژن جرمن فوج مورچہ بند تھی۔ 26 ستمبر کو امریکی فوج کے اچانک حملے نے ابتدائی فتوحات حاصل کیں اور انجانے میں جرمن فوج شام تک 5 میل تک پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ بعد ازاں انہوں نے سنبھل کر امریکی فوج کے زوردار حملوں کا دفاع کرنا شروع کیا۔ امریکی فوج کی پیش قدمی یکم اکتوبر تک جاری رہی تب جرمنی کے شدید جوابی حملے سے فوج میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ میدان چھوڑنے لگے۔

4 اکتوبر کو امریکی فوج کو ازسرِ نو منظم کیا گیا اور وہ دوبارہ محاذ پر حملوں کے قابل ہوئی۔ اب امریکی پہلی آرمی کی مدد کے لیے دوسری آرمی کو بھی بھجوا دیا گیا تھا۔ پورا ماہ لڑائی تیزی سے جاری رہی 31 اکتوبر تک امریکی فوج کی بھاری نفری اپنی عددی، معاشی، سیاسی، تکنیکی اور سائنسی برتری کے باوجود صرف 10 میل تک مجموعی پیش قدمی کر سکی۔

ب۔ مغربی پنسر (کیمبرائی۔ سینٹ کوئنٹین)

شمال سے جنوب کی جانب؛ کیمبرائی سے سینٹ کوئنٹین کی فرنٹ لائن سے جرمن فوج کو پسپا کرنے کے لیے فرانس کی پہلی آرمی کے ساتھ برطانیہ کی پہلی، تیسری اور چوتھی آرمی مامور کی گئی

تھی۔27 ستمبر کو حملے کا آغاز کیا گیا۔ حملے کو خفیہ رکھنے کے لیے ابتدائی گولہ باری نہ کی گئی اور پیادہ فوج کے پیچھے ٹینکوں کے ذریعے پیش قدمی کی گئی۔ ابتدائی طور پر کسی قدر کامیابی ہوئی مگر متوقع کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

28 ستمبر کی رات تک اتحادی فوج دشمن کی دفاعی لائن توڑتے ہوئے 6 میل تک پیش قدمی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جرأت مندانہ پیش قدمی کے باعث بوکھلاہٹ میں جنرل لیوڈنڈروف نے اپنے مارشل جنرل ہنڈن برگ کو رپورٹ میں تحریر کیا کہ جرمنی کو شکست سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر جنگ بندی کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔

29 ستمبر کی شام تک فرانس کی پہلی آرمی جرمنی کی مشہور دفاعی ہنڈن برگ لائن کی پہلی پوزیشن پر قابض ہو چکی تھی۔ اگلے روز کیمبرائی کا محاصر کر لیا گیا تھا جو 9 اکتوبر تک جاری رہا جب جرمنی فوج نے کیمبرائی خالی کر دیا۔ دوسری جانب فرانس کی پہلی آرمی نے سینٹ کوئنٹین پر قبضہ کر لیا اور مزید پیش قدمی کرتے ہوئے ہنڈن برگ لائن کے تیسرے حصے پر بھی قابض ہو گئی۔

اب لیوڈنڈروف نے اپنی فوج کو دریائے سیل کے پیچھے نئی مورچہ بندی کرنے کی ہدایت کی۔ اس کا خصوصی جوابی حملے کرنے والا ڈویژن افرادی قوت کی شدید کمی اور پیادہ فوج کے بہت تیزی سے پسپا ہونے کے باعث جوابی حملوں کی مؤثر کارروائی کرنے سے قاصر رہا تھا۔ 17 اکتوبر کو اتحادی فوج دریائے سیل پر جرمن مورچہ بندیوں پر حملہ آور ہوئی۔ لاکیٹاؤ کے جنوب میں اتحادی فوج نے لڑائی کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہوئے 20 اکتوبر تک دشمن کو شہر سے باہر نکل جانے پر مجبور کر دیا۔

اب وہ دریائے سیل کے شمالی علاقے پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ 31 اکتوبر تک جرمن فوج دریائے سیل سے پسپا ہو کر ایک نئی دفاعی لائن دریائے شیلڈ کے پیچھے قائم کر چکی تھی۔ جہاں اب اتحادی افواج اُن کے سامنے مورچہ زن ہونے کے بعد حملے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

ج۔ فلنڈرز کا حملہ

بیلجیم کے بادشاہ البرٹ کی قیادت میں فرانس کی چھٹی، برطانیہ کی دوسری اور بیلجیم کی آرمی پر مشتمل فوج نے 28 ستمبر کو حملے کا آغاز کیا۔ یکم اکتوبر تک بادشاہ البرٹ کی فوج یپرس کے

قصبے پر دوبارہ قبضہ کرتے ہوئے 8 میل تک پیش قدمی کرنے میں کامیاب رہی۔ جنرل لیوڈنڈروف کو کیمبرائی کے محاذ کے لیے محفوظ فوج کی ضرورت تھی جس کے لیے اُس نے اِس محاذ سے کچھ فوج مغربی پنسر کے محاذ پر بھجوادی۔

اِس طرح اِس محاذ پر فوجی قلت کے باعث جرمن فوج کو سخت دشواریوں کا سامنا تھا۔لیکن چونکہ یہ پیرس کا قریبی علاقہ تھا۔ جہاں اِن مہینوں میں شدید برسات متوقع ہوتی ہیں۔ اور اتحادی فوج کے حملوں میں سب سے بڑی رکاوٹ برسات تھی جس نے فلینڈرز کے علاقے میں محدود سڑکوں کو تقریباً بند کر رکھا تھا اور رسد کی آمد ایک مسئلہ بن جاتی تھی۔

14 اکتوبر تک شدید برسات کی وجہ سے حملوں کا سلسلہ ترک کرنا پڑا۔ تاہم بعدازاں اتحادی فوج نے موسم کی بہتری پر جرمن فوج کو اپنے حملوں کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ 20 اکتوبر تک وہ دشمن کو دریائے لیز تک دھکیلنے میں کامیاب ہوگئے۔ 28 اکتوبر کو مغربی پنسر کی مہم میں دریائے سیل کی شکست پر جنرل لیوڈنڈروف نے جرمن آرمی کو رضاکارانہ طور پر پسپا ہوتے ہوئے دریائے شیلڈ کے پیچھے نئی دفاعی لائن پر جمع ہونے کا حکم دیا۔

د۔ مرکزی فرانس کی کارروائیاں

جنوبی پنسر اور مغربی پنسر کے درمیان فرانس 4 آرمیوں نے جرمن فوج پر حملوں کی کارروائی کو جاری رکھا۔ اِن میں سے 2 آرمیاں برطانوی اور امریکی افواج کے ساتھ شامل تھیں جبکہ باقی 2 پانچویں اور دسویں آرمی درمیانی علاقے میں دشمن کو پیچھے ہٹانے کے لیے حملہ آور ہوئیں۔ اِن کا کردار اِس کے سوا کچھ بھی نہ تھا کہ وہ دشمن کو مسلسل ڈراتے ہوئے اِس علاقے میں بھاری نفری رکھنے پر مجبور کریں تاکہ دشمن پنسر کے دونوں محاذوں پر یہاں سے کمک روانہ نہ کر سکے۔

31 اکتوبر کو جرمن فوج ایک مختصر علاقے کی دفاعی لائن تک پسپا ہوگئی۔ اب دشمن کی جانب سے کسی جوابی حملے کے متوقع نہ ہونے پر جنرل فوش نے فرانس کی فوج کو ازسرِنو منظم کرنے کی کوشش کی اور اِس مختصر محاذ پر تھوڑے دستے چھوڑتے ہوئے ایک نئی آرمی تشکیل دی جو دسویں آرمی کے نام سے موسوم ہوئی۔ جبکہ پہلے سے دسویں آرمی کا نام تیسری آرمی کردیا گیا۔ نئی بنائی

جانے والی دسویں آرمی کو لورین کے محاذ پر فرانس کی آٹھویں آرمی کے ساتھ مل کر ایک نئے حملے کا آغاز کرنا تھا۔

یکم تا 11 نومبر کے اتحادی حملے:

یکم نومبر کو مغربی محاذ کے جنوبی جانب فرانس کی چوتھی اور امریکہ کی پہلی آرمی نے بور گوگن ڈ وڈ پر حملہ کر دیا۔ تین دنوں کی شدید لڑائی کے بعد جرمن فوج کے شکست خوردہ عزم اور کم ہمتی نے انہیں شہر سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب اتحادی فوج نے اِس خطے میں مزید آگے بڑھنا شروع کیا۔ اور علاقے کے اہم ریلوے اور سڑکوں کے جال پر قابض ہو گئے۔

7 نومبر تک اس سیکٹر میں کارفرما اتحادی افواج دریائے میوز کی بلندیوں پر قابض ہو چکی تھیں اور اب وہ سیڈن کی جانب پیش قدمی کرنے کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ اتحادی سپاہی اب تک تقریباً 20 میل تک پیش قدمی کر چکے تھے۔ 11 نومبر کو صلح نامہ پر دستخط سے قبل فرانس کی افواج سیڈن پر قابض ہو کر اپنی 1870ء کی شکست کا سیاہ دھبہ دھو چکے تھے۔

مغربی محاذ کے مغربی خطے میں برطانوی اتحادی فوج اپنے حملوں کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے تھے۔ جنرل ہیگ شیلڈ کی جرمن دفاعی لائن سے جرمنوں کو واپس دھکیلنے کا خواہاں تھا۔ اُس نے دشوار گزار علاقوں سے پہلو بچاتے ہوئے آخری حملے کے لیے والنسینس کے جنوب سے حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا۔

اتحادی فوج نے 2 نومبر کی رات تک شہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب جنرل ہیگ نے 30 میل کے فرنٹ پر ایک زبردست حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اتحادی پیش قدمی کے آگے جرمن مزاحمت ماند پڑ گئی اور وہ اپنی دفاعی لائن شیلڈ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ پسپا ہوتے ہوئے جرمن فوجیوں کو ذرائع نقل و حمل کی کمی، ریلوے نظام کی خرابی، موسم کی آفت آفرینی اور اتحادی فضائی حملوں کی آتش پاشی نے بری طرح بے بس کر دیا تھا۔

جبکہ اتحادی افواج جوں جوں آگے بڑھ رہی تھیں اُن کا فرنٹ وسیع ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جو اُن کی طاقت کو پھیلاؤ میں بڑھ جانے کے باعث کمزور کرتا چلا جا رہا تھا۔ مزید یہ کہ اُن کی رسد کا نظام پھیلاؤ کے باعث شدید دشواریوں کے ساتھ بمشکل تمام قائم تھا۔ یہ وجوہات تھیں جن کے

باعث وہ شکست خوردہ دشمن پر بھرپور انداز سے حملہ آور ہو کر اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے میں بری طرح ناکام رہے تھے۔

اتحادی افواج 11 نومبر تک اِس خطے میں بے وے، ایوسنس، ماؤ بیوگ، ہرسن، ٹورنائی اور ریناکس پر قبضہ کر چکی تھیں۔ جنگ بندی سے چند گھنٹے قبل ہی کینیڈا کی فوج مانز میں داخل ہو چکی تھی۔ اِس طرح یہ محاذ بھی خاموش ہو گیا۔ اور جنگِ اعظیم اوّل کا خاتمہ ہو گیا۔ جرمنی کا مغربی محاذ خاموش ہو جانے پر اب جنگِ عظیم اوّل کا صرف ایک محاذ جاری تھا۔

یہ محاذ جرمن افریقی نوآبادیات میں مشرقی افریقہ میں جاری تھا۔ ناقابلِ شکست جرمن جنرل لیٹوور بیک نے جرمن شکست کی خبر سُن کر جنگ بندی 14 نومبر کو تسلیم کر لی اور اِس طرح جنگِ عظیم اوّل کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا۔ اتحادی افواج کے ایک سو روزہ آخری حملے نے جرمن فوج کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ معیشت تباہ ہو چکی تھی اور افرادی قوت کی شدید قلت جرمنی کی سرحدوں کے دفاع کو بھی مشکل بنا رہی تھی۔ اس لیے جرمن حکام نے مناسب سمجھا کہ وہ دشمن کی ذلت آمیز شرائط کے آگے ہتھیار ڈال دیں۔

اٹلی کے محاذ

اٹلی کے محاذ پر جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کی مشترکہ افواج کو گزشتہ سال بہت زیادہ کامیابی حاصل رہی تھی۔ وہ اٹلی کی افواج کو دریائے پی ایوتک میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر چکے تھے۔ مگر بعد ازاں وہاں سے ایک غیر متوقع اور انتہائی شدید مزاحمت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اِس طرح انہیں معلوم تھا کہ بظاہر حاصل ہونے والی شاندار فتوحات کے باوجود دراصل یہ مہم اپنے اصل مقاصد کے حصول میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔

اٹلی کا محاذ ہر وقت ایک خطرے کی علامت بنا آسٹریا۔ ہنگری کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اِس محاذ کے جاری رہنے کی صورت میں نقصان صرف آسٹریا۔ ہنگری ہی کا نہ تھا بلکہ جرمنی کو بھی اپنے مغربی محاذ کے آخری اور فیصلہ کن حملے کے لیے درکار فوج میں کمی اور اتحادیوں کے جوابی حملے کی صورت میں دفاع کے سلسلے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

دریائے پی ایو کی لڑائی

موسمِ بہار 1918ء میں جرمنی نے امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے سے قبل مغربی محاذ پر فیصلہ کن حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جس کی وجہ سے مغربی محاذ کے دونوں فریقوں نے اپنے اپنے حلیف ممالک سے اُن کے محاذ پر حملہ آور ہونے کی زور دار اپیلیں کیں۔ جرمنی نے آسٹریا۔ ہنگری سے اٹلی پر بھرپور اور فیصلہ کن حملہ کرنے کی اپیل کی۔ جبکہ اتحادی فوج کے سربراہ جنرل فوش نے اٹلی سے دریائے ایسونزو پر ایک سخت ترین حملہ کرنے کی استدعا کی۔

اِس سے قبل جرمنی کے سات (7) ڈویژن جو اٹلی کے محاذ پر لڑ رہے تھے فوجی ضرورت کے پیشِ نظر مغربی محاذ پر منتقل کیے جا چکے تھے۔ جبکہ مارچ میں چھ (6) برطانوی اور فرانسیسی ڈویژن بھی مغربی محاذ پر روانہ کر دیے گئے تھے۔ جبکہ باقی ماندہ پانچ ڈویژن اٹلی میں ٹرینٹیو کی پہاڑیوں سے حملے کے لیے وہاں منتقل کر دیے گئے تھے۔ مزید یہ کہ اپریل میں دو (2) ڈویژن اٹلی کی فوج بھی فرانس روانہ کرنا پڑی تا کہ مغربی محاذ پر افرادی قوت کی کمی کو پورا کیا جا سکے۔

اٹلی کے چیف آف سٹاف جنرل آرمینڈو ڈیاز نے جنرل فوش کے ٹرینٹیو کے محاذ سے حملہ کرنے کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ دوسری جانب آسٹریا۔ ہنگری نے جرمن حکام کی خواہش کے مطابق حملے کا فیصلہ کر لیا۔ اِس حملے کے لیے آسٹریا۔ ہنگری کی 58 ڈویژن فوج کو تیاری کا حکم دیا گیا۔ اُن کے مدِ مقابل اٹلی کی فوج 57 ڈویژنوں پر مشتمل تھی جن میں 5 ڈویژن فوج برطانیہ اور فرانس کی بھی شامل تھی۔

آسٹریا۔ ہنگری کی جانب سے اِس مہم میں ٹرینٹیو کے محاذ پر جنرل کونریڈ قیادت کر رہا تھا۔ جبکہ دریائے پی ایو کے محاذ پر جنرل بورواویک کے ذمے فوجی قیادت سونپی گئی تھی۔ شخصی تناؤ اور ناقص ذرائع رسل و ترسیل کے باعث آسٹریا۔ ہنگری کی فوج اور محفوظ دستے دو مساوی حصوں میں بٹ گئے۔ اِس طرح ایک بھرپور متحدہ حملے کی بجائے اٹلی کی اولیں صفوں پر دو مختلف مقامات پر حملوں کا فیصلہ کیا گیا۔

13 جون کو ٹرینٹیو کے جنوب میں درہ ٹونال پر توجہ بٹانے والے حملوں کا آغاز کیا گیا۔ اور 15 جون کو باقاعدہ حملوں کا آغاز ہو گیا۔ شام تک ٹرینٹیو کے محاذ پر معمولی پیش رفت

ہوئی۔ تاہم اگلے ہی دِن اٹلی کی فوج کے بھرپور جوابی حملے اور شدید گولہ باری نے جنرل کونرڈ کو واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر دم لیا۔

دریائے پی ایو کے محاذ پر جنرل بوروایوک کو ابتدائی طور پر کامیابی حاصل ہوئی۔ اور وہ تین مقامات سے دریا پار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک مقام سے وہ تین میل پیش قدمی کرتا ہوا دشمن کی صفوں میں شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تاہم اگلے آٹھ (8) روز تک دریائے پی ایو کے محاذ پر شدید ترین اور خونخوار طریقے سے جنگ کی بھٹی گرم رہی۔ اتحادی فوج کے لڑاکا طیاروں نے آسٹریا۔ ہنگری کے عارضی کشتی کے پلوں پر شدید گولہ باری کا سلسلہ جاری رکھا اور اُن کی اسلحہ اور راشن کی سپلائی کو بری طرح متاثر کیا۔

اٹلی کی جانب سے شدید جوابی حملوں اور نہایت زوردار اور تباہ کن فضائی حملوں کے باعث آسٹریا۔ ہنگری کی فوج کو اپنے مکمل طور پر تباہ ہوجانے اور راشن و اسلحہ کی سپلائی بند ہوجانے کا خدشہ پیدا ہوگیا۔ تب جنرل بوروایوک نے 22 اور 23 جون کی رات اپنی فوج کو دریائے پی ایو کے دوسری جانب واپس جانے کا حکم دیا۔ 24 جون تک افواج کی واپس اپنی آغاز والی جگہ پر مورچہ بندی مکمل ہوگئی۔

فرانس کے جنرل فوش جسے یکم جولائی 1918ء کو اتحادی افواج کا سپریم کمانڈر بنادیا گیا تھا، نے جنرل ڈیاز کو وسط جولائی میں آسٹریا۔ ہنگری کی شکست خوردہ فوج پر ایک زوردار جوابی حملہ کر کے اسے مکمل طور پر شکست دینے کے لیے زور دیا۔ مگر جنرل ڈیاز نے اپنے معتمد جنرل پی ایٹرو بیڈیگلیو کے مشورے سے اِس حملے کو اپنی تیاری، از سرِ نو تنظیم اور مسلح ہونے تک مؤخر کردیا۔

وٹوریو وینیٹو کی لڑائی

جنرل ڈیاز نے آسٹریا۔ ہنگری پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے پوری تندہی سے تیاری شروع کردی۔ اُس کے پاس فیصلہ کن حملے کے لیے 57 ڈویژن فوج جو 51 اٹلی، 3 برطانوی، 2 فرانسیسی، 1 چیکوسلواکیہ کے ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔ اِس کے علاوہ امریکہ کی ایک پیادہ رجمنٹ بھی شامل کی گئی تھی۔ جنرل ڈیاز کے پاس 7700 توپیں تھیں جبکہ اُس کے مدِ مقابل آسٹریا۔ ہنگری

کے 58 ڈویژن اور 6000 گنز میدان میں موجود تھیں۔

اٹلی کی جانب سے سب سے اہم حملہ مرکز میں موجود آٹھویں آرمی نے کرنا تھا جو اٹلی کی 14 ڈویژن فوج پر مشتمل تھی۔ اِس آرمی کی قیادت جنرل اینزیکو کیویگلیو کر رہا تھا۔ اس کی دائیں جانب سے مدد کے لیے دسویں آرمی برطانوی جنرل فریڈرک روڈولف لیمبرٹ کر رہا تھا۔ یہ آرمی اٹلی اور برطانیہ کی دو دو ڈویژن فوج پر مشتمل تھی۔ جبکہ بائیں جانب سے آٹھویں آرمی کی مدد کے لیے بارھویں آرمی مامور تھی جو ایک فرانسیسی اور تین ڈویژن اٹلی کی فوج پر مشتمل تھی۔ بارھویں آرمی کی قیادت فرانسیسی جنرل جین قیصر گریزیانی کر رہا تھا۔

منصوبے کے مطابق اٹلی کی چوتھی آرمی نے 24 اکتوبر کی صبح گراپا کے مقام پر توجہ ہٹانے والے حملوں کا آغاز کیا۔ یہ آرمی بنیادی حملہ کرنے والی آٹھویں آرمی کے بائیں جانب بارھویں آرمی کے انتہائی بائیں جانب صف آرا تھی۔ اور اِس کے حملوں کا مقصد آٹھویں آرمی کے سامنے موجود دشمن کی بھرپور قوت میں کمی کرنے کے لیے اُس کی محفوظ آرمی کو اپنی جانب متوجہ کر کے وہاں سے ہٹانا تھا۔

سیاسی اور سفارتی محاذ سے قطع نظر آسٹریا۔ ہنگری کی فوج تین دِن تک اٹلی کی چوتھی آرمی کے حملوں کا منہ توڑ جواب دیتی رہیں۔ تاہم چوتھی آرمی آسٹریا۔ ہنگری کی محفوظ فوج کو اپنے مدِ مقابل لانے میں کامیاب ہوگئی۔ اب اٹلی کی آٹھویں، دسویں اور بارھویں آرمیوں نے اپنے اپنے سامنے سے دریائے پی ایو پار کرنا شروع کر دیا۔ 27 اکتوبر تک ان افواج نے تین مقامات پر عارضی پلوں کے قیام کی بنیاد رکھ دی مگر 28 اکتوبر کی سہ پہر تک اٹلی کے لیے صورتِ حال غیر تسلی بخش اور مایوس کن رہی۔

28 اکتوبر کی شام دسویں آرمی کے دشمن سے خالی کروائے ہوئے پل پر سے آٹھویں آرمی کا کچھ حصہ گزرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس وقت اٹلی کی آٹھویں آرمی کے بالمقابل صف آرا آسٹریا۔ ہنگری کی چھٹی آرمی کو اعلیٰ کمان کی جانب سے اولین دفاعی صف بندی سے پیچھے ہٹتے ہوئے دوسری دفاعی لائن پر مورچہ بند ہونے کی ہدایت موصول ہوئی۔

29 اکتوبر کا دِن فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اٹلی کی تین (3) حملہ آور آرمیوں کے شدید اور خونخوار حملوں کے جواب میں آسٹریا۔ ہنگری کی مزاحمت دم توڑتی نظر آئی۔ محاذِ جنگ میں کہیں تو

آسٹریا۔ ہنگری کی فوج بے جگری سے لڑ رہی تھی، کہیں دفاعی انداز میں اور کہیں گردوغبار کی طرح اٹلی کی فوج کے زوردار حملوں کے آگے اڑتی چلی جارہی تھی۔

بدنظمی، انتشار اور شکست خوردگی کے عالم میں آسٹریا۔ ہنگری کی محفوظ فوج کے کچھ حصوں نے جوابی حملہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ باقی ماندہ نے بغاوت کر دی۔ تاہم اصل شکست وریخت کا عمل 30 اور 31 اکتوبر کی رات پیش آیا جب آسٹریا۔ ہنگری کی بے ہنگم انداز سے پسپا ہوتی ہوئی فوج سے بچھڑنے والے جتھوں سے انفرادی طور پر جھڑپوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

3 نومبر کی شام کو ٹرینٹیو پر اٹلی کی فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اٹلی کی فوج بکھری اور منتشر آسٹریا۔ ہنگری کی فوج کے دستوں کو بڑے پیمانے پر قیدی بنا رہی تھی۔ اور شام کے وقت پاڈوا کے نزدیک ویلا گویزٹی میں جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اِس لڑائی میں تقریباً 500000 آسٹریا۔ ہنگری کے فوجی قیدی بنائے گئے۔

اٹلی کی جانب سے جنگِ عظیم اوّل کے دوران اتحادی ممالک کا بہت ساتھ دیا گیا۔ اٹلی نے اپنی افواج مغربی محاذ اور سیلونیکا کے محاذ پر بھی روانہ کیں۔ سب سے اہم کام اٹلی کی بحریہ نے کیا۔ جو 260895 سربیائی افراد کو بحفاظت البانیہ کے ساحلوں پر پہنچایا۔ اٹلی کی تین سالہ عظیم کوششوں اور عالی ہمتی کی وجہ سے دشمن کی ذلت آمیز شکست اور اٹلی کی شاندار فتح حاصل ہوئی اور اس طرح جنگِ عظیم اوّل کا ایک اہم محاذ اختتام پذیر ہوا۔

بلکان کے محاذ

بلکان کا محاذ جنگ کے آخری سال بہت اہم رہا۔ اِس سال سیلونیکا میں موجود اتحادی افواج نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اِس محاذ سے جرمن افواج کو جرمن مغربی محاذ پر طلب کر لیا گیا تھا۔ کیونکہ وہاں جرمن فوج اپنے آخری حملے اور بعد ازاں دشمن کے جوابی حملے کے باعث بری طرح مصروف تھی۔ آسٹریا۔ ہنگری کی فوج اٹلی کی فوج کے کامیاب حملوں کی تاب نہ لا سکی تھی۔ اور وہاں فوجی کمک کی طالب تھی۔

اِس طرح بلکان کے محاذ پر اب بلغاریہ تنہا میدان میں مصروفِ عمل تھا۔ اور اسے اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور، مسلح اور ہر طرح کی سہولیات سے آراستہ اتحادی فوج سے مقابلہ کرنا تھا۔

اُس کی معیشت بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اتحادی ممالک نے تجارت کے تمام تر راستے بند کر رکھے تھے اور ملک کے اندر اشیائے خورد و نوش کی قلت ہو رہی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں اسلحہ، بارود اور توپ خانہ وغیرہ کی شدید کمی کا بھی سامنا تھا۔

بلغاریہ کی شکست

جولائی 1918ء میں بلقان کے محاذ پر جنرل فرینچٹ ڈی ایسپیرے کو مغربی محاذ سے منتقل کیا گیا۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور بہترین منتظم تھا۔ اُس کی قیادت میں 350000 فوج پوری طرح مسلح اور بلند ہمتی کے ساتھ لڑنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ دوسری جانب بلغاریہ کی فوج کی تعداد 310000 تھی جس کے پاس نہ ہی مکمل طور پر اسلحہ، وردیاں، خوراک اور گولہ بارود تھا۔ اور نہ ہی اِس فوج کی ہمت جواں اور حوصلے بلند تھے۔

اتحادی فوج کے اعلیٰ حکام نے جرمنی کے خلاف فیصلہ کن لڑائی کے ساتھ ساتھ بلقان کے محاذ پر بھی ایک فیصلہ کن لڑائی لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے مطابق 14 ستمبر 1918ء کو بلغاریہ کے سرحدی مورچوں پر شدید گولہ باری کا آغاز کر دیا گیا۔ اِس گولہ باری کی آڑ میں سربیا کے 6 اور فرانس کے 2 ڈویژن آگے بڑھنے لگے۔ 15 اور 16 ستمبر کو ایک بھرپور حملہ کیا گیا۔

اِس حملے میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، سربیا اور یونان کی افواج شریک ہوئیں۔ اِس شدید حملے کے باعث بلغاریہ کی فوج کو پسپا ہونا پڑا اور 17 ستمبر تک اتحادی فوج 20 میل تک دشمن کی فوج کو پیچھے دھکیلتے ہوئے پیش قدمی کرتی رہی۔

سربیا کی فوج خصوصی طور پر عقاب کی طرح دشمن پر حملہ آور ہوتی اور شیر کی طرح پچھاڑتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی۔ 27 ستمبر تک صوفیہ کی طرف جانے والی سڑک اتحادیوں کے قبضے میں تھی اور وہاں انہیں بلغاریہ کی فوج کے بچے کھچے دستوں کی جانب سے معمولی مزاحمت کا سامنا تھا جو جان بچا کر واپس اپنے ملک کی طرف عازمِ سفر تھے۔

جبکہ مرکزی ممالک کی بچی کھچی فوج پر مشتمل گیارہویں آرمی بلغاریہ کی باقی فوج سے علیحدہ ہو جانے پر ہتھیار ڈال چکی تھی۔ اب بلغاریہ کے باقی فوجی جو اپنی دیہاتی زندگی چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہوئے تھے فوری طور پر اپنے ملک میں جا کر وہاں فصلوں کی کٹائی میں مصروف ہونا چاہتے تھے اور جنگ کے بکھیڑوں سے نکل کر صلح اور امن کے خواہاں تھے۔

(مرکزی قوتوں کا دورانِ جنگ مجموعی پھیلاؤ)

سیلونیکا کی مہم کے بارے میں مبصرین کی رائے بہت متضاد رہی ہے۔ تاہم ایک بڑی اکثریت کے مطابق یہ مہم فوج اور ذرائع کا ضیاع تھی۔ کیونکہ یہ مہم اپنے مقاصد اپنے مطلوبہ وقت پر حاصل کرنے میں ناکام رہی اور جرمن۔ ترک نقل وحمل کے ذرائع اتحادی افواج کے خلاف مسلسل استعمال ہوتے رہے۔

مزید یہ کہ اِس محاذ کے جاری ہوجانے کے باوجود بہت زیادہ جرمن اور آسٹریائی فوج کو اِس محاذ پر مصروف رکھنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ اِس محاذ کی صرف ایک افادیت بلغاریہ کی شکست تھی۔ جو ایک ماہ بعد جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کی شکست پر بھی حاصل ہوسکتی تھی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ مہم یونان کی حفاظت کے لیے جاری رکھی گئی تھی۔ مگر یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یونان کی فوج بلغاریہ کی فوج کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور اور مضبوط تھی۔

بلکان کے محاذ پر تین (3) سال تک اتحادی افواج سیلونیکا کے ملیریا زدہ علاقوں میں پھنسی رہی۔ برطانیہ کے ریکارڈ کے مطابق پوری مہم کے دوران ہسپتال میں داخل کیے جانے والے فوجیوں کی تعداد 481262 تھی جن میں سے صرف 18187 فوجی میدانِ جنگ میں زخمی ہوئے تھے۔ جون سے اگست 1916ء کے دوران فرانس نے اسی قسم کے مریضوں کی تعداد 35122 بتائی ہے جن میں سے صرف 672 زخمی ہوئے تھے۔

ترکی کے محاذ

برطانوی فوج کے فلسطین میں یروشلم ۔ جافہ کی پٹی پر قابض ہونے کے فوراً بعد ہی برسات کا شدید سلسلہ شروع ہوگیا۔اور جنرل ایلن بے کو اپنی مزید کارروائیوں کو روکنا پڑا۔اُس کے پیشِ نظر عرب کے محاذ پر پیش قدمی کرتے ہوئے حجاز ریلوے لائن کو تباہ کرنا تھا تاکہ مسلمانوں کے عظیم شہر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کرنے کی دیرینہ صلیبی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے۔ بصورتِ دیگر کم از کم ترکی اور جزائرِ عرب کے رابطے کو منقطع کرتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے الگ کردے۔

اِس منصوبے کے متوقعہ نتائج حاصل کرنے کے لیے جنرل ایلن بے نے حجاز ریلوے لائن کے خاتمے کے لیے عمان پر حملہ کیا۔ یہ حملہ بہت زوردار تھا۔مگر ترک افواج نے زوردار مزاحمت اور بہترین دفاعی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنرل ایلن بے کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔تاہم برطانوی فوج حجاز ریلوے کو کسی قدر نقصان پہنچانے میں کامیاب رہی۔

اگرچہ برطانوی فوج حجاز ریلوے لائن کو نقصان پہنچانے میں کسی قدر کامیاب رہی تھی مگر اس کا بنیادی مقصد ابھی تک حاصل نہ ہوسکا تھا۔جس کے حصول کے لیے ایک اور کوشش 11 اپریل کو کی گئی۔اِس بار حملہ وادیٔ مصر کی جانب سے کیا گیا تھا۔اب ایک بار پھر برطانوی فوج کو بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ترک فوج نے برطانیہ کی حملہ آور فوج کو اس کے عقب سے کاٹنے کی کوشش کی۔جس پر جنرل ایلن بے کو فوری طور پر فلسطین کے مقبوضہ، محفوظ علاقوں تک پسپا ہونے کی ہدایت کرنے پڑی۔

اسی دوران مغربی محاذ پر جرمنی کے آخری اور انتہائی شدید حملے کی روک تھام کے لیے برطانوی حکام نے ہر محاذ سے اضافی فوج مغربی محاذ پر طلب کرلی۔جنرل ایلن بے کی عظیم افرادی قوت میں سے نصف 60000 سے زائد فوج کو فوراً مغربی محاذ پر منتقل کردیا گیا۔

اب بھی مقابلہ دو برطانوی فوجیوں کے مقابلے میں ایک ترک فوجی کا تھا۔اور ترک فوج بہر صورت مجموعی طور پر 30000 سے کم ہی تھی۔مزید یہ کہ جنرل فالکن ہائنز جو گزشتہ سال فلسطین کے محاذ پر طلب کیا گیا تھا ایک بار پھر جرمن مغربی محاذ پر بھرپور حملوں کے لیے جرمنی طلب

کرلیا گیا۔اس کی جگہ جنرل لیمین وان سینڈرز کو ترک اور جرمن فوج کی قیادت کے لیے مامور کیا گیا۔قیادت کی تبدیلی جنگی حکمتِ عملی کی تبدیلی کا باعث بھی بنی۔

جنرل فالکن ہائنز حملوں اور جوابی حملوں کے ذریعے دفاع کرنے کی حکمتِ عملی پر عمل پیرا تھا۔جبکہ جنرل سینڈرز مزاحمتی دفاع کی پالیسی کا قائل تھا۔اِس دوران وادیٔ مصر میں میجر لاورنس کی قیادت میں برطانوی فوج کو بہتر نتائج حاصل ہورہے تھے۔اور موصوف ترک مزاحمت کو کچلتا ہوا پیش قدمی کرتا چلا جارہا تھا۔

19 ستمبر کو جنرل ایلن بے نے عرب کے محاذ پر لڑنے کے لیے اپنی فوج کو سات مختلف اہداف پر مختلف سمتوں سے حملہ آور ہونے کے لیے لڑائی کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔اِس مہم کا آغاز مجیدو کی لڑائی سے کیا گیا۔تین (3) سوار ڈویژن اور بھاری پیادہ فوج کی مدد کے لیے شاہی فضائیہ نے بھرپور حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔اور فضا سے زمین پر اِس قدر گولہ باری کی گئی کہ کئی گھنٹے تک شہر کی سڑکوں پر آمدورفت کا سلسلہ منقطع رہا۔اور کئی عمارتیں ریت کے گھروندوں میں بدل گئیں۔ زندگی مفلوج ہوکر رہ گئی۔

ان حملوں میں ترک فوج مختلف مقامات پر بڑی بے جگری سے لڑ رہی تھی مگر اپنے سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقت ور دشمن کے سامنے اُن کے حوصلے پست اور عزم ماند پڑ گئے تھے۔وہ شکست خوردگی کا شکار ہورہے تھے۔اُن کی نظر میں دشمن کی بھاری نفری، بہترین اسلحہ اور بھرپور فضائی امداد اور کارگر فضاء سے زمین پر کی جانے والی گولہ باری حملہ آور فوج کی فتح کو یقینی بنانے میں ممد ومعاون ثابت ہورہے تھے۔

جنرل ایلن بے نے دو (2) ڈویژن سوار فوج کو مصر سے آگے عرب علاقوں میں داخل ہونے کے لیے پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔یہ فوج 34 گھنٹوں میں 70 میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی مصر سے ملحقہ عرب کے علاقے بیسان کے مقام تک پیش قدمی کرتی چلی گئی۔دوسری جانب ایلن بے کے دوسرے سوار دستے نزارت میں شدید حملے کے بعد داخل ہوگئے۔اِس لڑائی میں ترک۔جرمن فوج کا کمانڈر جنرل سینڈرز بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوا۔

میجر لاورنس نے عرب پر کیے گئے اپنے حملے میں فلسطین اور حجاز کے ریلوے جنکشن پر قبضہ کرنے کے لیے دیرا پر کامیاب حملہ کیا۔اور قبضہ کرلیا۔نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی فوج نے عمان

پر قبضہ کر کے ترک چوتھی آرمی کو حصار میں لے لیا۔ اور آخر کار 10000 ترک فوجی، جنگی قیدی بنا لیے گئے۔

برطانوی فوج کی عرب اور فلسطین مہم کے پانچویں محاذ میں صحرائی سوار فوج کو دمشق پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اِس فوج نے یکم اکتوبر کو معمولی ترک مزاحمت کے بعد دمشق پر قبضہ کر لیا۔ جبکہ چھٹے محاذ میں پانچویں سوار ڈویژن نے 16 اکتوبر کو ہومز پر قبضہ کر لیا۔ ساتویں محاذ ''ہری ٹین'' کے لیے چوتھے ڈویژن کو پیش قدمی کرنا تھی مگر اسی اثناء میں برطانوی چوتھے ڈویژن کو ملیریا اور نزلہ اور زکام کی وباء نے آلیا۔ اور وہ پیش قدمی کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس لیے پانچویں ڈویژن نے ہی مزید آگے بڑھتے ہوئے 26 اکتوبر کو ہری ٹین پر قبضہ کر لیا۔

دوسری جانب ترک حکام بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار تھے۔ فلسطین اور عرب کے محاذ پر پے در پے شکستوں، شکستہ معاشی و معاشرتی حالات اور جرمن مغربی محاذ سے آنے والی حوصلہ شکن خبروں نے امن اور صلح کے لیے ہر طرح کی شرائط پر معاہدے کی جانب راغب کیا۔ 30 اکتوبر 1918ء کو تمام ترک محاذوں پر یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ ترک فوج نے ہتھیار ڈالتے ہوئے معاہدہ صلح پر دستخط کر دیے ہیں۔

برطانوی پانچویں سوار ڈویژن نے 38 دنوں میں 550 میل پیش قدمی کی۔ جبکہ جنرل ایلن بے نے مجموعی طور پر 75000 ترک فوجیوں کو قیدی بنایا۔ اور اِس ساری کارروائی کے دوران برطانوی فوج کے صرف 5600 فوجی کام آئے۔ اِس محاذ پر جنرل ایلن بے کا منصوبہ انتہائی دانشمندانہ مگر بہت پر خطر تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ ترک فوج اپنی ہار تسلیم کر چکی ہے اور اب اس کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے زیادہ بالکل نہیں رہ گئی۔

اِس طرح جنرل ایلن بے نے جدید جنگی تکنیک کی بنیاد ڈالتے ہوئے انتہائی سریع اور بھرپور انداز سے دشمن پر پے در پے حملوں کے ذریعے جنگی ماہرین کی راہنمائی کے لیے بہترین اثاثہ چھوڑا۔ جبکہ ترک فوج جلد شکست خوردگی کا شکار ہو جانے کے باعث ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئی۔

موسل کی جانب پیش قدمی

فروری 1918ء میں میسوپوٹامیا کے محاذ پر جنرل رابرٹ سن کی جگہ جنرل ہنری ولسن کو مامور کیا گیا۔ جنرل ولسن فوج کے ذریعے برطانیہ کے سیاسی مقاصد کے حصول کا خواہاں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ترک اور جرمن افواج سے جارجیا، روسی رومانیہ اور آذربائی جان کو محفوظ رکھنے کے لیے خصوصی اقدامات کرے تاکہ اِن علاقوں کے برطانوی نقطۂ نظر سے محفوظ ہو جانے پر تیل کے ذخائر والے علاقے موسل پر دشمن کی دسترس کے خدشے کو سرے سے ہی ختم کر دیا جائے۔

اُس نے جنرل الیگزینڈر رسٹین ہوپ کو ب کو شت العرب کی جانب پیش قدمی کرنے کا حکم دیا۔ ابتدائی طور پر جنرل ولسن کو کوئی جلدی نہ تھی مگر وسط اکتوبر میں اسے معلوم ہو گیا کہ ترک حکام صلح و امن کے لیے بڑی تیز رفتاری سے قدم بڑھا رہے ہیں اور انہیں امریکہ کی جانب سے کافی حوصلہ افزا جواب موصول ہو رہے ہیں۔ اِس طرح یہ بہترین برطانوی مفاد میں تھا کہ وہ جنگ بندی سے قبل بہر صورت موسل پر قابض ہو جائے اور وہاں کے تیل کے ذخائر پر اُس کے پہلے سے کہیں زیادہ دسترس ہو۔

20 اکتوبر کے بعد جنرل ولسن نے الیگزینڈر رسٹین ہوپ کو ہر ممکن جلد پیش قدمی کرتے ہوئے موسل پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اُس کی تیز رفتار پیش قدمی کے باعث شت العرب کے محاذ پر ترک جرنیل اسماعیل حقی نے امن و صلح کی کاوشوں کی امید پر اپنے فوجیوں کو جنگ سے دور رکھنے کی کوشش کی اور پسپا ہوتے ہوئے دریائے زیب کے دوسری جانب پہنچ کر دم لیا۔

جنرل ولسن کی فوج نے انتہائی تیزی سے ترک فوج کا تعاقب کیا اور 39 گھنٹوں میں 77 میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے دریائے زیب کو ایک تنگ مقام سے پار کر لیا۔ اسماعیل حقی نے اِس نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنی فوج کو منظم انداز سے متحرک کیا اور دریا کے دوسری جانب جا کر کشتیوں سے بنے ہوئے پل کے نزدیک مورچہ بند ہو گیا۔

برطانوی فوج نے جنرل حقی کو مزید کوئی مہلت دیے بغیر 26 اکتوبر کو ایک اور پل تلاش کر کے اُس کے ذریعے دریا پار کیا اور تیس (30) میل لمبا چکر لگا کر ترک فوج کے عقب کو آ لیا۔ اگلے دِن جنرل حقی نے اپنی فوج کو پسپا ہو کر قلعہ شرقت میں مورچہ بند ہونے کا حکم

دیا۔ گمسان کا رن پڑا۔ ایک وقت برطانوی توپ خانے کے پاؤں اکھڑنے ہی والے تھے کہ اسے بروقت کمک مل گئی اور وہ میدان میں پھر ڈٹ گئے۔

شرقت کی لڑائی 29 اکتوبر کو بھی جاری رہی۔ جنرل حقی ہر ممکن جنگ سے گریز کر رہا تھا۔ اور موجودہ صورتِ حال میں اسے بے بسی اور نا امیدی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ برطانوی پیادہ فوج ترک فوج کی صفوں میں شگاف ڈالنے میں مکمل طور پر ناکام رہی تھی۔ مگر شکست خوردگی اور نا امیدی کے باعث 30 اکتوبر کو جنرل حقی نے ہتھیار ڈال دیے۔ برطانوی فوج کو 11300 قیدی اور 51 گنز حاصل ہوئیں۔ جبکہ اُن کا نقصان صرف 1886 تھا۔

اگلے ہی دِن معاہدہ صلح پر دستخط ہوئے اور وہ نافذ العمل ہوگیا۔ مگر برطانوی پرچم تلے ہندوستانی توپ خانے کے ایک ڈویژن کو موسل پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ برطانیہ کا موقف تھا کہ معاہدہ جنگ کے مطابق ترک فوج کے تمام تر قلعہ بندیوں کی فوجیں ہتھیار ڈالنے کی پابند ہیں۔ لہٰذا موسل کی فوج بھی ہتھیار ڈالے۔

موسل میں جنرل حلیل پاشا کی قیادت میں چھٹی آرمی موجود تھی مگر وہاں کوئی قلعہ بندی نہ ہونے کے باعث حلیل پاشا نے موقف اختیار کیا کہ اُس کی فوج صرف مہماتی فوج ہے جس کے لیے وہاں کوئی قلعہ بندی موجود نہ ہے۔ لہٰذا وہ ہتھیار نہ ڈالے گا اور شہر دشمن کے حوالے بھی نہیں کرے گا۔

شدید برطانوی اصرار پر آخر کار جنرل حلیل پاشا کو ہتھیار ڈالتے ہوئے شہر دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔ میسوپوٹامیا کے محاذ پر برطانیہ اور ہندوستان کو 92500 فوجیوں کی قربانی دینی پڑی۔ جن میں سے 18620 مارے گئے۔ تاہم یہ تیل کے ذخائر کے حصول اور اُن پر مکمل بالادستی کے قیام کے لیے کوئی بڑی قربانی نہ گردانی گئی۔ البتہ مغربی محاذ پر فوجی ضرورتوں کے پیشِ نظر میسوپوٹامیا میں فوجی ضرورت ایک بوجھ کی حیثیت رکھتی تھی جو اِس محاذ کے ختم ہونے پر ختم ہوگیا۔

فضائی محاذ

1918ء میں فضائی مہموں بہت تیزی اور بہتری آچکی تھی۔ اب لڑاکا طیاروں میں

مشین گنیں لگانے کے بعد انہیں دشمن پر حملہ آور ہونے کے لیے بھی روانہ کیا جانے لگا تھا۔ اِس طرح خندقوں میں چھپے دشمن کے لیے یہ ایک بہترین ہتھیار کے طور پر سامنے آئے تھے۔ مسلسل جنگ نے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ لڑاکا طیارے کسی خاص علاقے کے دفاع میں بہت اچھا کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں مگر حملہ آور ہونے کے لیے ایک اہم اور مؤثر ہتھیار ہیں۔

اتحادی افواج نے اپنی فضائی افواج کے ذریعے پراپیگنڈے کو بھی خوبصورت طریقے سے عام کیا۔ انہوں نے مغربی محاذ پر جرمن افواج کا مورال پست کرنے کے لیے کروڑوں پرچیاں گرائیں جن میں انہیں جنگ سے بددل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش بروئے کار لائی گئی تھی۔ اور انہیں ملک کی تباہ حال معیشت سے ڈرانے اور اُن کے لواحقین کے بھوکوں مرنے کی خبریں دی جارہی تھیں۔

اِس سال جہازوں کی ساخت، رفتار اور اندرونی طور پر اُن کی بناوٹ میں آسانی لانے کے لیے بہت سی تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ پائلٹ کے علاوہ ایک گنر تو گزشتہ سال سے ہی جہاز میں بٹھا دیا گیا تھا۔ مگر اِس سال خصوصی طور پر فضائی حملے کو مؤثر بنانے کے لیے گنر کو بلا روک ٹوک فائرنگ کرنے کے مواقع دینے کے لیے پائلٹ سے آگے جگہ فراہم کی گئی تھی جہاں سے وہ ہر طرف اپنی مشین گن سے فائرنگ کر سکتا تھا۔

دورانِ سال فلسطین کے محاذ پر بڑے پیمانے پر برطانوی افواج نے فضائیہ کی مدد سے کامیابیاں حاصل کیں۔ مغربی محاذ پر بھی اتحادی افواج اور جرمن فوج نے فضائی امداد سے بھرپور حملے کیے اور دشمن کو شدید نقصانات پہنچائے۔ اٹلی کی فوج نے آسٹریا۔ ہنگری کے خلاف اپنی فضائی برتری کی وجہ سے سبقت حاصل کی اور اسے شکست سے ہمکنار کیا۔

جنگِ عظیم اوّل اُس دور میں لڑی گئی جب فضائی لڑائی اور پرواز ایک بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ اسی لیے اس دور میں کوئی بھی خاص اور اہم فضائی جنگ کا ریکارڈ تاریخ میں میسر نہیں۔ تاہم یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسی جنگ کی بھٹی سے نکل کر دوسری جنگِ عظیم کے نامور فضائی کمانڈر اپنے کمالات اور حیرت انگیز کارناموں کے باعث تاریخ عالم میں مشہور ہوئے۔

مجموعی صورتِ حال

اِس سال مغربی محاذ سب سے زیادہ توجہ طلب رہا کیونکہ وہاں جرمنی کی جانب سے بڑے پیمانے پر شدید حملے کیے گئے۔ امریکی کمک کے آنے پر اتحادی فوج کی جانب سے جوابی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا اور آخرکار جرمنی کو اپنی چار (4) سال سے قائم کردہ فرنٹ لائن سے پسپاء ہو کر سرحدوں کی حفاظت کے لیے لوٹنا پڑا۔ ساتھ ہی قیامِ امن کے لیے ہر محاذ اور ہر ملک کی جانب سے کوششوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مشرقی محاذ تو گزشتہ سال ہی خاموش ہو گیا تھا۔ تاہم اٹلی کے محاذ پر شدید لڑائیوں کے سلسلے کے بعد آسٹریا۔ ہنگری کی فوج میں بغاوت اور جوابی حملہ کرنے میں پس و پیش کی کیفیت کے باعث اٹلی کی فوج کو فتح ہوئی۔ بلقان کے محاذ پر بلغاریہ کے تنہا میدان میں رہ جانے کے باعث سیلونیکا میں موجود اتحادی فوج نے بڑھ کر بلغاریہ پر زوردار حملہ کیا اور آخرکار بلغاریہ کو شکست تسلیم کرتے ہوئے جنگ بندی کے معاہدے کے لیے التجا کرنی پڑی۔

ترکی کے محاذ پر برطانوی فوج نے حجاز ریلوے کو تباہ کر کے مسلمانوں کے مقدس شہروں کو پامال کرنے کی کوشش کی مگر اُسے اپنے مقصد کے پہلے حصے میں تو کامیابی حاصل ہوئی مگر دوسرے حصے میں وہ بری طرح ناکام رہا۔ میسوپوٹامیا کے محاذ پر تیل کے ذخائر پر اجارہ داری اور بالادستی کے قیام کے لیے برطانیہ کی فوج نے موصل پر حملہ کر کے جنگ بندی کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔

اِس سال اتحادی افواج نے جرمن بحریہ کی مکمل طور پر ناکہ بندی کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا۔ اس وجہ سے جرمنی کی غیر جانبدار ممالک سے تجارت پر شدید برے اثرات مرتب ہوئے اور جرمنی کی صنعت، معیشت اور قوت تباہ ہو گئی۔ جواباً جرمنی نے برطانیہ کو دیگر دنیا سے کاٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی۔

جرمنی کی جانب سے آبدوزوں کی لڑائی بھی پورے عروج پر رہی۔ تاہم امریکی مداخلت سے سائنسی اور تکنیکی رجحان میں اضافہ ہوا اور جرمن آبدوزوں کا پتہ چلانے کے لیے

ایجادات کا سلسلہ جاری ہوا۔ اِس سلسلہ میں پیش رفت ہونے کے باعث جرمن آبدوزوں کی ہلاکتوں کا سلسلہ بڑھ گیا جبکہ اتحادی ممالک کے نقصانات میں کمی واقع ہونے لگی۔

اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر جنرل فوش نے جرمن حملوں کا تصویر کشی کے ذریعے بغور جائزہ لیتے ہوئے اُن کے مقابلے اور جرمن افواج کو شدید نقصان پہنچانے کے لیے منصوبہ بندی کی۔ جہازوں سے گولہ اور بارود کے علاوہ کروڑوں پرچیاں بھی گرائی گئیں جن میں جرمن افواج کو ہر ممکن طریقے سے ڈرانے اور میدانِ جنگ سے دور کرنے کے لیے تحریریں درج تھیں۔

یہ سال قتل وغارت گری کا آخری سال ثابت ہوا اور یورپ بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم امن وامان کی صورتِ حال کے قیام کے لیے کوششیں کی گئیں۔

حصہ سوم

اختتامِ جنگ

9

جنگ بندی

سال 1918ء شدید لڑائیوں کے سال کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اِس سال ہر فریق نے دوسرے فریق کو شکست دینے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ تاہم یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہی سال تاریخِ عالم میں اس لیے بھی ممتاز اور اہم ہے کہ اسی سال جنگِ عظیم اوّل کے آتش وخون میں لتھڑے ہوئے پیراہن کو چاک کرتے ہوئے درماندہ اور زخمی انسانیت کو اپنے زخم سینے کا موقع ملا۔

ساڑھے چار سالہ کشت خون کے بعد انسانی جسم وجاں کی کمی اور معاشی رکاوٹوں نے سفید چمڑی میں ملفوف کالے دلوں اور فکر کے حامل حکامِ بالا کو اپنی بے مہار حیوانی خصلتوں کی تسکین کو روکنا پڑا۔ قیامِ امن اور چھوٹے ملکوں کی سالمیت کا نعرہ لگانے والے ممالک دراصل اپنی جبلی تسکین، اقتدار کی لالچ، خودسری اور بڑائی کی برائیوں سے مرصع ومرجع مزموم اور ناپاک عزائم کی خاطر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہے اور تخلیقِ خداوندی کو اپنے اشاروں پر قربان گاہ میں بلا دریغ پیش کرتے رہے۔

اس سال جنگ بندی کے لیے بیشتر کوششیں کی گئیں۔ تاہم چند جرنیلوں نے اِن تمام کوششوں کو بروئے کار نہ آنے دیا اور جنگ سال کے آخری مہینوں تک جاری رہی۔ ذیل میں ہم

مختصراً جنگ بندی کی وجوہات، جنگ بندی کے لیے سفارتی کوششوں اور وہ حالات جن میں جنگ بندی ہوئی کا مختصر جائزہ لیں گے۔

وجوہات

28 جولائی 1914ء سے شروع ہونے والے عظیم جنگ اپنے تاریخی جثہ اور قدامت کی وجہ سے شریک ممالک کی معیشت، معاشرت، سیاست، آبادی، ذرائع، نفسیات اور ذہنی وجسمانی صحت سب ہی کچھ تباہی دے دہانے پر پہنچ چکا تھا۔ میدانِ جنگ میں اسلحہ اور افرادی قوت کی کمی کا احساس غالب تھا۔ اندرونی خلفشار اور مختلف الجہت فکروسوچ نے سیاست دانوں کو بہت زیادہ مایوس کردیا تھا۔

اتحادی ممالک اپنی نسبتاً بہتر سفارت کاری اور جغرافیائی اہمیت کے باعث کسی قدر بہتر صورتِ حال کے حامل تھے۔ انہیں نئے نئے ممالک کو جنگ میں شریک کرنے کی وجہ سے تازہ دم فوج، نئی ٹیکنالوجی، معاشی سہارا اور سیاسی تحفظ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی محاذوں پر بھی تنہائی اور بے یقینی کی کیفیتوں سے چھٹکارا حاصل تھا۔

دوسری جانب مرکزی ممالک سوائے جرمنی کے تمام کے تمام ہی معاشی بوجھ، سیاسی عدم استحکام، بھانت بھانت کی آبادی اور ہزاروں مسائل سے دوچار ہونے کی وجہ سے جنگ کے آغاز ہی سے انتہائی کمزور نظر آرہے تھے۔ وہ صرف اور صرف جرمنی کے سہارے سے میدان جنگ میں برسرِ پیکار رہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جنگ کی ابتدا کرنے والا ملک آسٹریا۔ ہنگری ہی سب سے پہلے عدم استحکام اور معاشی استحصال کے باعث خفیہ معاہدوں کے ذریعے جنگ بندی پر مائل ہوا۔

امریکہ کے میدانِ کارزار میں بطور اتحادی ملک کود جانے سے سب سے زیادہ نقصان سفارتی میدان میں جرمنی کو پہنچا۔ امریکہ نے جرمنی کے اقتصادی استحصال اور تجارتی بندش کے لیے بھرپور کردار ادا کیا۔ قبل ازیں اتحادی ممالک جرمنی کی مکمل بحری تجارتی ناکہ بندی کرنے میں ناکام رہے تھے۔ بیشتر غیر جانبدار ممالک ابھی بھی جرمنی سے اپنے تجارتی تعلقات استوار رکھے ہوئے تھے۔ مگر امریکہ نے اپنے سفارتی اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے سابقہ اتحادیوں کے خواب

"جرمنی کی مکمل ناکہ بندی" کو ممکن بنایا۔

یہ امر ہی دراصل جنگ کا رخ بدلنے کا باعث بنا۔ 1918ء کے آغاز میں جب جرمنی کی بحری تجارت کی ناکہ بندی کو چھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا، صورت حال بہت ابتر ہو چکی تھی۔ مزدوروں سے دن رات کام لینے کی وجہ سے اُن میں بیزاری اور عدمِ تحفظ کے احساس نے جڑ پکڑی اور انہوں نے جنوری 1918ء کو برلن میں عام ہڑتال کر دی۔ جس سے نمٹنے کے لیے جرمن حکام کو انتہائی سختی کرنا پڑی۔

مشرقی محاذ پر خاموشی اور اطمینان کے بعد جرمن فوجی اعلیٰ حکام کی پوری توجہ مغربی محاذ کی طرف راغب ہو گئی۔ اپنی سوچ کے مطابق وہ اٹلی کو ابتدائی بھرپور شکست کے بعد اس حالت تک پہنچا چکے تھے جہاں سے وہ آسٹریا۔ ہنگری کے لیے تر نوالہ بن سکتا تھا۔ یا کم از کم آسٹریا۔ ہنگری اُسے دریائے پی اَیو کے کنارے دفاعی پوزیشن میں پڑا رہنے پر مجبور رکھ سکتا تھا۔

اس طرح وہ بھرپور انداز سے مغربی محاذ پر دشمن کے پاؤں اکھیڑتے ہوئے اُسے براعظم کی سطح سے نکال باہر کرنے کے لیے پوری قوت سے حملہ آور ہونا چاہتے تھے۔ لیوڈنڈروف نے اپنی تمام طاقتوں کو مجتمع کر کے برطانیہ اور فرانسیسی افواج کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ جغرافیائی کامیابیوں کے باوجود مطلوبہ اہداف حاصل نہ ہو سکے اور لگاتار جرمن فوج بڑے بڑے نقصانات اُٹھاتی رہی۔

اس صورتِ حال نے جرمنوں کے دِلوں میں احساسِ تنہائی اور شکست خوردگی کو بڑھا دیا۔ ایک طرف تو وہ سفارتی محاذ پر شکست کھا چکے تھے، دوسرے اُن کی افرادی قوت اور ہنر و تربیت یافتہ آبادی میں شدید قلت ہو چکی تھی۔ اس لیے جرمن حکام میں ایک بہت بڑی اکثریت امن پسندوں کی بھی ہو چکی تھی۔

یہ امن پسندوں کی کاوشیں اور جرمن افواج کے گرتے ہوئے مورال تھے کہ 19 ستمبر کو اعلیٰ حکام نے مزید مقابلہ مشکل سمجھتے ہوئے صلح کی گفتگو کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ حالات کی نزاکت انتہا کو پہنچ گئی۔ تب جا کر جنرل لیوڈنڈروف نے امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کے مطابق صلح کی گفتگو آگے بڑھانے کی تجویز دی جسے اُس وقت کے چانسلر میکس فان بیڈن نے منظور کر لیا اور امریکی صدر سے خط و کتابت شروع کی۔

اسی دوران شکست خوردگی، اندرونی انتشار، انارکی اور دشمن کے بے مہابہ پراپیگنڈے کے باعث عوام کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی بیزاری اور نفسانفسی کی کیفت پروان چڑھنے لگی۔ اتحادیوں کے کایاں دماغ جرمنی کے اندرونی خلفشاروں کو تیزی سے ہوا دے رہے تھے۔ اور بادشاہت، حکومت اور سیاسی سکون غارت ہوتا جا رہا تھا۔

ماہِ اکتوبر کے آخر میں جرمن بحری بیڑے میں بغاوت ہوگئی۔ بغاوت رو کرنے کی تمام تر کوششیں بے کار گئیں۔ اور 3 نومبر کو کیل کی بندرگاہ پر باغیوں نے قبضہ کرلیا۔ اب وہ اپنی سوویت کونسلوں کے قیام کے مطالبے کر رہے تھے۔ اِس بغاوت کو کچلنے کے لیے بری فوج بھیجی گئی۔ بظاہر بغاوت کچل دی گئی مگر بحیرہ بالٹک کے ساحل کی ہر بندرگاہ پر مزدوروں نے سوویت کونسلیں قائم کرلیں اور تمام بحری جہازوں پر سرخ جھنڈے لہرانے لگے۔

جرمنی کے اندر بیویریا میں بھی بغاوت پھیل گئی۔ اور وہاں دیواروں پر اشتہارات آویزاں کردیے گئے کہ بویریا مزدوروں اور کسانوں کی آزاد جمہوریت ہے۔ جمہوریت کے خیال کے پروان چڑھنے کا سب سے بڑا ذریعہ اتحادی ممالک تھے جن کی در پردہ ریشہ دوانیوں نے رنگ لانا شروع کردیا تھا اور جرمنی اندرونی خلفشار کا شکار ہوگیا تھا۔

اِس گھمبیر صورتِ حال میں جرمنی کے چانسلر نے قیصر کو اپنے تخت سے دستبردار ہونے کا مشورہ دیا۔ تاکہ ملک کو خانہ جنگی اور بدامنی سے بچاتے ہوئے بیرونی دشمنوں کے حملوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ بہت کشمکش اور تردد کے بعد 9 نومبر کو چانسلر کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ قیصر ولیم اپنے تخت سے دستبردار ہوتے ہیں اور ملک میں ریجنسی قائم کی جائے گی تاکہ شہنشاہی کو برقرار رکھتے ہوئے آزاد اور خودمختار حکومت کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔

اب ملک میں لبرل پارٹی کے علاوہ سوشل ڈیموکریٹس اور کمیونسٹ پارٹیاں بھی زور آور ہوچکی تھیں جو بادشاہی نظام کے سخت مخالف تھیں۔ ان دونوں بادشاہت اور لبرل پارٹی مخالف پارٹیوں نے ملکی حالات کو مزید بگاڑنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی یہاں تک کہ خونریزی تک نوبت پہنچی جس پر میکس نے چانسلری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ایبرٹ کی سرکردگی میں ایک اشتراکی حکومت قائم کی گئی۔ جس نے مزدوروں اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر حکومت کرنے کی کوشش شروع کردی۔

قیصر ولیم کی دستبرداری اور حکومت سے علیحدگی پر پروشیا پر قائم سینکڑوں سالہ بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور آٹو وان بسمارک کی اعلیٰ صلاحیتوں سے قائم کردہ متحدہ جرمنی کے وجود پر سوالیہ نشان پڑنے لگے۔ جرمنی میں قائم چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی بادشاہتیں بھی گردشِ روزگار کی نذر ہو گئیں۔ قیصر کو وطن چھوڑ کر ہالینڈ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔

ادھر آسٹریا۔ ہنگری کی صورتِ حال جنگ کے آغاز سے قبل ہی بہت نازک تھی۔ عوام جنگ سے بہت تنگ اور عاجز تھے۔ بادشاہ چارلس اوّل کی تخت نشینی (21 نومبر 1916ء) سے قبل ہی حکومت جنگ بندی کے لیے جرمن حکام سے رابطہ کرنے کی بابت منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ اندرونی خلفشار انتہا درجے تک پہنچ چکا تھا۔ اگر 1917ء میں یوکرائن اور روس سے امن کے معاہدے ہو جانے کے باعث ایک محاذ خاموش نہ ہوتا تو بادشاہت کا تختہ الٹ دیا جاتا۔

14 نومبر 1915ء کو چیک کمیٹی نے بادشاہت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ اور یہ تحریک بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ زور آور ہو چکی تھی۔ پولستان کے آزاد خیال نمائندوں کو اتحادی افواج نے درپردہ تحفظ فراہم کرتے ہوئے بادشاہت کے خلاف بغاوت کرنے میں بھرپور مدد دی۔ پولش نیشنل کمیٹی کا صدر دفتر پیرس میں تھا اور رومین ڈموو سکی کو کھلے عام فرانسیسی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی جس نے بعد میں مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔

جنوب میں کروٹس اور سلیوز قوموں نے سربیا کی متحدہ حکومت کے قیام کے لیے کرفو سے جاری ہونے والی ہدایات کے مطابق بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ آسٹریا۔ ہنگری کی باسی 15 سے زائد اقوام میں انتشار اور انارکی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال افواج میں بھی منعکس ہونے لگی۔ 31 اکتوبر کو آسٹریائی فوج کو پولستانی گلیشیاء سے بے دخل کر دیا گیا۔

16 اکتوبر کو بادشاہ چارلس نے بادشاہت کو بچانے کی ایک اور کوشش کی اور تمام اقوام کے نمائندوں کو بلا کر خود مختار حکومتوں کے قیام، بادشاہت کی بجائے مرکزی طرزِ حکومت بنانے کی پیش کش کی مگر صورتِ حال میں بہتری نہ ہوئی۔ چیکوسلواکیہ کے آزاد اور خود مختار ریاست بنانے کی تحریک کے سربراہ ماسارائک نے جو امریکہ میں مقیم تھا اور امریکی پشت پناہی کا حامل تھا، چیکوسلواکیہ کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

ہنگریا کی کونسل نے بادشاہت سے آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ جرمن آسٹریائی باشندوں

نے آزاد جرمن آسٹریا کے قیام کا فیصلہ کر لیا۔ ان روز افزوں بگڑتے ہوئے حالات، بھوک وافلاس، نفسا نفسی کے عالم اور بھرپور ریشہ دوانیوں اور اتحادی سازشوں کے باعث آسٹریا۔ ہنگری کی بادشاہت کو ذلت آمیز شرائط پر جنگ بندی کرنے کے لیے متعدد بار استدعا کرنی پڑی جبکہ سربیا جو کہ انسانی قتل وغارت گری کی اصل وجہ اور سبب تھا، وہ جرم کا ارتکاب کر کے بھی عالمی امن کے ٹھیکیداروں کی عنایات کا مرکز ومحور بنا رہا۔

بلغاریہ میں اندرونی خلفشار کے ساتھ ساتھ محاذِ جنگ پر بلغاریہ کی افواج کا تنہا رہ جانا اُس کی شکست کا باعث بنا۔ ملک کے اندر بھوک افلاس اور غربت اپنے آخری درجے پر پہنچ چکی تھی۔ اور لوگ معاشی پابندیوں، بندشوں اور جنگی اخراجات کی زیادتی کے باعث روز بروز ابتر زندگی گزار رہے تھے۔ بلغاریہ کی حکومت نے شکست کو ناگزیر پا کر اتحادی افواج کی شرائط پر صلح کر لی۔

ترکی جنگِ عظیم اوّل سے قبل ہی اپنی فوجی اور سیاسی حیثیت کھو چکا تھا۔ 2-1911ء کی جنگِ بلقان میں شکست کے بعد بہت کمزور اور ناتواں ہو چکا تھا۔ اب جنگِ عظیم اوّل کی تباہ کاریوں کے باعث صرف اور صرف جرمن فوجی، معاشی اور اقتصادی امداد کے سہارے جیسے تیسے میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار تھا۔

ترک افواج کی شکست کے باعث سب سے زیادہ نقصان امتِ مسلمہ کو ہوا۔ فلسطین کے علاقوں پر اتحادی افواج نے اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق یہودیوں کو آباد کر کے امتِ مسلمہ کے سینے میں خنجر گھونپنے کا منصوبہ بنایا۔ مزید اندرونی خلفشار، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے ذریعے مسلمانوں کے اتحاد کی علامت ''خلافت'' کو بھی ختم کر کے اپنے من پسند اور پروردہ عناصر کو زمامِ اقتدار پر براجماں کیا تاکہ اُن کے ذریعے امتِ مسلمہ پر اصل حکمرانی مغربی ممالک کی ہی قائم رہے۔

ترک افواج کی فلسطین، حجاز، مصر، شام، میسوپوٹامیا اور کاکیشیا کے محاذوں پر پے در پے شکستوں اور اتحادی افواج کے قبضے نے نہ صرف حکومت کو سیاسی، جغرافیائی اور فوجی لحاظ سے سخت کمزور کر دیا تھا، بلکہ اقتصادی لحاظ سے بھی بری طرح ہلاکت کا شکار کر دیا تھا۔ عوام الناس بھوک اور افلاس کے باعث جنگ سے بیزار ہو چکے تھے۔

بھوکوں مرنے والوں کی نظر میں ہمیشہ ذاتی مفادات قومی مفادات سے زیادہ اہم اور

ضروری ہو جایا کرتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے علاقوں میں اتحادی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے باعث چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں بغاوتیں سر اُٹھانے لگیں جنہیں اتحادی افواج نے بھرپور انداز سے پھیلنے کے لیے ہر ممکن تعاون اور امداد بہم پہنچائی۔

انہیں دگرگوں حالات اور ناگفتہ بہ صورتِ حال نے ترک حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ مسندِ حکومت سے دستبردار ہو جائے اور صدیوں سے قائم خلافت کا خاتمہ ہو جائے۔ ترکی کو ذلت آمیز شرائط اور امتِ مسلمہ کے ناقابلِ تلافی نقصانات کے بعد آخرکار جنگ بندی کے لیے اتحادی ممالک سے استدعا کرنی پڑی۔ اور ذلت آمیز شرائط کو تسلیم کرنا پڑا۔

سفارتی کوششیں

سال 1918ء سفارتی لحاظ سے سب سے اہم اور منفرد سال رہا۔ جنگ بندی کے سال کی حیثیت سے اِس سال سفارتی کاوشوں کا زور زورہ رہا۔ 5 جنوری کو برطانوی وزیرِ اعظم لائیڈ جارج جو ایک طرف مختلف ممالک کو جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا، نے اپنے ایک خطاب میں کہا کہ وہ قیامِ امن کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس نے اِس امر کی ضرورت پر بھی زور دیا کہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جو بین الاقوامی سطح پر کسی بھی ملک کو اسلحہ کی دوڑ میں مناسب مقام پر رکھنے کا مجاز ہو۔

اسی طرح کے خیالات کا اظہار امریکی صدر ولسن نے بھی اپنے 8 جنوری 1918ء کے خطاب میں کیا۔ جس میں اپنے چودہ نکاتی امن پروگرام میں قیامِ امن کے لیے ممکنہ شرائط پیش کیں۔ اِن شرائط کو بڑی پذیرائی ملی۔ اور جرمن حکام نے اِن شرائط پر صلح کے لیے ذہنی طور پر تیاری شروع کر دی۔

تاہم جنرل لیوڈنڈروف اس زعم میں مبتلا تھا کہ وہ اتحادی افواج کو اب بھی شکست دے سکتا ہے۔ اور قیصر ولیم بھی اُس کی پیش کردہ صورتِ حال کو درست سمجھتے ہوئے جنگ کو جاری رکھنے پر رضامند ہو گیا۔ تاہم جب جرمن فوج اور اعلیٰ حکام کو شکست سامنے نظر آنے لگی تو انہوں نے امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کے مطابق ہی جنگ بندی اور صلح کرنا مناسب سمجھا۔

اسی سال کے آغاز میں جرمنی اور روس کے درمیان بریسٹ۔ لیٹوویسک کا معاہدہ طے پایا، جس کے تحت:

1۔ روس کو مغربی سرحد پر کورلینڈ، مغربی پولینڈ اور کارس کے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے

2۔ جبکہ ترکی کی جانب آردہان اور باٹوم سے دستبردار ہونا پڑا۔

3۔ مزید اسے فن لینڈ، الینڈ آئس لینڈ، ایسٹونیا اور لوانیا کو چھوڑنا پڑا۔

یہ معاہدہ 3 مارچ 1918ء کو بعد از دستخط مؤثر ہوا اور روسی کانگریس میں 18 مارچ کو پاس ہوا۔

26 ستمبر کو بلغاریہ کی جانب سے عارضی صلح کے جھنڈے تلے سفیروں نے اتحادی فوج سے صلح اور امن کی درخواست کی جو 29 ستمبر کو اِس شرط پر منظور کرلی گئی کہ:

1۔ بلغاریہ کی فوج کوئی حرکت نہ کرے گی۔

2۔ بلغاریہ کو تمام مقبوضہ علاقے چھوڑنے ہوں گے۔

3۔ بلغاریہ کے قبضے میں تمام ذرائع نقل و حمل اتحادیوں کے زیرِ استعمال رہیں گے اور وہ بلغاریہ اِن سے دستبردار ہو جائے گا۔

4۔ اور بلغاریہ اپنے علاقے اور سرزمین اتحادی فوج کو مزید کارروائیوں کے لیے بلاتامل پیش کر دے گا۔

بلغاریہ کی شکست سے ترکی جغرافیائی اور معاشی ہر لحاظ سے تنہا ہو گیا۔ اس کا رابطہ دیگر مرکزی ممالک سے بالکل ہی کٹ جانے کے باعث اس کے لیے جنگ جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ انور پاشا کی حکومت بگڑتے ہوئے ملکی حالات کے باعث حکومت سے دستبردار ہو گئی۔ تب نئی حکومت نے 14 اکتوبر کو جنگ بندی کی استدعا کی جس پر 30 اکتوبر کی جنگ بندی کا معاہدہ بعد از دستخط جزوی طور پر نافذ العمل ہو گیا۔ جبکہ برطانوی افواج بلادریغ اپنی درندگی اور عداوت پر ڈٹی رہی اور بعد از معاہدہ موسل کی جانب پیش قدمی کرتی رہیں۔

معاہدے کے مطابق:

1۔ ترک حکومت کو ڈارڈنیلیز کو اتحادیوں کے لیے کھولنے کا پابند کیا گیا تھا۔

2۔ ترک فوج ڈارڈنیلیز سے بارودی سرنگوں کی صفائی میں معاونت کی پابند تھی۔

3۔ ترک قلعہ بندیوں میں موجود آفیسران اور سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کا پابند کیا گیا۔

4۔ اتحادیوں کے لیے اہم مقامات اُن کے قبضے میں دینے کی یقین دہانی لی گئی۔

5۔ ترکی بحریہ کے ہتھیار ڈالنے کے علاوہ اپنی کشتیاں اور جہاز انہیں فراہم کرنے پر مجبور کیا گیا۔

آسٹریا۔ ہنگری میں شدید اندرونی خلفشار اور سیاسی انارکی کے باعث بادشاہ نے 27 اکتوبر کو اتحادی حکام کو پیغام دیا کہ وہ ہر طرح کی شرائط پر جنگ بندی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی درخواست پر 3 نومبر کو پاڈوا کے نزدیک ولیلا گیوزٹی میں جنگ بندی کے معائدے پر دستخط کیے گئے۔ جس کے مطابق:

1۔ آسٹریا۔ ہنگری ٹائرول، ڈالمیشن کے ساحلوں، یوگوسلاویا کے عوام کے طلب کردہ علاقوں سے دستبردار ہو گیا۔

2۔ آسٹریا۔ ہنگری کو اپنے تمام ریلوے کے نظام سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔

3۔ اتحادی افواج کو آسٹریا۔ ہنگری کے من چاہے علاقے پر قابض رہنے اور اسے استعمال کرنے کی کھلی اجازت مل گئی

4۔ اور اتحادی افواج آسٹریا۔ ہنگری کی سرزمین پر اپنی جنگی کارروائیاں جاری رکھنے پر بھی قادر ہو گئے۔

جرمن حکام نے امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کے مطابق جنگ بندی کی کارروائی عمل میں لانے کے لیے سرگرمی کا اظہار کیا تھا۔ مگر وہ امریکی صدر ولسن کی ڈپلومیسی اور اتحادی سربراہوں میں اُس کی حیثیت کے بارے میں درست اندازہ نہ لگا سکے۔ خود صدر ولسن گرتے ہوئے جرمنوں کی نسبت برطانیہ کو اپنے مستقبل کے لیے زیادہ خطرناک تصور کرتے ہوئے دیگر اتحادیوں کے برعکس جرمنی کو صفحۂ ہستی سے منہدم کرنے کی بجائے برطانیہ اور فرانس وغیرہ کی ہتھیلی پر

مونگ دلنے کے لے چھوڑ دینا چاہتا تھا۔

مگر اتحادی بھی اِس سوچ سے واقف تھے۔ وقتی فائدے کے تحت وہ امریکی حکام کی ناراضگی کے متحمل نہ تھے۔ مگر ایک بار جرمنی کی اصل صورتِ حال کے سامنے آنے پر انہیں اب امریکی امداد کی اس قدر ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ لہٰذا انہوں نے جنگ بندی کے معاہدے کے لے جرنیلوں سے رابطہ کیا۔

فوجی جرنیل اپنی فطری جبلت کے لحاظ سے ہی سخت کوش اور بے رحم ہوتے ہیں۔ پھر ایسے جرنیل جو چار (4) سال تک مسلسل انسانی کشت وخون کا بازار گرم رکھنے کے باعث ہمدردی اور انسانی اقدار کی بلندی سے مکمل طور پر عاری ہو چکے ہوں بھلا انسانیت کے فلاح اور بچاؤ کے لیے کیونکر متحرک ہو سکتے تھے۔ اِس لیے اتحادی حکام نے اپنے جرنیلوں کی سخت کوشی اور اُن کے سفاکانہ رویے کے پیشِ نظر جرمن جنگ بندی کی استدعا کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری اُن کے سر ڈال دی۔

جرمن حکام ابھی تک یہ ہی سمجھ رہے تھے کہ جنگ بندی کا معاہدہ امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات کے مطابق طے پائے گا اور یہی وہ شرائط تھیں جن کی بنیاد پر جنگ بندی کرنے میں جرمنی کی جغرافیائی اور اساسی سالمیت قدرے محفوظ رہ سکتی تھی۔ مخدوش حالتِ زار اور پے در پے ناکامیوں کے باعث انہیں چودہ نکات ہی واحد سہارا محسوس ہو رہے تھے۔

امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات

امریکی صدر ولسن نے اپنے 8 جنوری 1918ء کے خطاب میں چودہ نکاتی امن پروگرام پیش کیا جس میں قیامِ امن کے لیے ممکنہ چودہ نکات پیش کیے گئے تھے۔ اِن شرائط کو بڑی پذیرائی ملی۔ اور جرمن حکام نے اِن شرائط پر صلح کے لیے ذہنی طور پر تیاری شروع کر دی:

1۔ ممالک کے درمیان خفیہ معاہدوں کا سلسلہ ختم کیا جائے۔

2۔ جنگ ہو یا امن، ہر صورت میں سمندروں کی مکمل آزادی کو برقرار رکھا جائے۔

3۔ ہر ممکن معاشی رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے تمام ممالک کی آزاد تجارت کا

قیامِ عمل میں لایا جائے۔

4۔ ہر ملک کو اپنی جغرافیائی حفاظت کے لیے کم از کم سامانِ جنگ رکھنے کی گارنٹی دیتے ہوئے اس سے یہی گارنٹی طلب کی جائے۔

5۔ نوآبادیوں کے باشندوں کو مساوی حقوق دیتے ہوئے اُن پر حکومت سازی کے لیے باہمی تصفیے کے ساتھ معاملات حل کیے جائیں۔

6۔ روس کے تمام مقبوضہ علاقے واپس کرتے ہوئے اسے آزاد دنیا کے ممالک کی سوسائٹی میں مخلصانہ خوش آمدید کہا جائے اور اسے اپنے اندرونی سیاسی معاملات کو ازخود حل کرنے کا موقعہ دیا جائے۔

7۔ بیلجیم کی آزاد اور خود مختار حیثیت کو بحال کیا جائے۔

8۔ فرانس کے مقبوضہ علاقے واپس کر دیے جائیں اور 1871 میں السا س اور لورین کے مسئلے پر پروشیا کی زیادتی کا ازالہ کیا جائے۔

9۔ قومیت کی بنیاد پر اٹلی کی سرحدوں کی از سرِ نو تنظیم کی جائے۔

10۔ آسٹریا۔ ہنگری کے باشندوں کو آزاد اور خود مختار حیثیت دی جائے۔

11۔ رومانیہ، سربیا اور مونٹی نیگرو کی آزاد اور خود مختار حیثیت کو بحال کیا جائے اور سربیا کو آزاد سمندروں میں پہنچ دی جائے۔ بلکانی ممالک اپنے تاریخی سرحدی نظام میں مربوط ہوں اور سرحدوں کی تقسیم قومیت کی بنیاد پر کی جائے۔

12۔ ترکی کی موجودہ سرحدوں کو آزاد اور خود مختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ تاہم دیگر اقوام جو ترک حکومت کے تابع ہیں، آزاد اور خود مختار ریاستوں کی حیثیت سے نوازی جائیں۔ ڈارڈنیلیز کی آبناؤں کو بین الاقوامی تحویل میں دیتے ہوئے تمام ممالک کی سمندری تجارت اور گزرگاہ کی آزادی کی حامل قرار دیا جائے۔

13۔ پولش قوم کے واضح اکثریتی علاقوں پر مشتمل آزاد اور خود مختار پولینڈ قائم کیا جائے جسے سمندروں تک رسائی حاصل ہو اور سیاسی اور معاشی آزادی

دی جائے۔

14۔ بڑے اور چھوٹے ممالک کی سیاسی آزادی، علاقائی اور جغرافیائی سالمیت کو یقینی بنانے کے لیے ایک بین الاقوامی مجلسِ اقوام بنائی جائے۔

جنگ بندی کی ابتدائی شرائط

جرمن عوام اور حکام کی توقعات کے برعکس جنگ بندی کی ابتدائی شرائط بہت سخت تھیں۔ اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر جنرل فوش اور اس کے ساتھی کمانڈروں نے ابتدائی طور پر ترکِ جنگ کے لیے سخت شرائط پر جنگ بندی کے لیے جرمن حکام کو مجبور کیا:

1۔ فرانسیسی مقبوضہ علاقے الساس اور لورین کے ساتھ ساتھ دریائے رہائن کے مغربی علاقے فرانس کے حوالے کر دیے جائیں۔

2۔ جرمن اپنی تمام توپیں، بحری جہاز اور لڑاکا طیارے اتحادیوں کے حوالے کر دیں۔

3۔ اتحادی افواج کے تمام جنگی قیدی رہا کر دیے جائیں تاہم جرمن حکام کو جنگی قیدیوں کے مطالبے کا کوئی حق حاصل نہ ہوگا۔

4۔ جرمن افواج فوری طور پر اپنے مقبوضہ علاقے اتحادیوں کے حوالے کرتے ہوئے آغازِ جنگ سے قبل کی سرحدی پوزیشنوں پر واپس چلی جائیں۔

ان سخت شرائط نے جرمن حکام کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات سے مایوس ہو جائیں۔ اور صلح کی شرائط کے حوالے سے اُن پر اعتبار نہ کریں۔ اسی لیے جنرل لیوڈنڈروف نے ان شرائط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے "آرڈر آف دا ڈے" (یومیہ ہدایت) میں فوجوں کو مورچہ بند ہو کر لڑنے کا حکم دیا۔

مگر اب جرمنی کی اندرونی صورتِ حال سخت خراب ہو چکی تھی۔ مخالفین اتحادی سازشوں کا شکار ہو چکے تھے اور اُن کے مقاصد کے لیے بُری طرح استعمال ہو رہے تھے۔ رائخ شٹاگ میں ایک واضح اکثریت کسی بھی قیمت پر قیامِ امن کے لیے مطالبات کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے جنرل لیوڈنڈروف کو استعفیٰ دینا پڑا۔

10 نومبر کو ایبرٹ نے چاروناچار ترکِ جنگ پر رضامندی کا اظہار کر دیا اور اُس کے نمائندوں نے 11 نومبر صبح 6 بجے اِس معاہدے پر دستخط کر دیے۔ یہ معاہدہ 11 نومبر کو دِن 11 بجے نافذ العمل ہوا۔ اور عارضی جنگ بندی ہو گئی۔ اِس طرح جنگِ عظیم اوّل کے تمام یورپی محاذ خاموش ہو گئے۔ اور انسانی خون سے کھیلی جانے والی ہولی عارضی طور پر بند کر دی گئی۔

صلح نامہ ورسلز

جنگ بندی کے بعد اتحادی ممالک کی جانب سے 18 جنوری 1919ء کو صلح نامہ ورلز کی جزیات طے کرنے کے لیے پیرس میں صلح کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ پیرس کی صلح کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں فاتح ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی جبکہ ایک بھی مفتوح ملک کے نمائندوں کو طلب نہ کیا گیا تھا۔

اِس طرح آسان شرائط کا جھانسا دے کر جرمن حکام کو امریکی صدر ولسن نے کمال چالاکی اور ہوشیاری سے اپنے فریب میں پھنسالیا تھا۔ اب وہ تمام اتحادیوں کے درمیان براجماں اپنی من بھاتی شرائط جرمنی پر مسلط کرنے اور مالِ غنیمت کی بندر بانٹ کے معاملات حل کر رہے تھے۔

فتح کے وقت اتحادی ممالک کی تعداد بھی اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ اِس لیے پیرس کی صلح کانفرنس میں سب کے سب اتحادی ممالک کے نمائندوں کے بیٹھنے سے اچھی خاصی بھیڑ ہو جانے کا امکان تھا۔ لہٰذا طے پایا کہ پانچ بڑے اتحادی ممالک۔۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ، اٹلی اور جاپان۔۔ کی جانب سے دو دو نمائندوں پر مشتمل دس کی کونسل ترتیب دی گئی جس کی سفارشات پر منظوری کا اختیار چار کی کونسل کو دینا تھا جس میں امریکی صدر ولسن، برطانوی وزیرِ اعظم لائیڈ جارج، فرانسیسی وزیرِ اعظم کلیمنشو اور اٹلی کے وزیرِ اعظم وٹوریو ارلینڈ شامل تھے۔

پیرس کانفرنس میں ماہرین نے جنگی، تکنیکی، اسلحہ سازی، علاقائی، جغرافیائی، فوجی، سیاسی سماجی، تعمیری، معاشی، معاشرتی، معدنی، زرعی، آبادی اور طبی غرض ہر لحاظ سے اپنے اپنے ممالک کے نقصانات کا جائزہ لینے کے بعد چار کی کونسل کے سامنے شرائطِ جنگ بندی پیش کیں جن میں جرمنی کو تمام تر جنگ کا ذمہ دار گردانتے ہوئے ہر طرح کے ہرجانے اور نقصانات کی تلافی پر مجبور

کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔

صلح نامہ ورسلز کے 440 حصے تھے اور یہ 200 صفحات پر مشتمل تحریر کا حامل تھا۔ اس معاہدے کی جزیات معاہدے کی تکمیل کرنے والے اجلاس میں مورخہ 6 مئی 1919ء کو منظوری دی گئی تاہم اِس معاہدے میں اقتصادی اور جغرافیائی تخمینہ جات کے علاوہ مجلسِ اقوام کے قیام کے مسئلے کو بھی مستقبل قریب میں طے کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

صلح نامہ ورسلز کی تمام تر جزیات اور حصوں پر ایک بھرپور کتاب لکھی جا سکتی ہے یہاں اختصار اور موضوع کی مناسبت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چند ضروری شرائط درج کی جا رہی ہیں تا کہ قارئین کو جنگ کے احوال کے علاوہ جنگ بندی کے تمام تر مراحل کا بھرپور ادراک ہو سکے:

1۔ جرمنی اپنی تمام تر نوآبادیاں اتحادیوں کے حوالے کرنے کا پابند ہوگا اور اُن پر حکومت کے حق سے مکمل طور پر دستبردار ہو جائے گا۔

2۔ جرمنی الساس اور لورین کے صوبے فرانس کے حوالے کرنے کا پابند ہوگا۔

3۔ جرمنی شمالی شلسویگ ڈنمارک کے سپرد کر دے گا۔

4۔ پوسن، اپر سلیشیا اور پروشیاء کے ایسے تمام علاقے جہاں پولش آبادی کی اکثریت ہے پولینڈ کے حوالے کر دیے جائیں۔

5۔ میمل کا علاقہ لتھوانیہ کو دے دیا جائے۔

6۔ مغرب میں بلجیم کی سرحد سے ملحقہ جرمن اضلاع بلجیم کے حوالے کر دیے جائیں۔

7۔ ڈانزگ کو ایک آزاد شہر قرار دیتے ہوئے اِس کی حکومت بین الاقوامی مجلسِ اقوام (لیگ آف نیشنز) کے سپرد کر دی جائے۔

صرف اِن سات شرطوں کی وجہ سے جرمنی کا 87 ہزار مربع میل کا علاقہ اور ستر لاکھ آبادی چھن گئی۔

8۔ تاوانِ جنگ کا درست تعین چونکہ فوری طور پر نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس کا فیصلہ 1921ء تک کر لیا جائے گا تاہم جرمنی تاوانِ جنگ کا فیصلہ ہونے تک کے عرصے کے دوران 20 ارب طلائی فرینک اتحادیوں کو ادا کرنے کا پابند ہوگا

جو تاوانِ جنگ کے تعین کے بعد اُس میں سے منہا کر لیے جائیں گے۔

9۔ جرمنی اپنے تمام بحری و فضائی جہاز، کانوں سے نکلنے والا سارا کوئلہ اور ریلوے کا تمام تر سامان اتحادیوں کے حوالے کرنے کا پابند ہوگا۔ اِس رقم کا تخمینہ لگا کر اسے تاوانِ جنگ کی مجموعی رقم سے منہا کر لیا جائے گا۔

10۔ آئندہ جرمنی باقاعدہ فوج صرف ایک لاکھ (1,00,0000) رکھنے کا پابند ہوگا۔ جبکہ بحری فوج کی تعداد 15 ہزار سے کسی طور بھی تجاوز نہ کرے گی۔

11 جرمنی جبری فوجی خدمت کے قانون کا خاتمہ کرے گا اور دوبارہ اس قسم کی قانون سازی نہ کرنے کا پابند ہوگا۔

12۔ جرمنی اسلحہ اور سامانِ جنگ بھی صرف ایک لاکھ باقاعدہ فوج اور 15 ہزار بحری فوج کی ضروریات کے مطابق تیار کرے گا۔ اِس سے زائد سامانِ جنگ تیار کرنے کی صورت میں معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی اور اتحادی ممالک دوبارہ جنگ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

13۔ رہائن لینڈ کے مشرق میں پچاس کلومیٹر تک تمام تر قلعہ بندیاں ختم کر دی جائیں اور دیگر فوجی تعمیرات و استحکامات کو فوری طور پر مسمار کر دیا جائے۔

14۔ جرمن بحریہ صرف چھ جنگی جہاز، چھ چھوٹے کروزر، بارہ تباہ کن جہاز اور بارہ تارپیڈو کشتیاں رکھنے پر مجبور کیا جائے گا اِس سے زائد کوئی بھی جہاز یا مشینری رکھنے کی ہرگز ہرگز اجازت نہ ہوگی۔

15۔ بیرونِ جرمنی رہائش پذیر جرمنوں کی وہاں دورانِ جنگ چھن جانے والی جائدادوں کا کوئی معاوضہ نہ دیا جائے گا۔

یہ اور اسی طرح کی دیگر شرائط جرمن حکومت کو 7 مئی کو ارسال کر دی گئیں اور انہیں اپنے تحفظات اور تبصرہ تحریری طور پر پیش کرنے کے لیے مہلت دی گئی۔ 29 مئی کو جرمن حکومت کی جانب سے متبادل تجاویز ارسال کی گئیں۔ اتحادی سربراہان نے تمام کی تمام جرمن متبادل تجاویز مسترد اور رد کرتے ہوئے فوری طور پر معاہدہ ورسلز پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔

جرمن حکومت اور حکام کی جانب سے سخت احتجاج کیا گیا کہ یہ شرائط امریکی صدر ولسن

کے چودہ نکات کی کھلی خلاف ورزی اور بہت زیادہ ناانصافی پر مبنی ہیں جنہیں ماننا ناممکن ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ وہ اپنی قومی موت کے معاہدے پر کسی طور پر بھی دستخط نہیں کریں گے۔

اتحادیوں کی جانب سے برطانوی وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج نے جرمنی کی جانب سے پیش کردہ چند متبادل تجاویز کی تائید کی مگر اب ولسن اور کلیمنشو معاہدے کے اصل مسودے میں ترمیم نہ کرنے پر ڈٹ گئے۔ امریکی صدر کی چالبازی اور منافقت جرمن حکام پر پوری طرح کھل چکی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ انہیں صلح کے لیے سبز باغ دکھا کر دراصل امریکہ جرمن قوم کے فوری طور پر عالمی قوت بن جانے اور ترقی کر کے امریکہ کو پیچھے چھوڑ جانے کی خصوصیت سے خائف تھا۔

امریکی صدر ولسن جان چکا تھا کہ یورپ میں جرمنوں کے علاوہ کوئی بھی قوت ایسی نہیں ہے جو امریکی اثر ورسوخ کو چیلنج کر سکے۔ اتحادی ممالک اس کے ممنونِ احسان بن چکے تھے۔ ویسے بھی اُن کی معاشی، اقتصادی اور سیاسی حالت بہت پست ہو چکی تھی۔ فوجی حالت تو انتہائی ابتری کا شکار تھی۔ اس لیے وہ مسلسل امریکہ کے رحم وکرم پر تھے۔ اور امریکہ کو اپنے مفادات کے لیے انہیں استعمال میں لانا قطعاً مشکل نہ تھا۔

یورپ میں صرف ایک ہی قوم تھی جو امریکنوں کے آگے سر اُٹھا کر جینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اور وہ جرمن قوم تھی۔ اس قوم کی آبادی پورے یورپ میں سب سے زیادہ، ذہنی صلاحیت سب سے ممتاز، ترقی کی رفتار حیرت انگیز اور لڑنے کی صلاحیت ناقابلِ شکست تھی۔ اتحادی ممالک کی کثیر فوج بشمول امریکی فوج کے، ایک مدت تک اکیلے جرمنوں سے برسرِ پیکار رہی۔ ابھی بھی جبکہ جنگ بندی کا معاہدہ ضبطِ تحریر میں لایا جا رہا تھا، جرمن فوج اپنے ملک کا بھرپور دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

دوسری جانب فرانسیسی وزیرِ اعظم کلیمنشو یہ جانتا تھا کہ جرمنوں کو اکیلے شکست دینا تاریخی طور پر بھی فرانسیسیوں کے بس کی بات کبھی بھی نہیں رہا ہے۔ جرمن ہمیشہ سے فرانس سے زیادہ طاقت ور اور سائنس و ٹیکنالوجی میں بہترین ثابت ہوتے رہے ہیں۔ لہٰذا دونوں سربراہان نے اپنے اپنے مفادات کے پیشِ نظر شرائطِ معاہدہ ورسلز کے ابتدائی مسودے میں کسی بھی ترمیم کے حق میں نہ تھے۔ اور اِس بات پر مصر تھے کہ جرمنی اسے فوری طور پر قبول کرے۔ بصورتِ دیگر اتحادی افواج بذریعہ فوج کشی ان مطالبات کو منوا لیں گے۔

جرمن حکام اور قوم کے لیے یہ وقت انتہائی کٹھن اور مصیبتوں و پریشانیوں سے بھرپور تھا۔ چانسلر شنائڈ مان نے اس ذلت آمیز اور ملکی سالمیت کے منافی معاہدے پر دستخط کرنے کی بجائے مستعفی ہونا پسند کیا۔ اب جرمن صدر ایبرٹ نے باور کو چانسلر بناتے ہوئے اتحادی حکام کی منشاء کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت کی۔

جرمن نئی حکومت نے اشکبار کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسی شیش محل میں جہاں 1871ء کو آٹو وان بسمارک نے متحدہ جرمنی کی بنیادیں رکھی تھیں، عہد نامہ ورسلز کی توہین اور ذلت آمیز شرائط پر دستخط کرتے ہوئے اپنی قومی موت کو تسلیم کر لیا۔

تلخیص

مرکزی ممالک اقتصادی اور معاشی بحرانوں کا شکار ہو جانے کے باعث فکری یکجہتی اور قومی سالمیت کے جذبے کے فقدان کا شکار ہو چکے تھے۔ اتحادی افواج اور سربراہان نے بری طرح انہیں اقتصادی لحاظ سے نرغے میں بند کر رکھا تھا۔ روز افزوں گرتی ہوئی معاشی صورتِ حال نے وہاں کی عوام کو حکام بیزار اور جنگ گریز طبیعت کا حامل کر دیا تھا۔

ان حالات کے برعکس اتحادی ممالک کی رسد و کمک کا سلسلہ پوری طرح تیزی سے جاری وساری بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ بھرپور اور بہتر ہو چکا تھا۔ انہیں شکستوں پر شکستیں کھانے کے باوجود مسلسل امداد مل رہی تھی۔ اُن کی بحری تجارت جرمن آبدوزوں کے شدید اور جان لیوا حملوں کے باوجود بہرحال جاری تھی۔ اُن کی آبادی کو خوراک، پوشاک اور افراطِ زر و مہنگائی اور کم یابی کے مسائل سے سابقہ پیش نہ آیا تھا۔ اِس لیے وہ آئے روز زیادہ سے زیادہ طاقت ور اور مضبوط ہوتے چلے جا رہے تھے۔

اندرونی خلفشار کے ساتھ ساتھ مرکزی ممالک فوجی میدان میں بھی شدید مشکلات کا سامنا کر رہے تھے۔ اُن کی بہت بڑی آبادی میدانِ جنگ میں کام آ چکی تھی۔ 17 سال سے زائد عمر کے نوجوانوں کو جبراً فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اور اب چار سال گزر جانے کے بعد اُن کی نوجوان نسل کا بری طرح قلع قمع ہو چکا تھا شدید افرادی قوت کی کمی کے باعث انہیں اپنے مدِ

مقابل اتحادی ممالک کے آگے ذلت آمیز شرائط پر صلح کرنی پڑی۔

اتحادی ممالک کے حلیف اور سب سے زیادہ قربانیاں پیش کرنے کے باوجود اتحادیوں کی جانب سے معتوب اور ناپسندیدہ ملک روس کو اتحادیوں کی جانب سے امداد نہ ملنے اور اندرونِ ملک معاشی استحصال کے باعث شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اور آخرکار 3 مارچ 1918ء کو بریسٹ۔ لٹوویسک کے مقام پر جرمنی کے ہاتھوں شکست پر ذلت آمیز معاہدہ کرنا پڑا۔

1918ء ماہِ ستمبر کے آخری عشرے میں بلغاریہ نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اتحادی افواج کی شرائط پر صلح کر لی۔ جس کے بعد ترکی کی رسد کے تمام تر راستے مسدود ہو گئے اور آخرکار اسے اتحادیوں کی فوج کشی کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ 30 اکتوبر کو جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کر دیے گئے اور وہ جزوی طور پر نافذ العمل ہو گیا۔

آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری بادشاہت اپنے آخری دموں پر تھی۔ ملک 15 اقوام پر مشتمل ہونے کے باعث پہلی ہی شدید بحرانوں کا شکار رہتا تھا۔ اب ساڑھے چار سالہ جنگ کے بعد معاشی اور سیاسی حالت بہت زیادہ ابتری کا شکار تھی۔ ان حالات کے پیشِ نظر بادشاہ چارلس کو اتحادی ممالک کے آگے التجا کرنی پڑی کہ وہ ہر طرح کی شرائط پر جنگ بندی کے لیے تیار ہے۔ لہٰذا بہت زیادہ کوششوں اور التجاؤں کے بعد جنگ کا آغاز کرنے والے ملک آسٹریا۔ ہنگری کو 3 نومبر کو ذلت آمیز شرائط پر جنگ بندی نصیب ہوئی۔

جرمن فوجی زعما ابھی بھی جنگ جاری رکھنے پر مصر تھے۔ مگر رائخ سٹاگ میں یہودیوں کے زیرِ اثر افراد کی کثرت نے اتحادی سازشوں کے لیے راہ ہموار کی اور اکثریت کو مائل کیا کہ وہ ملکی اور قومی موت کے پروانے پر دستخط کرتے ہوئے ذلت کی زندگی اختیار کر لیں۔ چنانچہ 11 نومبر کو عارضی صلح کے معاہدے پر دستخط کر دیے گئے اور جنگ بندی ہو گئی۔

جرمن حکام اور عوام اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ اُن کی استدعا برائے جنگ بندی کی بنیاد امریکی صدر ولسن کے چودہ نکات تھے اور بات چیت کے اگلے مراحل بھی انہیں چودہ نکات کو محور میں رکھتے ہوئے طے پائے تھے۔ لہٰذا وہ سوچ رہے تھے کہ جنگ بندی کے بعد صلح کا معاہدہ بھی انہیں چودہ نکات کے مطابق تیار کیا جائے گا۔

مگر 7 مئی 1919ء کو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ معاہدہ ورسلز کی شرائط امریکی صدر ولسن

کے چودہ نکات کی کھلم کھلا خلاف ورزی پر مبنی تھیں۔ انہوں نے بہت زیادہ احتجاج کیا اور معاہدہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب چونکہ جرمن افواج اپنے مقبوضہ علاقوں سے پیچھے ہٹ آئی تھیں۔ بلجیم خالی کر دیا گیا تھا، لیگزم برگ سے افواج پیچھے ہٹالی گئی تھیں۔ الساس اور لورین کے علاقے فرانسیسی تحویل میں دے دیے گئے تھے۔

ڈانزگ کا شہر بھی بین الاقوامی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ اب جرمن افواج اپنی جغرافیائی بالادستی بالکل ہی کھو چکی تھیں۔ اور نسبتاً بہت کمزور مقام پر اپنی ملکی سرحدوں کی حفاظت پر مامور تھیں۔ اِن حالات میں امریکی صدر ولسن ہی اپنے چودہ نکات سے منحرف ہو گیا اور اس نے فرانسیسی وزیرِ اعظم کلیمنشو کے ساتھ مل کر جرمن حکومت کی جانب سے ترمیمی شرائط کو سختی سے رد کرتے ہوئے عدم امادگی کی صورت میں جنگ کرنے کی دھمکی دی۔

معاہدہ ورسلز کی 440 شقوں پر مشتمل 200 صفحات کی تحریر کے مطابق جرمنی کو ناقابلِ تلافی نقصانات اُٹھانا پڑے۔ جرمنی کو واحد وجہِ جنگ قرار دیتے ہوئے معتوب کیا گیا۔ فوجی صلاحیت بالکل نہ ہونے کے برابر رکھنے کی اجازت دی گئی۔ کوئلہ، ریلوے، بحری وفضائی جہاز اور خطیر رقم ہتھیالی گئی۔

چند شرائط کے تحت ہی جرمنی یورپ میں 87 ہزار مربع میل کے علاقے اور 70 لاکھ آبادی سے محروم کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں تمام جرمن نوآبادیات سے اسے محروم کر دیا گیا اور وہاں حکومت کے حق سے اسے دستبردار ہونے پر مجبور کیا گیا۔

اِس طرح ایک خونریز اور المناک داستان کا اختتام ہوا۔ برطانوی وزیرِ اعظم لائیڈ جارج نے اپنے 5 جنوری 1918ء کے خطاب میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت پر زور دیا تھا جو دنیا بھر کے تمام ممالک پر تخفیفِ اسلحہ اور ضروریات سے زائد فوج نہ رکھنے دینے کے اختیارات کا حامل ہو۔ اسی نظریے کو چند دن بعد 8 جنوری کو امریکی صدر ولسن نے اپنے چودہ نکات میں عالمی مجلسِ اقوام کے نام سے موسوم کرتے ہوئے اِس ادارے کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔

25 جنوری 1919ء کو عالمی مجلسِ اقوام کی تخلیق کے لیے تجویز منظور کر لی گئی اور اِس کے مطابق بعد ازاں ادارہ قائم کر دیا گیا جس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ مورخہ 10 جنوری 1920ء کو لنڈن میں عالمی جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اِس طرح جنگِ عظیم اول باقاعدہ طور پر اسی روز اختتام پذیر ہوئی۔

10

جنگ کے نقصانات

ساڑھے چار سالہ کشت خون کے بعد جنگِ عظیم اوّل کا اختتام ہو گیا۔ مگر یہ ساڑھے چار سال تاریخِ عالم پر ان مٹ نقوش چھوڑ گئے۔ کروڑوں خاندان سوگوار ہو گئے۔ لاکھوں لاپتہ، لاکھوں بے گھر اور لاکھوں اپاہج ہو گئے۔ زمینیں بنجر اور بارود زدہ ہو گئیں۔ ممالک کی معیشت تباہ حال ہو گئی۔ بچے کھچے انسانوں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ نفسیاتی مریض کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے۔

سخت کوشی اُن کے دلوں میں گھر کر گئی۔ بے حسی عام ہو گئی اور اپنی ذات سب سے اہم اور مقدم گردانی گئی۔ اپنے مفاد کے لیے دوسروں کو اذیت میں مبتلا کرنے کی سوچ پروان چڑھی اور اخلاقیات کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی گئیں۔

تاریخِ عالم کی پہلی عظیم المناک اور لرزہ خیز جنگ جسے جنگِ یورپ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اپنی دردناک اور خون آشام حالت کے باعث جنگِ عظیم کے نام سے یاد کی جانے لگی جس میں انسانی جانوں کا نذرانہ جانوریں کی طرح پیش کیا گیا۔

دورِ حاضر کے "روشن خیال" دانشور اور "مہذب قوموں" کے "مہذب" کرتا دھرتا حکام جو ماضی کے ادوار کو جہالت سے تعبیر کرتے ہوئے نہیں چوکتے اپنے دور میں اتنی بڑی تباہی

کا کلنک اپنے غلیظ ماتھوں پر سجائے بڑے فخر سے سر اُٹھائے اپنے اعلیٰ وارفع ہونے اور سب سے زیادہ مہذب ہونے کا جاپ الاپتے نہ تھکنے والے تاریخِ عالم میں اس سے قبل اِس قدر تباہی کی کوئی داستان پیش کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔

ماضی کی کوئی ایک داستان تو در کنار! ماضی کی تمام جنگوں کی مجموعی تباہی بھی تقریباً اسی قدر ہوگی جس قدر ساڑھے چار سالہ جنگِ عظیم میں واقع ہوئی۔ گویا 1910 سالہ تاریخ کی مجموعی قتل و غارت گری اور جنگِ عظیم اوّل کے ساڑھے چار سال میں ہونے والی خونریزی دراصل فیصلہ کر رہی ہے کہ مہذب آج کے دور کا انسان ہے کہ ماضی کا انسان؟

جنگِ عظیم اوّل کے دوران یورپ ہی نہیں ساری دنیا سخت مشکلات کا شکار رہی۔ دنیا بھر کو متحارب ممالک نے میدانِ کارزار بنا رکھا تھا۔ سمندروں، ہواؤں اور زمینوں پر جنگ جاری تھی۔ اوراس کی تباہ کاریوں سے اولادِ آدم ہی نہیں کائنات کی ہر چیز لرزہ براندام تھی۔ ماہرینِ حرب وضرب کی جانب سے جنگی نقصانات دو اقسام میں تقسیم کیے گئے ہیں:

1۔ بلاواسطہ نقصانات

2۔ بالواسطہ نقصانات

اب ہم ہر دونوں طرح کے جنگی نقصانات کا مختصراً جائزہ لیں گے:

بلاواسطہ جنگی نقصانات

بلاواسطہ جنگی نقصانات کی تعریف کے زمرے میں وہ نقصانات آتے ہیں جو بلاواسطہ طور پر متحارب ممالک اپنی جنگی کارروائیوں کے جاری رکھنے پر خرچ کرتے ہیں۔ اِن میں اسلحہ، فوجی ساز وسامان، فوجیوں کی تنخواہیں، جنگی مقاصد کے لیے مشینری وغیرہ کی خرید پر اُٹھنے والے اخراجات کو بلاواسطہ اخراجات کی مد میں شمار کیا جاتا ہے۔ 1914ء سے قبل کسی بھی جنگ میں اس قدر زیادہ بلاواسطہ یا بالواسطہ نقصانات نہیں ہوئے تھے۔

جنگِ عظیم اوّل کے آغاز 28 جولائی 1914ء سے 11 نومبر 1918ء تک جاری رہنے والی جنگ میں کُل -/1,86,33,36,37,000 امریکی ڈالر کے برابر بلاواسطہ نقصانات ہوئے۔

اتحادی ممالک کا ہر لحاظ سے زیادہ نقصان ہوا۔ اور اُن کے بلاواسطہ جنگی نقصانات کے تخمینے کے لیے ملاحظہ فرمائیں جدول نمبر ۔

دوسری جانب مرکزی ممالک کے بلاواسطہ جنگی نقصانات اگرچہ اتحادی ممالک سے نسبتاً کم تھے مگر اس کے باوجود ان ممالک کی معاشی و اقتصادی حالت بہت زیادہ ابتری کا شکار تھی۔ عوام بھوکے مر رہے تھے۔ اور سارا بوجھ درمیانی طبقہ کے ناتواں کندھوں پر آن پڑا تھا۔ مرکزی ممالک کے بلاواسطہ جنگی نقصانات کی تفصیل جدول نمبر کے ذریعے پیش کی جا رہی ہے۔

جدول نمبر 13 اتحادی اور اُن سے ملحقہ ممالک کے بلاواسطہ جنگی نقصانات

نمبر شمار	ملک		بلاواسطہ جنگی نقصان (امریکی ڈالروں میں)
1۔	ریاست ہائے متحدہ امریکہ		22,62,52,53,000/- ڈالر
2۔	برطانیہ عظمیٰ		35,33,40,12,000/- ڈالر
3۔	برطانوی راجدھانی	کینیڈا	1,66,55,76,000/- ڈالر
4۔	برطانوی راجدھانی	آسٹریلیا	1,42,32,08,000/- ڈالر
5۔	برطانوی راجدھانی	نیوزی لینڈ	37,87,50,000/- ڈالر
6۔	برطانوی نوآبادی	ہندوستان	60,12,79,000/- ڈالر
7۔	برطانوی نوآبادی	متحدہ جنوبی افریقہ	30,00,00,000/- ڈالر
8۔		دیگر نوآبادیاں	12,50,00,000/- ڈالر
9۔	فرانس		24,26,55,83,000/- ڈالر
10۔	روس		22,59,39,50,000/- ڈالر
11۔	اٹلی		12,41,39,98,000/- ڈالر
12۔	بیلجیم		1,15,44,68,000/- ڈالر

13۔	رومانیہ	-/1,60,00,00,000ڈالر
14۔	جاپان	-/4,00,00,000ڈالر
15۔	سربیا	-/39,94,00,000ڈالر
16۔	یونان	-/27,00,00,000ڈالر
17۔	دیگر اتحادی ممالک	-/50,00,00,000ڈالر
	میزان	-/1,25,69,04,77,000ڈالر

جدول نمبر 14 مرکزی ممالک کے بلاواسطہ جنگی نقصانات

نمبر شمار	ملک	بلاواسطہ جنگی نقصان (امریکی ڈالروں میں)
1۔	جرمنی	-/37,77,50,00,000ڈالر
2۔	آسٹریا۔ ہنگری	-/20,62,29,60,000ڈالر
3۔	ترکی	-/1,43,00,00,000ڈالر
4۔	بلغاریہ	-/81,52,00,000ڈالر
	میزان	-/60,64,31,60,000ڈالر

بالواسطہ جنگی نقصانات

بالواسطہ جنگی نقصانات ایسے نقصانات کہلاتے ہیں جو انسانی جانوں کے ضیاع کی اجتماعی معاشی قدر، جائیداد و املاک کے نقصان یا تباہی کے نقصانات کی قدر، آبادی کے پیداواری صلاحیت کے حامل بیشتر حصے کو بجائے پیداوار کے لیے مختص کرنے کے، فوج میں لڑنے کے لیے منتقل کرنے سے ہونے والے قومی نقصان کی قدر، جنگی نقصانات کی تلافی کے لیے امدادی امور کی انجام دہی کے لیے کیے گئے اخراجات اور غیر جانبدار ممالک کو جنگ کی وجہ سے ہونے والے

نقصانات وغیرہ۔

بالواسطہ جنگی نقصانات کا درست تخمینہ لگانا بے حد مشکل اور ناممکن ہے۔ تاہم ان کی ایک حد تک تخمیناً و اندازاً قدر کا تعین کیا جاتا ہے اور اُس کے مطابق اعداد و شمار وضع کرتے ہوئے پیش کیے جاتے ہیں۔ بالواسطہ جنگی نقصانات کے تخمینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے اِس کے تمام تر اجزاء کا تخمینہ لگائیں۔

انسانی ہلاکتوں کی قدر کے مساوی نقصانات

انسان ہی معاشرے کی اکائی ہونے کی حیثیت سے قوموں کا دراصل اثاثہ و سرمایہ ہوتے ہیں۔ انسان ہوں گے تو تعمیر و ترقی کریں گے اور دنیا میں نئی نئی ایجادیں ہوں گی۔ جبکہ تمام تر ایجادات اور ضروریات کا مقصد و مدعا صرف اور صرف انسان ہی ہے۔ انسانی جان کا کوئی بھی نعمل بدل نہ ہونے کے باعث اِس کا فی الحقیقت کوئی تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا۔

مگر جدید مہذب اقوام انسانی جانوں کی قدر و قیمت مقرر کر کے اپنے نقصانات کا تخمینہ لگاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید معاشرے میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی بجائے زر و دولت کو اہمیت حاصل ہے۔ معاشیات کے علم نے انسان کو ہر چیز کی قدر و قیمت مقرر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب انسان کی جان کی قیمت بھی متعین کی گئی ہے۔

اسی طرح کے اعداد و شمار ہمیں جنگِ عظیم اوّل کے تجزیہ نگاروں اور معیشت دانوں کی تحریروں سے ملتے ہیں جو برائے تعمیرِ فکر و سوچ اور سفید چمڑی میں ملفوف غلیظ سوچ اور فکر کی حامل اقوام کے رویے، سوچ اور ترجیحات کے بارے میں قارئین کو درست جائزہ لینے کے لے درج ذیل جدول نمبر کے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اعداد و شمار چھ اہم متحارب ممالک میں آغازِ جنگ کے وقت اوسط سوشل قدر کے حساب سے تشخیص کیے گئے ہیں۔ امریکہ میں انسانی قدر و قیمت -/4,720 ڈالر، برطانیہ میں -/4,140 ڈالر، جرمنی میں -/3,380 ڈالر، فرانس میں -/2,900 ڈالر، آسٹریا۔ ہنگری میں -/2,750 ڈالر اور روس میں -/2,020 ڈالر بیان کی جاتی ہے۔

جدول نمبر میں کی بنیاد متذکرہ بالا قدر و قیمت کے حساب سے تشخیص کی گئی ہے۔

جبکہ دیگر ممالک کی قدر و قیمت کا اندازہ مناسب تشخیص کے تحت لگایا گیا ہے:
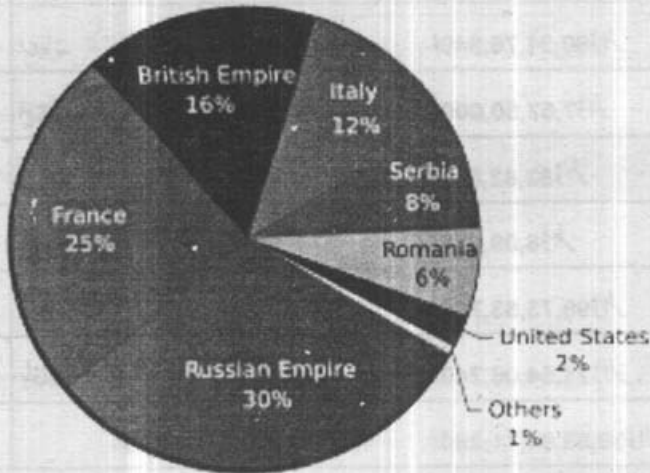
(اتحادی ممالک کی فوجی ہلاکتوں کا پائی گراف)

جدول نمبر 15 انسانی ہلاکتوں کی تشخیص کردہ قیمت کے مطابق نقصانات کا تخمینہ

نمبر شمار	ملک	ہلاکتوں کے اعداد و شمار	ہلاکتوں کی معاشی قدر
1۔	ریاست ہائے متحدہ امریکہ	1,09,740	51,79,72,800/- ڈالر
2۔	برطانیہ عظمیٰ	8,39,904	3,47,72,02,560/- ڈالر
3۔	جرمنی	19,97,365	6,75,10,93,700/- ڈالر
4۔	فرانس	16,54,550	4,79,81,95,000/- ڈالر
5۔	آسٹریا۔ ہنگری	11,32,500	3,11,43,75,000/- ڈالر
6۔	روس	40,12,064	8,10,43,69,280/- ڈالر
7۔	بیلجیم	2,72,000	78,88,00,000/- ڈالر
8۔	اٹلی	11,80,660	2,39,70,53,200/- ڈالر

نمبر	ملک	ہلاکتیں	اخراجات
9۔	سربیا	7,57,343	1,52,98,32,860/- ڈالر
10۔	رومانیہ	3,97,117	80,21,76,340/- ڈالر
11۔	یونان	37,500	7,57,50,000/- ڈالر
12۔	پرتگال	4,100	82,82,000/- ڈالر
13۔	جاپان	301	6,08,020/- ڈالر
14۔	ترکی	4,88,789	98,73,53,780/- ڈالر
15۔	بلغاریہ	1,06,637	21,54,06,740/- ڈالر
	فوجی میزان	1,29,90,570	33,56,84,71,280/- ڈالر
	شہری ہلاکتوں کا تخمینہ	1,29,90,570	33,56,84,71,280/- ڈالر
	مجموعی میزان	2,59,81,140	67,13,69,42,560/- ڈالر

اِس جدول میں شہری ہلاکتوں کو یورپی اور امریکی مبصروں اور تخمینہ نگاروں کے مطابق فوجی ہلاکتوں کے برابر تصور کرتے ہوئے درج کیا گیا۔
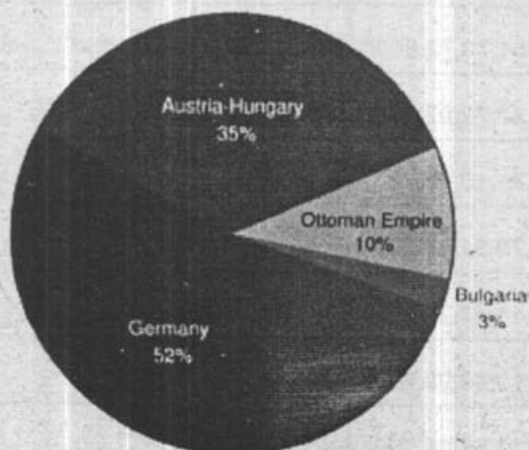
(مرکزی ممالک کی فوجی ہلاکتوں کا پائی گراف)

املاک و جائیدادوں کے نقصانات کا تخمینہ

دورانِ جنگ املاک و جائیدادوں کے نقصانات کا تخمینہ ایک مشکل ترین کام ہے۔ جس کے لیے مختلف مصنفوں اور تفتیشی اداروں نے مختلف پیمانے استعمال کرتے ہوئے تخمینے لگائے ہیں۔ جنگِ عظیم اوّل کے دوران مجموعی املاک و جائیداد کا نقصان -/36,760 ملین ڈالر رہا جس میں سے زمینی نقصانات کا تخمینہ 29,690 ملین ڈالر جبکہ سمندروں میں 6,800 ملین ڈالر رہا۔

تباہ کیے جانے والے تجارتی بحری جہازوں کا وزن تقریباً 1,53,98,392 ٹن تھا۔ جن کی تخمیناً قیمت 3,000 ملین ڈالر جبکہ ان میں موجود وزن کی تخمیناً قیمت 3,800 ملین ڈالر تھی۔ اس طرح سمندروں میں جنگی نقصانات کا تخمینہ 6,800 ملین ڈالر رہا۔

جنگی امدادی نقصانات

دورانِ جنگ بیشتر اداروں نے رضا کارانہ طور پر امدادی کارروائیوں کے لیے رقوم پیش کیں۔ اِن رقوم کا مصرف چونکہ جنگ سے متعلقہ تھا لہٰذا انہیں بھی جنگی نقصانات کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

دورانِ جنگ امدادی سرگرمیوں پر 1 بلین ڈالر کی خطیر رقم خرچ آئی۔

غیر جانبدار ممالک کا جنگی نقصان

دورانِ جنگ غیر جانب دار ممالک کو جنگ کے خطرات کے پیشِ نظر اپنی سرحدوں پر فوجوں کو تعینات کیے رکھنا پڑا۔ مزید برآں سمندروں میں بحری جنگ چھڑ جانے کے باعث انہیں اپنے بحری جہازوں کی حفاظت کے لیے خصوصی اقدامات کرنے پڑے جن پر غیر جانب دار ممالک کے رقوم خرچ ہوئیں۔

غیر جانبدار ممالک کے جنگی نقصانات کا تخمینہ -/1,75,00,00,000 ڈالر رہا۔

مجموعی بالواسطہ اور بلاواسطہ جنگی نقصان

تلخیص کے طور پر بالواسطہ اور بلاواسطہ جنگی نقصانات کے اعداد و شمار کا مجموعہ درج

ذیل ہے:

1۔ انسانی ہلاکتوں کی قدر و قیمت کا تخمینہ 67,13,69,42,560/- ڈالر
2۔ جائیداد و املاک کا نقصان 36,76,00,00,000/- ڈالر
3۔ پیداواری نقصان 45,00,00,00,000/- ڈالر
4۔ غیر جانب دار ممالک کا نقصان 1,00,00,00,000/- ڈالر
5۔ بالواسطہ جنگی نقصانات کا میزان 1,51,64,69,42,560/- ڈالر
6۔ بلاواسطہ نقصانات 1,86,33,36,37,000/- ڈالر
7۔ مجموعی نقصانات کا میزان 3,37,98,05,79,560/- ڈالر

یورپ کی مجموعی صورتِ حال

جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے پر یورپ کی حالت کسی آفت زدہ اور زلزلہ زدہ علاقے کی سی تھی۔ آبادیاں گولہ باری سے برباد ہوگئیں۔ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اب قبرستان کے مناظر پیش کرنے لگے تھے۔ بچے کھچے شہروں اور قصبوں میں زخمی اور اپاہج لوگ بچ گئے تھے۔ یا پھر معمر اور عمر رسیدہ لوگ باقی تھے۔ جوان طبقہ بہت کم رہ گیا تھا۔ بیواؤں اور یتیموں کی بہت بڑی تعداد اپنی چیخ و پکار سے آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے تھی۔

حکومتوں کے پاس عوامی فلاح و بہبود کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ خزانے بالکل ہی خالی پڑے تھے۔ پیداواری صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ آبادیاں بدامنی، افلاس، ننگ اور بھوک کا شکار ہو رہی تھی۔ صورتِ حال انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ انسانیت مظلومیتِ سراپا بنی، مکمل طور پر قابلِ رحم حالت میں تڑپ رہی تھی۔

جنگ میں اتحادی ممالک کی مجموعی ہلاکتیں 51,52,115، زخمی 1,28,31,004، قیدی یا غائب فوجیوں کی تعداد 41,21,090 رہی جبکہ ان کے فوجی نقصانات بلحاظ افواج 52.3 فیصد رہے۔

دوسری جانب اتحادی ممالک کی مجموعی ہلاکتوں کی تعداد 33,86,200، زخمیوں کے

اعداد و شمار 83,88,448، قیدی یا غائب ہونے والے فوجیوں کی تعداد 36,29,829 رہی۔ جبکہ فوجی نقصان بلحاظ افواج 67.4 فیصد رہا۔

مجموعی طور پر جنگِ عظیم اوّل میں فوجی ہلاکتیں 85,38,315، زخمیوں کے اعداد و شمار 2,12,19,452، قیدی یا غائب ہونے والے فوجیوں کی تعداد 77,50,919 رہی۔ جبکہ فوجی نقصان بلحاظ افواج 57.6 فیصد رہا۔

روس کی حالتِ زار

روس اگرچہ اتحادی ممالک کا دستِ راست تھا مگر درحقیقت اتحادی ممالک روس کے لمبے چوڑے جغرافیے اور بہت بڑی فوج سے سخت خائف تھے۔ اور وہ اسے روز افزوں طاقت ور ہوتا دیکھ کر من ہی من میں سخت کڑھتے اور نالاں رہتے تھے۔ جنگِ عظیم اوّل کے ماسٹر مائنڈز دراصل ایک پنتھ دو کاج کے مصداق جرمنی اور روس کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر دونوں کو ہی ختم کرتے ہوئے براعظم پر اپنی حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔

زار نیکولاس اور اُس کی انتظامیہ کی نالائقیوں اور ناسمجھیوں کے باعث روس کی حالتِ زار انتہائی ابتر ہو چکی تھی۔ شہروں میں ضروریاتِ زندگی کا سامان نایاب ہو گیا تھا۔ افراطِ زر کے باعث قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ اور اجرت میں آئے روز کمی ہو رہی تھی۔ مزدور اور کاریگر بھوکوں مر رہے تھے۔ حالات میں بہتری لانے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے مزدوروں نے یہودی کارل مارکس کے نظریے کو اپنے مطالبات کا مرکز مان لیا جو اُس نے بنایا ہی اسی لیے تھا کہ مزدوروں اور محنت کشوں کو حکمرانوں سے ٹکرا کر اپنے مذموم مقاصد پورے کر سکے۔

ہڑتالیں ہونے لگیں۔ عوامی حکومت بیزاری کا جذبہ عام ہوتا چلا گیا۔ اور آخر کار انقلاب بغاوت کی شکل اختیار کر گیا۔ زار نیکولاس کو تخت سے ہٹا دیا گیا اور اُس کی جگہ انقلابی حکومت لینن کی قیادت میں تشکیل پائی۔ لینن نے مجبوراً جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اِس معاہدے کے تحت روس کو:

1۔ یوکرائن

2۔ پولینڈ

3۔ فن لینڈ

4۔ لیتھوانیا

5۔ ایسٹونیا

6۔ لٹویا

کے علاقوں سے دستبردار ہوتے ہوئے انہیں آزاد اور خودمختار حکومت تسلیم کرنا پڑا۔

دوسری جانب ماورائے کاکیشیا کا کچھ حصہ ترکی کے حوالے کرنا پڑا۔ اِس طرح روس اس ذلت امیز جنگ بندی کے معاہدے کے بعد روس کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا جبکہ زرعی کھیتوں کے تین چوتھائی حصے سے بھی اسے دستبردار ہونا پڑا۔ علاوہ ازیں 60 ارب مارک تاوانِ جنگ کی ادائیگی نے ملک کے عوام کو بادشاہ اور اُس کے حواریوں کے خلاف سخت برہم اور برآنگیختہ کردیا۔ اور وہ اُن کے قتلِ عام میں مصروف ہوگئے۔ روس ایک سرے سے دوسرے سرے تک خانہ جنگی، بدامنی اور خونریزی کی آماج گاہ بن چکا تھا۔

جرمنی کی صورتِ حال

جرمنی کی صورتِ حال بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ شکست نے لوگوں کے حوصلے بالکل ہی پست کر کے رکھ دیے تھے۔ معاشی عدم استحکام، افراطِ زر، غیر منصفانہ اور دانشمندانہ تقسیم و حکمتِ عملی کے باعث درمیانی طبقہ بری طرح پس رہا تھا۔ ملک میں کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔

سیاسی طور پر ملک بھر انتشار کا شکار تھا۔ جمہوریت پسندوں، شاہ پرستوں اور کمیونسٹوں کے درمیان شدید کشمکش خونیں رنگ اختیار کرتی چلی جارہی تھی۔ شاہی خاندان کو ذلیل کر کے ملک بدر کردیا گیا تھا۔ پہلے ہی مجبور و مقہور جرمنی صلح نامہ ورسلز کے بعد بالکل ہی مفلوک الحال ہوگیا تھا۔ اِس کی طاقت وقوت سرے سے ہی ختم ہوچکی تھی۔ اب جرمنی خانہ جنگیوں اور بدامنیوں کا گہوارہ بن چکا تھا۔

معاشی مفلوک الحالی نے لوگوں کو تشدد پسند اور جرائم پیشہ بنا دیا تھا۔ پوری دنیا کو اپنے احکامات کے مطابق چلانے کی دعویدار قوم خاک و خون میں لت پت اپنے زخم چاٹ رہی تھی۔ اور

اب اس میں کسی عام سے ملک کا بھی میدانِ جنگ میں سامنا کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ ملک میں جمہوریت کے قیام کے لیے اقدامات کیے جانے لگے۔ اور اخر کار جمہوریت قائم کر دی گئی۔

آسٹریا

جنگِ عظیم اوّل سے قبل آسٹریا۔ ہنگری کی دوہری سلطنت قائم تھی۔ جنگِ عظیم اوّل میں شکست کے بعد آسٹریا۔ ہنگری کے حصے بخرے کر دیے گئے اور اِس ایک سلطنت کو چار مزید سلطنتوں میں منقسم کرتے ہوئے کچھ علاقے اٹلی، پولینڈ اور سربیا کے حوالے کر دیے گئے۔

آسٹریا کی آبادی قبل جنگ کی نسبت صرف پانچواں حصہ رہ گئی تھی۔ شمالی صنعتی علاقوں میں چیکوسلواکیہ کی آزاد حکومت قائم ہوگئی۔ جنوبی علاقوں میں یوگوسلاویہ نے ازاد جمہوریت کا اعلان کر دیا۔ ہنگری از خود ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے طور پر علیحدہ ہو گیا۔ ٹائرول کے علاقے اور آبادی اٹلی میں شامل کر دیے گئے۔ پولینڈ کے لیے ایک لمبا چوڑا ضلع آسٹریا کو چھوڑنا پڑا۔

اِس طرح جنگ کے بعد آسٹریا کے پاس صرف ویانا اور ملحقہ میدان ہی رہ گئے۔ اتحادیوں کی جانب سے آسٹریا پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اسے صرف تیس ہزار فوج اور دریائے ڈینوب میں پولیس کی تین کشتیاں رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔

چیکوسلواکیہ

چیک قوم کا پرانا ملک بوہیمیا تھا۔ یہ ملک ایک عرصے تک آسٹریا۔ ہنگری کے ایک صوبے کی حیثیت سے رہا۔ اِس صوبے کے باشندوں نے ہمیشہ آزادی کی کوششیں جاری رکھیں۔ مگر مجبوراً وہ آزادی حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے پر بوہیمیا، سلیشیا، موراویا اور سلواک قوم نے مشترکہ طور پر آزادی کے لیے جدوجہد کی اور ایک آزاد اور خود مختار جمہوریت قائم کر دی گئی۔

پولینڈ

پولینڈ بھی ایک پرانی ریاست تھی۔ جسے اٹھارہویں صدی میں پروشیا، روس اور آسٹریا۔ ہنگری نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ تاہم پولش زبان اور رسوم و رواج سو سالہ غلامی کے

باوجود اپنے تشخص اور روایات کو برقرار رکھے رہے۔ چنانچہ جب بھی پولش قوم کو موقعہ ملا وہ آزادی کے دیوانوں کی طرح آوازیں بلند کرتے۔

آخرکار جنگِ عظیم اول نے پولش قوم کو یہ سنہری موقعہ فراہم کردیا اور روس، جرمنی اور آسٹریا۔ ہنگری کی شکست کے ساتھ ہی پولش قوم نے وارسا، لوبلین، ٹیشین اور گلیشیا کے علاقوں پر مشتمل ایک آزاد اور خودمختار جمہوریت کا اعلان کردیا۔

پورا یورپ مجموعی طور پر ایک نئے نقشے کے رنگ میں ڈھل چکا تھا۔ 1914ء والا یورپ اب ماضی کی داستان کی صورت اختیار کرچکا تھا۔ کئی نئی سلطنتیں قائم ہوچکی تھیں۔ جبکہ ماضی کی بہت بڑے جغرفیے اور طنطنے والی حکومتوں کا زعم خاک میں مل چکا تھا۔

(نقشہ یورپ 1921ء میں)

تلخیص

28 جولائی 1914ء سے شروع ہونے والے جنگِ عظیم اختتام پذیر ہوچکی تھی۔ اب یورپ کی حالت کسی افت زدہ اور زلزلہ زدہ علاقے کی سی تھی۔ آبادیاں گولہ باری سے برباد ہوگئیں۔ ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اب قبرستان کے مناظر پیش کرنے لگے تھے۔ بچے کھچے شہروں اور قصبوں

میں زخمی اور اپاہج لوگ بچ گئے تھے۔ یا پھر معمر اور عمر رسیدہ لوگ باقی تھے۔ جوان طبقہ بہت کم رہ گیا تھا۔ بیواؤں اور یتیموں کی بہت بڑی تعداد اپنی چیخ و پکار سے آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے تھی۔

حکومتوں کے پاس عوامی فلاح و بہبود کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ خزانے بالکل ہی خالی پڑے تھے۔ پیداواری صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ آبادیاں بدامنی، افلاس، ننگ اور بھوک کا شکار ہو رہی تھی۔ صورتِ حال انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ انسانیت مظلومیتِ سراپا بنی، مکمل طور پر قابلِ رحم حالت میں تڑپ رہی تھی۔

جنگ میں اتحادی ممالک کی مجموعی ہلاکتیں 51,52,115، زخمی 1,28,31,004، قیدی یا غائب فوجیوں کی تعداد 41,21,090 رہی جبکہ ان کے فوجی نقصانات بلحاظ افواج 52.3 فیصد رہے۔ دوسری جانب اتحادی ممالک کی مجموعی ہلاکتوں کی تعداد 33,86,200، زخمیوں کے اعداد و شمار 83,88,448، قیدی یا غائب ہونے والے فوجیوں کی تعداد 36,29,829 رہی۔ جبکہ فوجی نقصان بلحاظ افواج 67.4 فیصد رہا۔

مجموعی طور پر جنگِ عظیم اوّل میں فوجی ہلاکتیں 85,38,315، زخمیوں کے اعداد و شمار 2,12,19,452، قیدی یا غائب ہونے والے فوجیوں کی تعداد 77,50,919 رہی۔ جبکہ فوجی نقصان بلحاظ افواج 57.6 فیصد رہا۔

ماہرینِ حرب و ضرب کی جانب سے جنگی نقصانات دو اقسام میں تقسیم کیے گئے ہیں:

1۔ بلاواسطہ نقصانات: بلاواسطہ جنگی نقصانات کی تعریف کے مطابق ایسے نقصانات جو بلاواسطہ طور پر متحارب ممالک اپنی جنگی کارروائیوں کے جاری رکھنے پر خرچ کرتے ہیں۔ اِن میں اسلحہ، فوجی ساز و سامان، فوجیوں کی تنخواہیں، جنگی مقاصد کے لیے مشینری وغیرہ کی خرید پر اُٹھنے والے اخراجات وغیرہ شامل ہیں۔

2۔ بالواسطہ نقصانات: بالواسطہ جنگی نقصانات ایسے نقصانات کو کہتے ہیں جو انسانی جانوں کے ضیاع کی اجتماعی معاشی قدر، جائیداد و املاک کے نقصان یا تباہی کی قدر، آبادی کے پیداواری صلاحیت کے حامل بیشتر حصے کو بجائے پیداوار کے لیے مختص کرنے کے، فوج میں لڑنے کے لیے منتقل کرنے سے ہونے والے قومی نقصان کی قدر، جنگی نقصانات کی تلافی کے لیے امدادی امور کی انجام دہی کے لیے کیے گئے اخراجات اور غیر جانبدار ممالک کو جنگ کی وجہ سے

ہونے والے نقصانات وغیرہ۔

بالواسطہ اور بلاواسطہ جنگی نقصانات کے اعداد و شمار کا مجموعہ درج ذیل ہے:

1۔	انسانی ہلاکتوں کی قدر و قیمت کا تخمینہ	67,13,69,42,560/- ڈالر
2۔	جائیداد و املاک کا نقصان	36,76,00,00,000/- ڈالر
3۔	پیداواری نقصان	45,00,00,00,000/- ڈالر
4۔	غیر جانب دار ممالک کا نقصان	1,00,00,00,000/- ڈالر
5۔	بالواسطہ جنگی نقصانات کا میزان	1,51,64,69,42,560/- ڈالر
6۔	بلاواسطہ نقصانات	1,86,33,36,37,000/- ڈالر
7۔	مجموعی نقصانات کا میزان	3,37,98,05,79,560/- ڈالر

اِن نقصانات کے علاوہ بیواؤں، یتیموں، زخمیوں اور اپاہج افراد کی کثیر تعداد جنگِ عظیم اوّل کے تحائف تھے جو پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ کیا اتحادی اور کیا مرکزی قوتیں! سب کے سب انتہائی ناگفتہ بہ حالت کا شکار تھے۔

یورپ کا نقشہ بھی بدل چکا تھا۔ اٹلی، فرانس اور سربیا (بعد از جنگ یوگوسلاویہ) کے علاقوں میں اضافہ ہوا تھا۔ جبکہ آسٹریا۔ ہنگری صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ اِس کی جگہ آسٹریا اور ہنگری کی دو الگ الگ ریاستیں وجود میں آچکی تھیں۔ چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ پولینڈ، یوکرائن، فن لینڈ، لتھوانیا، لٹویا اور ایسٹونیا کی آزاد اور خود مختار ریاستوں کا قیام عمل میں آچکا تھا۔

حصہ چہارم

اثراتِ جنگ

11

اقوامِ عالم پر اثرات

جنگِ عظیم اوّل تاریخ عالم کی سب سے پہلی عظیم ترین جنگ کی حیثیت سے ایک اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ قبل ازیں تاریخ عالم میں کوئی بھی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں اس قدر سپاہ، ممالک، اسلحہ، توپ خانہ اور جدید جنگی ساز و سامان استعمال ہوا ہو۔ جبکہ ایک اور نوعیت میں بھی یہ جنگ یکتا اور تاریخ عالم میں پہلے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں پہلی بار ہوائی جہازوں کا استعمال ہوا۔

لڑاکا طیارے بنائے گئے اور اُن میں روز بروز بہتری لانے کے لیے بہت زیادہ کاوشیں اور کوششیں کی گئیں۔ بحری جنگ کے نئے نئے انداز متعارف ہوئے۔ اور خندقوں کی بہت بڑی لڑائی نے دفاع اور حملے کے لیے نئے نئے اصول وضع کرنے کے مواقع دیے۔ یہیں ایک اور بھی حقیقت آشکار ہوئی کہ طاقت ور کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون اہمیت نہیں رکھتا۔

جنگِ عظیم اوّل کے اثرات پورے عالم پر بہت دور رس اور دیرپا قائم ہوئے۔ خصوصاً یورپ جو بیسویں صدی کے آغاز پر عالمی امامت کے منصب کا علمبردار تھا، اپنے منصب اور عہدے سے بتدریج پیچھے ہٹنے لگا۔ جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں نے تمام یورپی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا

تھا۔ اور یہی یورپی ممالک دنیا بھر میں اپنی نوآبادیوں اور راج دھانیوں کے ذریعے اپنا اقتدار قائم کیے ہوئے تھے۔

جن عالمی ممالک کا اقتدار حاصل نہ تھا انہیں اپنے تجارتی مکروفریب کے ذریعے دام میں پھنسانے کے لیے پھندے تیار کیے جا رہے تھے۔ اِس طرح یورپی ممالک خصوصاً برطانیہ، فرانس، جرمنی، بیلجیم اور اٹلی یورپ کے علاوہ دیگر دنیا سے بھی بہت زیادہ متعلق اور کم از کم تجارتی رابطے میں ہونے کے باعث اثرات مرتب کر رہے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جنگِ عظیم کے منفی اثرات پورے عالم پر محسوس کیے گئے۔ 1919ء کے بعد کا بین الاقوامی نظام نصف صدی قبل کی سفارتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورتِ حال سے یکسر مختلف اور غیر مستحکم تھا۔ ساڑھے چار سالہ عالمی جنگ نے دنیا بھر کی آبادی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ معاشی اور اقتصادی صورتِ حال ابتری کا شکار تھی۔ جنگ کے فوراً بعد یورپ میں وبائیں، امراض، قحط سالی اور تنگ و افلاس نے ڈیرے جما لیے تھے۔

سخت ترین فوجی نظام اور اس کے مظالم اپنی انتہا پر تھے۔ اگرچہ باقاعدہ میدانِ جنگ ختم ہو چکا تھا مگر بہت سی سرحدوں پر اب بھی حالتِ جنگ قائم تھی۔ اور قتلِ عام تیزی سے جاری تھا۔ لاکھوں افراد انفلوئنزا اور دیگر وباؤں کا شکار ہو رہے تھے۔ اِس طرح بعد از جنگ کروڑوں افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاست دانوں سے لیکر کسانوں تک، مزدوروں سے لیکر افواج تک ہر شخص ہی جنگ کی تباہ کاریوں سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ اور متاثر ہونے والے افراد کے لیے جگہ اور نسل کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ہر جگہ جنگ کے اثرات نظر آ رہے تھے۔ جہاں کوئی مادی یا مالی نقصان نہ ہوا تھا وہاں انسانی تباہی کے نتیجے میں غم و غصہ اور نفسیاتی صدمہ اپنا رنگ جمائے ہوئے تھا۔

1918ء کی جنگ بندی اور 20-1919ء کے معاہدوں کے باعث دنیا کے چند حصوں میں ہی امن قائم ہو سکا۔ جبکہ دیگر خطے جنگ کی لپیٹ میں رہے۔ مشرقی یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیاء جنگ کے مناظر پیش کرتے رہے۔ روس میں خانہ جنگی تیزی سے بھڑک اُٹھی تھی۔ پولینڈ، یوکرائن کی روس سے جنگ چھڑ گئی۔ ہنگری نے رومانیہ سے اعلانِ جنگ کر دیا۔

شام میں فرانس کی حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ عراق میں برطانوی استعمار کے خلاف لڑائی شروع ہوگئی۔ عرب میں عبدالعزیز ابنِ سعود حجاز کے شاہ حسین سے برسرِ پیکار تھا اور 1925ء تک برطانوی امداد سے شاہ حسین کو شکست دے کر پورے حجاز پر قابض ہو گیا۔ ایران پر برطانوی اثرورسوخ کے خاتمے کے لیے روسی ایما پر بغاوت بلند ہوئی۔

مرکزی یورپ کی صورتِ حال بھی کسی طور بہتر نہ تھی۔ فرانسیسی حکام کے اختیار میں دیا گیا جرمن راہن لینڈ کا علاقہ حالتِ جنگ کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ دوسری جانب کمیونسٹوں کے ساتھ بوریا کے علاقے میں خونی فسادات اور لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ مشرقی یورپ میں بھی فضا خون آلود تھی۔ اور افریقہ میں نوآبادیات کی بندر بانٹ کا بازار پھر سے گرم ہو چکا تھا۔

معاشی، معاشرتی اور سیاسی اثرات

1919ء کے اوائل میں بڑی اور چھوٹی اتحادی طاقتوں کے سیاست دان پیرس میں اکٹھے ہوئے تاکہ صلح، قیامِ امن، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔ ورسیلز کی صلح کے معاہدے نے بہت سے معاملات بظاہر نمٹا دیے۔ نئی جغرافیائی حد بندیاں کردی گئیں۔ اور وہاں حکومتوں کے قیام کا عمل بھی طے پا گیا۔ مگر معاشی بحران، قرضوں کی ادائیگی اور جنگ کے باعث بدلنے والے صنعتی، زرعی اور معاشی و اقتصادی ترقی کے رجحان کا مسئلہ حل طلب ہی رہا۔

جنگِ یورپ نے عالمی قوتوں کے منظرنامے کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ جنگ سے قبل کی عظیم قوتیں اب شدید مشکلات کا شکار تھیں۔ اُن کی کثیر آبادی ضائع ہو چکی تھی۔ سیاسی انتشار عام تھا۔ اور معاشی بحران اُن کے گلوں میں پھندوں کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ اس جنگ نے پوری دنیا پر اپنے اثرات مرتب کیے تھے۔

معاشی اثرات

جنگِ عظیم کے نتیجے میں ہونے والی تباہ کاریوں کی مثال روئے زمین پر کہیں بھی نہیں ملتی۔ اس عظیم المیے میں لاکھوں گھر مسمار ہو گئے۔ کھیت کھنڈر بن گئے۔ سڑکیں اور ریلوے کا نظام تباہ حال ہو گیا۔ مواصلات اور رسل و ترسیل کا نظام جڑوں سے اکھڑ کر رہ گیا۔ تار کی لائنیں صفحہ ہستی

سے مٹ گئیں۔ مال مویشی کی بہت بڑی تعداد ہلاک ہوگئی۔ جنگلات جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

دورانِ جنگ نہ پھٹنے والے بموں اور بارودی سرنگوں کی وجہ سے قابلِ کاشت زمین میں کاشتکاروں کا داخلہ بند ہوگیا۔ جو زرعی ضروریات کے لیے پیداوار کی واضح کمی کا باعث بنا۔ جہازوں کی تباہی، مواصلات کے بہت زیادہ اخراجات اور متحارب ممالک کے قرضوں اور اُن پر سود کی شرح سب ہی کچھ تو معاشی اور اقتصادی بحرانوں میں اضافے کا باعث تھا۔

دورانِ جنگ لیے قرضوں کے بارے میں ایک محتاط اندازہ یہ ہے کہ 260 بلین ڈالر کی خطیر رقم بطور قرض متحارب ممالک نے وصول کی۔ جبکہ یہ شرح جنگ سے قبل کے ایک سو دس سال میں لیے گئے قرضوں کی شرح سے چھ گنا زیادہ ہے۔ کئی عشروں کی مسلسل ترقی کے بعد جنگ کی وجہ سے عالمی پیداوار میں کمی واقع ہوئی تھی۔

1920ء میں عالمی پیداوار میں 1913ء کی نسبت 7 فیصد کمی واقع ہوئی تھی۔ زرعی پیداوار بھی ایک تہائی کمی کا شکار تھی۔ ممالک کی برآمدی شرح جنگ سے قبل کی شرح کا نصف ہوچکی تھی۔ اور یورپ کی اقتصادی حالت سہاروں کی محتاج تھی جس میں سخت سست روی کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ایک تخمینے کے مطابق 1929ء میں حاصل ہونے والی پیداواری شرح عدمِ جنگ اور 1913ء کی پیداواری شرح کے مطابق جاری رہنے کی صورت میں 1921ء میں ہی حاصل ہوجاتی۔ گویا یورپ اقتصادی اور معاشی ترقی کے معاملے میں آٹھ (8) سال پیچھے چلا گیا تھا۔

یہ حال تو یورپ کا تھا۔ دیگر عالمی ممالک کی پیداواری صلاحیت ویسے ہی بہت کم تھی اور وہ یورپ پر ہی انحصار کرتے تھے۔ لہٰذا یورپ کے اقتصادی حالات میں کوئی بھی خرابی بالواسطہ طور پر دیگر عالمی ممالک کی معیشت و اقتصادیات کو بری طرح متاثر کرتی تھی۔ اب جنگِ عظیم کے باعث یہ ممالک بری طرح معاشی استحصال کا شکار تھے۔

جنگِ عظیم کے باعث جہاں بیشتر ممالک اور معاشرے بری طرح تباہ و برباد ہوگئے تھے وہیں چند ایک بچ بھی گئے تھے اور بعض نے دورانِ جنگ ہونے والی صنعتی ترقی، سائنسی تحقیق، ٹیکنالوجی اور دیگر پیداواری ذرائع کی افزائش کے باعث اپنی حالت پہلے سے بہتر بنالی تھی۔

جنگِ عظمی کے دوران متحارب ممالک نے طیارہ سازی پر بھرپور توجہ دی اور طیارہ سازی کی ترقی کی صحیح رفتار کا تعین ممکن ہوا۔ بہت بھاری اور زیادہ مقدار میں جنگی سازوسامان کی نقل و حمل

کے لیے ٹرکوں کی پیداوار بڑے پیمانے پر ہوئی۔ کیمیکلز، بجلی، رنگ سازی اور فولادی مرکبات کی تیاری پر نت نئے تجربات کیے گئے۔ اور نئی نئی مصنوعات بنائی گئیں۔

شریکِ جنگ ممالک تو جنگی حالات کا شکار تھے۔ مگر میدانِ کارزار سے دور واقع ممالک نے اِن سہولیات سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی آبادی کا معیارِ زندگی بہتر بنایا۔ ایک بار اِن جدید صنعتی اشیاء کی طلب بڑھ جانے کے باعث ان کی رسد کے لیے صنعتوں کا وسیع پیمانے پر قیام عمل میں لایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ میدانِ جنگ سے دور دراز کے علاقے مثلاً امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، برصغیر اور جنوبی امریکہ کے بعض ممالک شریکِ جنگ ممالک کے صنعتی، خام مال اور غذائی اشیاء کے مطالبات کو پورا کر کے اپنی اقتصادی حالت کو مستحکم کر رہے تھے۔ اِس امر کو مزید واضح کرنے کے لیے جدول نمبر 16 ملاحظہ فرمائیں:

جدول نمبر 16 عالمی صنعتی پیداوار کی شرح (1913ء---1925ء)

خطے	1913ء	1920ء	1925ء
دنیا	100	93.6	121.6
یورپ	100	77.8	103.5
روس	100	12.8	70.1
امریکہ	100	122.2	148.0
دنیا کے بقیہ ممالک	100	109.5	138.1

مندرجہ بالا جدول نمبر 16 سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جنگِ عظیم اوّل نے عالمی پیداواری اور صنعتی رجحان کا رخ یورپ اور روس سے جاپان، امریکہ، برصغیر اور آسٹریلیا وغیرہ کی جانب موڑ دیا تھا۔ یہ امرِ واقع ہے کہ یہ رجحان انیسویں صدی کے آخر سے فروغ پانے کے لیے مواقع کے انتظار میں تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جنگِ عظیم کے نہ ہونے کی صورت میں اِس رجحان کے واضح ہونے

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

اِس رجحان کی وجہ متحارب ممالک کی ایک دوسرے کی تجارتی ناکہ بندی بھی تھی۔ جس نے عالمی پیداوار اور تجارت کے عرصہ دراز سے قائم نظام کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ یورپ کے عروج کے ادوار میں دیگر عالمی منڈیوں میں وہ دم خم کبھی بھی نہ تھا جس کے تحت وہ یورپ پر سبقت لے جانے کی اہلیت حاصل کرلیتیں۔ مگر یہ جنگ ہی تھی جس نے یورپی ممالک کو ایک دوسرے کی بیخ کنی کرنے پر مامور کیا اور دیگر عالمی منڈیوں کو وقتی طور پر ہی صحیح زور آور کردیا۔

یورپی اقوام ایک بار جنگ کی اندوہناک حالت سے نکل آنے کے بعد صنعت اور زراعت میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑی تھیں۔ شریکِ جنگ ہونے کے باعث وہ میدانِ جنگ میں صنعتی، زرعی اور معاشی و اقتصادی ترقی کی اہمیت و ضرورت سے بخوبی واقف ہو چکی تھیں۔ اور اب عالمی منظر نامے میں اپنی بقا اور وجود کی سلامتی کے لیے انہوں نے از سرِ نو جدوجہد شروع کردی تھی۔ جس کے باعث ان کا کھویا ہوا وقار بحال ہونا شروع ہو چکا تھا۔

معاشی اور اقتصادی بحران کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے اخراجات سے معاشی اور سیاسی مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ متحارب ممالک میں سے بہت کم نے اپنے جنگی نقصانات پورے کرنے کے لے ٹیکس نافذ کیے۔ اکثریت دیگر ممالک سے قرض پر قرض لیے جارہی تھی اور اِس امید پر ٹیکس نافذ کرنے سے گریزاں تھی کہ شکست خوردہ ممالک سے تاوانِ جنگ وصول ہونے پر قرضہ جات کی ادائیگی کردی جائے گی۔

تاوانِ جنگ کی ادائیگی نہ ہوسکنے کے باعث افراطِ زر میں بے تحاشا اضافہ ہو چکا تھا اور اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ جنگی اقتصادی بحران، علاقائی چھینا جھپٹی اور اخراجات میں بے پناہ اضافے کے باعث 1919ء میں کوئی بھی یورپی ملک سونے کی بنیاد پر کرنسی کے اجراء پر رضامند نہ تھا۔

وسطی اور مشرقی یورپ کے ممالک میں برآمدات کو فروغ دینے کے لیے ملکی کرنسی میں تخفیف کی گئی۔ جس سے مالیاتی عدم استحکام پیدا ہوا اور سیاسی چپقلش بھی رونما ہوئی۔ اتحادی ممالک کی کثیر تعداد برطانیہ اور فرانس کی مقروض تھی۔ جبکہ یہ دونوں ممالک بری طرح امریکی قرضوں میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ امریکہ اپنی رقم واپس طلب کر رہا تھا۔ جبکہ فرانس اٹلی اور دیگر ممالک اس شرط پر قرضوں کی واپسی پر تیار تھے کہ جرمنی تاوانِ جنگ کی ادائیگی کرے۔

دوسری جانب جرمنی نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ رقم دینے کا پابند ہے مگر موجودہ حالات میں وہ پھوٹی کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔ اِدھر برطانیہ نے جرمنی کے تاوانِ جنگ کی ادائیگی کے منفی رویے اور اُس کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیشِ نظر امریکہ کو سالانہ قسط روانہ کرتے ہوئے کہلوا بھیجا کہ یہ آخری قسط ہے کیونکہ جرمنی کے تاوانِ جنگ کی عدم ادائیگی کے باعث وہ قرضے کی رقم ادا کرنے سے قاصر ہے۔

سیاسی اثرات

یہ نئے حالات بین الاقوامی سیاسی اور سفارتی محاذ پر کشیدگی کا باعث بن گئے اتحادی ممالک ایک دوسرے سے نالاں اور گریزاں نظر آنے لگے۔ جرمنی سے تاوانِ جنگ کی ادائیگی کے مسئلے پر امریکہ اور برطانیہ فرانس سے دور ہونے لگے۔ دوسری جانب فرانس اِس بات پر سختی سے مصر تھا کہ جرمنی فوری طور پر تاوانِ جنگ کی ادائیگی کرے۔ جبکہ اول الذکر دونوں ممالک اِس نازک صورتِ حال میں جرمنی کو قرضے دیکر اگلے پچاس یا سو سال تک اُن قرضوں کا سود کھانے کے چکر میں تھے۔

ہر ملک اپنے اپنے مفادات کے لیے ضروری اقدامات کر رہا تھا۔ دوسری جانب یورپ میں حیران کن تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی عظیم سلطنتوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں۔ اِن ریاستوں میں اندازِ حکومت پر بحث و تمحیص ہو رہی تھی۔

جرمن نوآبادیات برطانیہ، فرانس اور جاپان کی تحویل میں چلی گئی تھیں۔ اِس طرح افریقی ممالک پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ وہاں کی سیاسی ساخت اور معاشرتی ترتیب میں پہلے کی نسبت تبدیلی رونما ہوئی۔ ترکی کے مقبوضہ علاقے برطانیہ اور فرانس نے اپنی تحویل میں لے لیے جس کے باعث مشرقِ بعید اور یورپ کے جنوبی حصوں میں سیاسی، سماجی اور جغرافیائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

معاہدہ ورسلز کے تحت عالمی مجلسِ اقوام کا قیام بھی عمل میں لایا جا چکا تھا۔ جر بعد از جنگ

اپنے قیام کے بعد کے تمام تر سیاسی معاملات کی نگرانی اور درستگی کا ذمہ دار تھا۔ 1920ء کے اوائل میں اِس ادارے کی سرپرستی میں مشرق و مغرب میں سیاسی استحکام نظر آنے کی امیدیں پیدا ہو چکی تھیں۔ مگر اب کی بار امریکہ اِس ادارے کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے خائف ہو چکا تھا اور اس نے اس ادارے سے انحراف کرنا شروع کر دیا تھا۔

مگر بظاہر یہ واضح ہو چکا تھا کہ ممالک کی قیادت سے پوری دنیا تنگ آ چکی ہے اور وہ ایک ایسے ادارے کی سیادت و قیادت تسلیم کرنے کی خواہاں ہے جو تمام اقوام کے لیے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہوئے ان کے مطابق عمل درآمد کروانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ جنگ کے مارے ہوئے ممالک کی امید بندھی تھی کہ اب جو بھی دشواریاں رہ گئی ہیں اور جو مستقبل میں پیش آنے والی ہیں انہیں کوئی ایک ملک اپنے مفادات کی عینک سے دیکھتے ہوئے حل کرنے کی بجائے عالمی مجلسِ اقوام کے پلیٹ فارم پر حل کیا جائے گا۔

اِس سیاسی صورتِ حال سے خائف ہو کر امریکہ نے عالمی مجلسِ اقوام کی سرپرستی سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ کیونکہ امریکہ جنگِ عظیم کے بعد عالمی منظرنامے کا سب بڑا، طاقت ور اور معاشی طور پر سب سے مستحکم ملک تھا۔ لہٰذا عالمی مجلسِ اقوام سے لاتعلقی کے باعث اِس ادارے کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔

اسی اثنا میں اِس ادارے پر برطانوی اور فرانسیسی سیاست دان چھائے رہے۔ ایک عرصے تک دنیا کی ساری طاقت مرکزی یورپ کے محور کے گرد گھومنے لگی۔ اب امریکہ کو یہ احساس ہو گیا کہ سفارتی و سیاسی علیحدگی سے دیگر یورپی ممالک زور آور ہوتے جا رہے ہیں اور عالمی طاقت کا رجحان یورپ سے امریکہ منتقل ہو جانے کے بعد ایک بار پھر یورپ کی طرف منتقل ہو رہا ہے تو اُس نے دوبارہ عالمی مجلسِ اقوام کے پلیٹ فارم میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

دوسری جانب فرانس جو تاوانِ جنگ کی ادائیگی کے مسئلے پر برطانیہ اور امریکہ سے سیاسی کشیدگی کا شکار ہو چکا تھا۔ اپنی بقا اور سلامتی کا متلاشی نظر آ رہا تھا۔ امریکی سینٹ کے معاہدہ ورسلز کو قالعدم قرار دینے کے باعث اب فرانس کو امریکہ اور برطانیہ سے سخت شکایات تھیں۔ وہ اِن ممالک کا متبادل تلاش کر رہا تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے مشرقی یورپ کی نئی قائم شدہ ریاستوں کے ساتھ جوڑ توڑ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

فوجی اثرات

جنگِ عظیم اول کے پوری دنیا پر بہت گہرے فوجی اثرات مرتب ہوئے کیونکہ قبل ازیں اتنے بڑے پیانے پر اتنی بڑی جنگ تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ اِس طرح یہ جنگ نہ صرف معاشی، معاشرتی، سیاسی، سفارتی اور فکری لحاظ سے بہت زیادہ متاثر کن اور فوری حوالے کے طور پر ایک اہم سنگِ میل اور تاریخی حقیقت کے روپ میں جانی جاتی ہے بلکہ فوجی نقطہ نظر سے اِس کی حیثیت جدید جنگ اور طریقہ جنگ میں نہایت بنیادی اور مرکزی ہے۔

اِس جنگ میں پہلی بار انسانوں نے مشینوں پر بہت زیادہ انحصار کیا۔ جدید اسلحہ سازی نے ممالک کی فوجی کارروائیوں کے لیے صنعتی ترقی کو بہت زیادہ اہم بنادیا۔ کیونکہ جنگِ عظیم اول نے ثابت کردیا تھا کہ بہادر اور مشاق افواج جدید اسلحہ کے بغیر بے بس اور لاچار ہو جاتی ہیں۔

ساڑھے چار سالہ جنگ کی ہولناکیوں سے یہ بات واضح طور پر عیاں ہوچکی تھی کہ جو فوج بروقت، پورے ساز وسامان کے ساتھ میدانِ جنگ میں پہنچ جائے گی اور اس کی ترسیل و کمک بلا روک ٹوک بہم پہنچائی جاتی رہے گی وہ ضرور بہ ضرور کامیاب ہوگی۔ اِس طرح فوجی نقل وحمل کا نظام فتح اور فوجی کارروائیوں کے لیے جزوِ لازم بن گیا۔ اِس لیے اِس میں جدت لائی گئی اور اسے بتدریج سادہ سے پیچیدہ اور وسیع ترین بنادیا گیا۔

نئے طریقوں اور اسلحہ میں جدت لانے کے لحاظ سے 1914ء تا 1918ء جنگ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ دوسری جنگِ عظیم میں سوائے ایٹم بم کے تمام تر ہتھیار وہی استعمال ہوئے جو جنگِ عظیم اول میں آزمودہ تھے۔ ٹینکوں کی ایجاد کی گئی۔ نئے نئے بحری جہاز بنائے گئے۔ آب دوزوں کے کامیاب تجربات کیے گئے۔ ہوائی جہازوں کو میدانِ جنگ میں استعمال میں لایا گیا۔

کیمیائی گیس کا عالمی تاریخ میں پہلی بار استعمال کیا گیا۔ خندقوں کی لڑائی کے انداز واطوار طے کیے گئے۔ جنگِ عظیم اوّل کا ایک اور اچھوتا ہتھیار پراپیگنڈا بھی تھا۔ اِس ہتھیار نے ٹینک کی طرح بہت زیادہ کامیابی اور شہرت حاصل کی۔ دونوں متحارب گروپوں نے ایک دوسرے کے خلاف بھرپور پراپیگنڈا کیا۔

جنگِ عظیم اوّل نے دیگر فوجی اثرات کے علاوہ جنگی حکمتِ عملی اور داؤ پیچ کے لحاظ سے بھی جدید انداز متعارف کرائے۔ ہوٹیئر کی جنگی تدبیر نے اتحادی افواج کی مضبوط دفاعی لائن کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیے۔ جبکہ دوسری جانب عقبی فوٹوگرافی کے استعمال نے جنرل فوش کو اِس قابل بنایا کہ وہ جرمن حملوں کے مدِ مقابل ثابت قدمی سے ڈٹا رہے۔ تاہم یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ جنرل لیوڈنڈروف کے پاس افرادی قوت کی کمی اسے اتحادی افواج پر برتری دلانے میں رکاوٹ رہی۔ جبکہ جنگی حکمتِ عملی میں اُس کی رسائی اتحادیوں سے کہیں زیادہ تھی۔

فکری اثرات

یورپ میں جغرافیائی تبدیلیوں سے زیادہ اہمیت فکری، اصولی اور دستوری تبدیلیوں کی تھی۔ جنگ سے قبل یورپ میں 19 بادشاہتیں اور 3 جمہوریتیں قائم تھیں۔ لیکن 1922ء میں وہاں 14 جمہوریتیں، 13 بادشاہتیں اور تین مخلوط (ریجنسیز) قائم ہو چکی تھیں۔ سب سے اہم امر یہ کہ چند ریاستوں میں ایک نئی طرزِ حکومت کی بنیادیں بھی پڑ چکی تھیں جو نہ ہی قبل ازیں دیکھنے کو ملی تھیں۔ اِن میں کمیونزم، سوشلزم اور فاشزم شامل ہیں۔

آنے والے دور میں ان دستوری تبدیلیوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا اور عالمی سیاست، معاشرت، معیشت و اقتصادیات پر اپنے گہرے نقوش مرتب کیے۔ دو قطبی دنیا کے قیام کی بنیادیں دراصل جنگِ اعظیم اول سے ہی رکھ دی گئی تھیں۔ اب عالمی قیادت کی باگ دوڑ ممالک کی بجائے نظریہ اور اصول کی بنیاد پر رکھی جانے لگی تھی۔ یہی وہ دستوری ادارے تھے جنہوں نے عالمی مجلسِ اقوام کے ادارے کو ایک اکھاڑے کا کردار ادا کرنے پر مجبور کر دیا اور آخر کار اس کو بے آبرو اور غیر فعال کرتے ہوئے دوسری جنگِ عظیم کی بنیاد ڈالی۔

مارکسی کمیونزم کے روس میں بالشویکی انقلاب کے ذریعے پھیل جانے کے باعث مزدوروں اور محنت کشوں نے پوری دنیا میں اپنی آواز بلند کی۔ آزاد تجارت اور منڈیوں کے داعی امریکی کرتا دھرتاؤں نے مزدوروں کو ہاتھوں سے نکلتا ہوا پایا تو بڑے پیمانے پر پہلی بار مزدوری کے دورانیے کو 8 گھنٹے متعین کیا گیا۔

فرانس کے موسولینی کے نظریے کے مطابق تمام افراد اور ادارے ریاستی فلاح و بہبود کے لیے وقف تھے۔ فاشزم کے مطابق عوام نہیں بلکہ ریاست ہی مقصد تھا جبکہ اِس کے سواء سب کچھ اِس مقصد کے حصول اور بہتری کے لیے درکار تھا۔

غرض جنگِ عظیم اوّل نے عالمی منظرنامے میں بہت زیادہ فکری، اصولی اور دستوری اثرات مرتب کیے۔ یہی فکری اثرات تھے جو آگے چل کر عالمی مناظر میں تبدیلی، نئے افق کے تعین اور سوچ کے انداز واطوار کے سلیقے طے کرنے میں بنیادی کردار ادا کر رہے تھے۔ ایک نئی دنیا کا ظہور ہو رہا تھا اور متذکرہ بالا افکار میں سے کسی ایک یا دو فکروں نے دنیا بھر پر چھا جانا تھا۔

دورانِ جنگ سفارتی اعلیٰ حکمتِ عملی بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل رہی اور یہ احساس پیدا ہوا کہ جنگ محض سرحدوں پر فوجوں کی لڑائی کا نام نہیں بلکہ بین الاقوامی تعلقات اور کامیاب سفارت کاری کے ذریعے بھی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ اتحادی ممالک جو میدانِ جنگ میں جرمنی کے ہاتھوں بری طرح پِٹ چکے تھے اپنی کامیاب سفارت کاری کے باعث ہی فتح یاب ہو سکے تھے۔

تلخیص

1918ء کی جنگ بندی اور 20-1919ء کے معاہدوں کے باعث دنیا کے صرف چند حصوں میں ہی قیامِ امن ممکن ہو سکا تھا۔ جبکہ دیگر خطے جنگ کی بھٹی میں سلگ رہے تھے۔ مشرقی یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیاء جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ روس میں خانہ جنگی جاری تھی۔ پولینڈ، یوکرائن کی روس سے جنگ چھڑ گئی تھی۔ جبکہ کمیونسٹ ہنگری نے رومانیہ سے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔

شام میں فرانس کی حکومت کے خلاف بغاوت ہوگئی۔ عراق میں برطانوی استعمار کے خلاف لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عرب میں عبدالعزیز ابنِ سعود حجاز کے شاہ حسین کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا اور 1925ء تک برطانوی امداد سے شاہ حسین کو شکست دے کر پورے حجاز پر قابض

ہوگیا۔ ایران پر برطانوی اثر ورسوخ کے خاتمے کے لیے در پردہ روسی ایما اور پشت پناہی کے باعث بغاوت بلند ہوئی۔

مرکزی یورپ کی صورتِ حال بھی کبیدہ خاطر تھی۔ فرانسیسی حکام کے اختیار میں دیے گئے جرمن رائین لینڈ کے علاقے میں جنگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ دوسری جانب کمیونسٹوں کے ساتھ بوریا کے علاقے میں خونی فسادات اور لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ مشرقی یورپ میں بھی فضا خون آلود تھی۔ اور افریقہ میں نوآبادیات کی بندر بانٹ کا بازار پھر سے گرم ہو چکا تھا۔

یورپ کی معاشی صورتِ حال بری طرح تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ بہت سے ممالک بھوک اور افلاس کے باعث زلزلہ زدہ علاقوں کے مناظر پیش کرتے تھے۔ اپاہج، زخمی، بیمار اور بیواؤں و یتیموں کی اکثریت اپاہج اور نیم مردہ معیشت پر مزید بوجھ ڈال رہی تھی۔ جنگ کے لیے اُٹھائے گئے قرضوں اور اُن پر بھاری سود کی رقم گزشتہ ایک سو دس سال کے مجموعی قرضوں سے بھی چھ گنا زیادہ ہو چکی تھی۔

اِن حالات میں جبکہ ایک طرف شریکِ جنگ ممالک کی معیشت بری طرح تباہ حال تھی تو میدانِ جنگ سے دور دراز ممالک کو صنعتی ترقی اور معاشی استحکام کا موقعہ ملا۔ جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ تاہم جنگ کے بعد یورپی اقوام نے ایک بار پھر معاشی اور زرعی ترقی کی طرف بھرپور توجہ دی اور اپنی صورتِ حال بحال کرنے کی کوشش کی۔

قرضوں کی واپسی اور تاوانِ جنگ کی ادائیگی کے مسئلے پر اتحادی ممالک آپس کشیدگی کا شکار ہو گئے۔ امریکہ نے سفارتی خاموشی اختیار کر لی۔ اس دور میں عالمی مجلسِ اقوام نے بھرپور سیاسی کردار ادا کیا اور پوری دنیا کے مسائل کے حل کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اقوامِ عالم میں آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا۔

جنگِ عظیم نے فوجی تنظیم، حکمتِ عملی اور عمل کے ساتھ ساتھ جدید اسلحہ سازی کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔ انسانوں کا مشینوں پر انحصار کرنے کا رجحان تیزی سے پھلا پھولا۔ ٹینک، گیس، ہوائی جہاز، دور مار مشین گنیں اور توپ خانے کی ایجادات ہوئیں۔ پراپیگنڈے کا ہتھیار بھی بھرپور انداز

سے استعمال کیا گیا۔ جبکہ نئے نئے داؤ پیچ بھی آزمائے گئے۔

جنگ نے بہت سے فکری اثرات بھی مرتب کیے سفارت کاری کی اہمیت اجاگر کی جبکہ بادشاہتوں سے جمہوریتوں کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان کو تقویت دی۔ علاوہ ازیں کمیونزم، سوشلزم اور فاشزم بھی جنگِ عظیم اول کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افکار و نظریات ہیں جنہوں نے مستقبل کی دنیا میں بہت دوررس اثرات مرتب کیے۔

مختصراً یہ کہ جنگِ عظیم اول تاریخی اعتبار سے انتہائی اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے اس کے اقوامِ عالم پر بالخصوص اور یورپ پر بالعموم گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ معاشی، معاشرتی، سیاسی، فوجی اور فکری لحاظ سے جنگِ عظیم اول کے نقوش بہت گہرے اور واضح تھے جنہوں نے مستقبل میں بہت اہم رجحانات اور ترجیحات کا تعین کیا۔
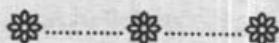
12

اقوامِ عالم کی ترجیحات

اقوامِ عالم جنگِ عظیم کے اسباب، تباہ کاریوں، نتائج اور اثرات کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ یہ تاریخِ عالم کی پہلی سب سے زیادہ تباہ کن اور خونریز جنگ تھی۔ لہٰذا اِس کے اقوامِ عالم پر اثرات بھی اسی قدر گہرے اور ان مٹ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ تباہ کاریوں کے لحاظ سے جنگِ عظیم دوئم، اوّل پر بہر حال سبقت رکھتی ہے۔ مگر یہ بھی امرِ واقع ہے کہ جنگِ عظیم دوئم کے وقت اقوامِ عالم اسی جیسی جنگِ عظیم اول کے تجربے سے گزر چکی تھیں۔

جبکہ پہلی جنگِ عظیم سے قبل اِس قدر بڑے پیمانے پر تباہی کی کوئی مثال موجود نہ ہونے پر انسانی ذہن اس قدر تباہی، بربادی اور خونریزی دیکھ کر ماؤف ہو چکا تھا۔ دنیا بھر ورطۂ حیرت میں گرفتار کھلے منہ حالات و واقعات دیکھے جا رہی تھی۔ خوف، دہشت، ڈر اور وحشت کے باعث ہر کوئی گنگ ہو چکا تھا۔

جب ذرا ہوش آیا تو دیکھا کہ حالات بدل چکے تھے۔ ہرے بھرے کھیت کھنڈر بن چکے تھے۔ انسانی خون کی ارزانی سے زمین سرخ ہو چکی تھی۔ ہنستے بستے شہر اجڑ چکے تھے۔ باقی ماندہ بسنے اور بچ رہنے والے شہروں میں اپاہج اور مفلوج انسان نظر آ رہے تھے۔ یتیموں اور بیواؤں کی آہ و بکا

نے دل دہلا رکھے تھے۔

بس اسی پر موقوف نہ تھا۔ بلکہ جنگ تو اپنی تباہ کاریوں کی بساط لپیٹ چکی تھی۔ بعد از جنگ امن بھی ایک دشوار ترین اور کٹھن مرحلہ تھا۔ بچ جانے والوں کے لیے بھوک اور افلاس اپنے کشادہ بازو پھیلائے آغوش میں بھرنے کے لیے بے تاب تھے۔ زخمیوں کی بہت بڑی تعداد کے لیے مناسب ادویات اور ڈاکٹر میسر نہ تھے۔ کئی سالوں کی مسلسل گولہ باری اور آتش فشانی کے باعث بہت بڑے پیمانے پر وبائی امراض پھیل رہی تھیں۔

اِن سب پر ممالک کے آپس کے قضیے، باہمی منافرتیں، خود غرضی، بے یقینی اور عدمِ تحفظ نے بچی کھچی انسانیت کی حالتِ زار کو مزید قابلِ رحم بنا دیا تھا۔ گولہ بارود، رائفل اور جہازوں کی جنگ کے ختم ہو جانے کے باوجود سیاسی، معاشی، اقتصادی، لسانی، نسلی، قومی اور علاقائی جنگیں اپنے اپنے محاذوں پر بڑے زور و شور سے جاری تھیں۔ غرض انسانیت کو کہیں کوئی امان میسر نہ تھی۔

آہستہ آہستہ یتیموں اور بیواؤں، زخمیوں اور اپاہجوں کو روز مرہ کی بتدریج بڑھتی ہوئی مشکلات نے ماضی سے نکال کر حال کا سامنا کرنے کے لیے سینہ سپر کر دیا۔ زندگی بذاتِ خود سب سے مشکل اور کٹھن امتحان ہوتا ہے۔ اپنے پیاروں کے ساتھ کوئی بھی شخص مرا نہیں کرتا۔ چند دن تک زخم ہرے رہتے ہیں اور بعد میں مندمل ہو جاتے ہیں۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہوا کرتا ہے۔ اور یہی وقت اور اس کی کٹھنائیاں بے دست و پا، مجبور و مقہور انسانوں کو اپنے پیٹ کے ایندھن کی فراہمی کے لیے مجبور کر دیتے ہیں۔

بظاہر تمام اقوامِ عالم ایک بار پھر زندگی کے میلے میں شامل ہو چکی تھیں۔ مگر جنگِ عظیم نے اُن کی سوچ اور اندازِ فکر پر واضح اثرات مرتب کیے تھے۔ جس کے زیرِ اثر اُن کی ترجیحات بہت بدل چکی تھیں۔ جنگ نے جہاں زمین و مکاں پر اپنے اثرات مرتب کیے تھے وہیں انسانی سوچ اور ترجیحات کا رخ بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔

معاشی، معاشرتی اور سیاسی ترجیحات

معیشت ہماری زندگی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ معاشی آسودگی ہر انسانی کی

خواہش ہوتی ہے۔ صنعتی ترقی نے معیارِ زندگی بہتر بنانے کی بنیادیں فراہم کردی تھیں۔ جبکہ جنگِ عظیم نے زندگی کو مشکل ترین بنانے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ روز افزوں ایجادات کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انسانوں کا ایک طبقہ انسانی بقا کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا سہارا لے رہا تھا۔ جبکہ دوسرا اور نسبتاً بہت بڑا گروہ انہی ایجادات کو انسانوں کے خاتمے کے لیے بروئے کار لانے کے درپے تھا۔

صنعت و حرفت پر ایک بار بھرپور توجہ دی جانے لگی تھی۔ جنگ کے باعث بہت زیادہ پیچھے رہ جانے اور تباہ حال ممالک کو احساس ہو گیا تھا کہ اقوامِ عالم میں پھر سے سر اٹھا کر کھڑا ہونے کے لیے معاشی ترقی از بس ضروری ہے۔ معاشی استحکام کی وجہ سے ہی دنیا میں قدر و منزلت پائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے معاشی ترجیحات کا تعین شروع کر دیا۔

رائج معاشی و اقتصادی نظاموں سے بیزاری

جنگِ عظیم اوّل سے قبل رائج معاشی نظام عرصہ دراز سے قائم بادشاہتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ترتیب دیے گئے تھے۔ چند افراد کو نوازنے اور دیگر کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے ہی بادشاہت کا کاروبار چلتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہی نظام کے مطابق چلائے جانے والے ممالک (سوائے جرمنی کے) میں صنعتی ترقی نام کو ہی تھی۔ عوام الناس کو بیل بکریوں کی طرح بیگار لینے کے بعد بہت تھوڑا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ مزدوروں سے دن رات کام لیا جاتا تھا۔

زرعی زمینوں کی ملکیت کسی جاگیردار یا زمیندار کو تفویض شدہ ہوتی تھی۔ جبکہ سخت گرمیوں میں ہل چلا چلا کر شاداب کھیتوں کو اُگانے والا کسان بمشکل تمام دو وقت کی روٹی کا حق دار ٹھہرتا تھا۔ مستزاد یہ کہ آسمانی آفات و بلیات کی صورت میں نقصان کی تلافی بھی اسی بے چارے سے کی جاتی تھی۔

بیشتر ممالک میں فوجی اور سرکاری عہدوں کے لیے بھرتی کا سخت ترین نظام رائج تھا جس کے تحت بہت بڑی آبادی کو محروم رکھا جاتا تھا۔ صنعتوں کا قیام مخصوص علاقوں میں مخصوص لوگوں کے لیے کیا جاتا تھا۔ جہاں کام کرنے والے مزدوروں سے دن رات سخت مشقت لی جاتی تھی اور اِس کے عوض بہت معمولی اجرت ادا کی جاتی تھی۔ غرض ایک طبقہ نہایت ٹھاٹ باٹ سے

زندگی بسر کر رہا تھا جبکہ باقی آبادی اُس ایک طبقے کی خدمت و خاطر مدارات میں ہمہ تن مصروف رہنے پر مجبور تھی۔

جنگ نے پسنے والی عوام کو اُن کی عزتِ نفس اور وجود کا احساس دِلایا۔ انہیں جاگیردارانہ، اور مالکانہ معاشی نظاموں سے سخت بیزار کر دیا تھا۔ اسی بیزاری اور بیداری کا اثر تھا کہ مزدوروں نے حقِ حکومت اور اپنے دیگر حقوق طلب کرنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے مطالبات آئے روز بڑھنے لگے تھے۔ اور معاملہ صرف مطالبات تک ہی محدود نہ رہا بلکہ اپنے حق کے حصول کے لیے درمیانی طبقے نے مسلح جدوجہد شروع کر دی تھی۔

روس میں شاہ پرستوں کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور انہیں مسلح جدوجہد کے بعد بے دخل کر دیا گیا۔ بعد از جنگ اشتراکی (سوشلسٹ) نظام کا بہت زیادہ چرچا ہوا۔ اور معاشی ترقی کے لیے جدوجہد کی جانے لگی۔ غیر صنعتی ممالک میں صنعتوں کے قیام کو فروغ حاصل ہوا۔ بیرونِ یورپ ممالک جو جنگ کے دوران اور فوراً بعد اِس کی نیم مردہ معاشی حالت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی معیشت کو فروغ دے چکے تھے اب اس معاشی ترقی کی شرح کو برقرار رکھنے کے لیے سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے۔

نئے معاشی و اقتصادی نظام کی تلاش

جنگ نے یورپی ممالک کی معاشی اور اقتصادی حالت تباہ کر کے رکھ دی تھی۔ روس، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، لتھوانیا، لٹویہ، اسٹونیا، فن لینڈ، یوکرائن، بلغاریہ، رومانیہ، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی، پرتگال، بیلجیم، برطانیہ اور افریقی نوآبادیات سب ہی معاشی بدحالی، فاقہ کشی، غربت و افلاس اور صنعتی تباہ حالی کا شکار ہو چکے تھے۔ اِن ممالک کے معاشی استحصال نے پوری دنیا میں معاشی عدم استحکام کو جنم دیا تھا۔

ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے کے لیے لٹے پھٹے اور پسماندگی کی انتہاء تک پہنچ جانے والے ممالک جنگ کی شکست و ریخت کے باعث سیاسی، نفسیاتی، معاشی اور نظریاتی معاملات میں بھی بری طرح شکست خوردہ اور مفلوک الحالی کا شکار تھے۔ انہیں کسی نئے اور سبق رفتار نظام کی ضرورت تھی جو اُن کی بھوک اور افلاس کو فوری طور پر ختم کر سکے۔

صنعتوں اور پیداواری اداروں کی بندش، تعطل یا ذرائع پیداوار کی کمی کے باعث تاخیر نے بین الاقوامی سطح پر بیروزگاری کے بہت بڑے مسئلے کو جنم دیا۔ جس سے اُس وقت کی سیاسی قوتیں اور نظام بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مہنگائی، صنعتی اشیاء کی قلت، بے روزگاری، افراطِ زر، خام مال کی کمی، اخراجات اور آمدن کا بڑھتا ہوا فرق، قرضوں کی وصولی اور ادائیگی کا عدم توازن اور زرعی پسماندگی جیسے اہم معاملات عوامی بے چینی اور بے زاری کا باعث بن رہے تھے۔

معاشی عدمِ استحکام نے سیاسی جماعتوں پر اثر انداز ہوتے ہوئے انہیں حکومتوں پر قومی نوعیت کی پالیسیوں کے مرتب کرنے پر مجبور کیا۔ امریکی آزاد سرمایہ دارانہ نظام پر سخت تنقید اور نکتہ چینی کی گئی۔ جرمنی، سپین اور رومانیہ جیسے ممالک میں بزورِ شمشیر آزاد سرمایہ دارانہ نظام کی بیخ کنی اور قومی خود انحصاری کی اقتصادی حکمتِ عملیاں وضع کی جانے لگیں۔

ایسی صورتِ حال میں امریکہ اپنے مقروض ممالک پر سیاسی اور سفارتی دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ جمہوری طرز کی اقتصادی پالیسی جس کے مطابق آزادانہ سرمایہ کاری کو فروغ ملے طوہاً و کرہاً اختیار کریں۔ وہ اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانے پر توجہ دیں اور اپنے ہمسایہ ممالک کو کنگال کرنے کے رویے کو اختیار کریں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور فرانس کافی مقدار میں سونا ہونے کے باوجود اپنے پڑوسی ممالک کو اپنے قرضے معاف کرنا تو درکنار بڑھتی ہوئی شرح سود کے مطابق ادا کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

اس وقت دنیا کا نظام کئی اقتصادی گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک اسٹرلنگ بلاک تھا۔ دوسری طرف طلائی طرزِ مبادلہ رائج تھا۔ کہیں ین میں بین الاقوامی تجارت ہو رہی تھی۔ تو امریکہ سے متاثرہ ریاستوں میں ڈالر ہی تجارت کے لیے مقبول کرنسی تھی۔ روس سوشلزم کے رجحان پر گامزن تھا۔ جرمنی خود کفالت کے نظریے پر عمل پیرا تھا۔

اِس مختلف الجہات صورتِ حال نے عوام، سیاسی اور حکومتی ذرائع کو اِس امر پر مجبور کیا کہ وہ اپنے مستقبل کو بچانے اور حال کی کٹھنائیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے علاقائی، جغرافیائی، نظریاتی اور سیاسی مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عوامی رائے اور رجحان کے مطابق اپنی معاشی اور اقتصادی پالیسیوں کا تعین کریں۔

یہی رجحان تھا کہ جس نے اقوامِ عالم کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ پہلے سے موجود نظریات و اصول وغیرہ کو پرکھنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے معاشی و اقتصادی قوانین و اصول تخلیق کریں اور انہیں روبہ عمل لائیں۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک کڑی روس میں بالشویکی انقلاب بھی تھا۔ جو کارلائل مارکس کے معاشی نظریے پر استوار کیا گیا تھا۔

یہ بھی امرِ مسلمہ ہے کہ روسی کمیونزم مارکسی کمیونزم سے مختلف تھا۔ اِس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی اصول روبہ عمل لایا جاتا ہے تو اِس کی جزئیات وکلیات حالات و معاشرے کے مطابق کسی قدر تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح لینن نے بھی دوعملی کا نظام رائج کیا۔ یہ سب روسی درمیانی اور نچلے درجے کی جنگ کے باعث کسمپرسی اور افلاس کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے سے رائج نظام کے خلاف مسلح ہو کر بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

دوسری طرف جرمنی میں نازی سوشلزم بھی اسی جنگ کے اثرات و نتائج کا ساختشانہ تھا۔ موسولینی کا فاشزم بھی اسی معاشی عمل کا ایک ردِعمل تھا جس نے ایک معاشی اقتصادی انداز کا سیاسی نظام متعارف کروایا۔ ادھر جموریت پسند عناصر آزاد سرمایہ داری کے نظام کے فروغ کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔

ترقی کے لیے بھرپور کوششیں

بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ تمام ممالک کے ترقی کے سفر میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے عشرے کی تباہ کاریوں نے حکمتوں اور عوام کو یکسر بری طرح متاثر کیا تھا۔ اور اب امن کے حصول کے بعد ہر ملک قبل از جنگ ترقی کی سطح کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ ہر جگہ معاشی اصلاحات کرنے کا رجحان عام تھا۔

مگر یہ ترقی کا سفر اِس قدر آسان نہ تھا۔ یورپی ممالک عالمی ترقی میں بہت پیش پیش رہتے تھے۔ شومیِ تقدیر جنگ کی تباہ کاریاں بھی انہیں پر نازل ہوئیں اور وہ پسماندہ زین علاقے کی سی حالت کو پہنچ گئے۔ مگر چونکہ وہ عروج دیکھ چکے تھے۔ عالمی قیادت و سیادت کی منازل طے کرتے رہے تھے۔ لہٰذا اب وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہتے تھے جبکہ جنگی رقابت اور باہمی عناد بھی اپنی جگہ قائم و دائم تھے۔

افرادی قوت میں کمی، سیاسی عدمِ استحکام، بھوک افلاس، معذوری، صنعتوں کی تباہی اور بے روزگاری کے چیلنجز کے ساتھ ساتھ شکست خوردہ ممالک کے لیے تاوانِ جنگ اور فتحیاب ممالک کے لیے بیرونی قرضے افریت کی طرح ترقی کی راہ میں حائل تھے۔ اور اِن رکاوٹوں سے بخیر وخوبی نمٹنے کے بعد ہی ان ممالک کے لیے ممکن تھا کہ ترقی کا زینہ چڑھنا شروع کریں۔

ان مسائل کے حل کے لیے تخفیفِ زر، قرضوں کا بے مہابہ حصول، نئی صنعتوں کے قیام، زرعی تنظیم، خود کفالت، نئی منڈیوں کی تلاش اور وسیع پیمانے پر پیداواری صلاحیت کے حصول کے لیے مؤثر اقدامات کیے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ 1928ء تک معاشی لحاظ سے اپنے کھوئے ہوئے مقام کو پا چکا تھا۔

ایک بار ترقی کی جانب گامزن ہونے اور اس کے ابتدائی ثمرات پالینے کے بعد تمام ممالک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ اِس مسابقانہ پالیسی نے جہاں ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے رجحان کو جنم دیا وہیں ترقی کے لیے ہر چیز کے معیار میں بھی بہتری پیدا کی۔ مقابلے کی فضا میں صنعتوں، زراعت اور دیگر مصنوعات کے معیار اور افادے میں بہتری لائی جانے لگی۔

معاشرتی اقدار کے قیام کی کوششیں

تیسرے عشرے میں حکمرانی کے انداز میں بہت حد تک تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ جنگِ عظیم نے بیشتر ممالک کے آمرانہ حکمرانوں کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ناانصافی، حق تلفی اور زیادتیوں کا سامنا کرنے والے عوام میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جو عوامی رائے کی اہمیت اور فلاح و بہبود کا برملا اظہار کرنے لگے تھے۔

اِس طرح کی کاوشوں نے عوامی بیداری کو جنم دیا۔ معاشرتی اقدار قائم کرنے کے لیے کوششیں کی جانے لگیں۔ کسانوں، مزدوروں، حکومتی اداروں کے ملازموں اور سرمایہ داروں کے حقوق کے تحفظ کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ عوام کو ان کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا اور انہوں نے اپنے عوامی حقوق کے استعمال کے لیے باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی تھی۔

سیاسی زعما یہ جان چکے تھے کہ عوام اپنی دی گئی قربانیوں کا معاوضہ بھی چاہتے ہیں اور

اِس مقصد کے لیے آواز بھی اُٹھانے لگے ہیں۔ اِس طرح معاشرہ مجموعی طور پر متحرک ہو چکا تھا۔ معاشی معاشرتی اور سیاسی ترقی کے لیے عوام میں عدل و انصاف، معاشرتی مساوات اور احساسِ تحفظ کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرزِ فکر نے معاشرتی اصلاحات کے رجحان کو فروغ دیا۔

نئے سیاسی نظریات

قدیم زمانے سے سیاست دانوں کے لیے اقتصادی اور معاشی معاملات مشکلات پیدا کرتے رہے تھے۔ جنگ سے قبل کے سیاسی اور سفارتی انداز جنگ کے بعد کے طریقہ کار سے یکسر مختلف اور مشکل ترین تھے۔ قبل از جنگ ملکی سیاست پر بادشاہت اور اُس کے حواریوں کی بالادستی قائم رہتی تھی۔ وہی ملکوں کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور سفارتی معاملات حل کرنے میں مختارِ کل تھے۔

جبکہ جنگ کے بعد یکسر صورتِ حال بدل چکی تھی۔ اب ملکی معاملات سیاست، معیشت اور سفارت پر عوامی اثر و رسوخ اور رائے کا تقدم تھا۔ یہ سب کچھ یورپی اتحادیوں کے نہ چاہنے کے باوجود اُن ہی کے اقدامات سے ہوا تھا۔ دورانِ جنگ وہ مسلسل یہ پراپیگنڈہ کرتے رہے تھے کہ وہ جنگِ عظیم جمہوریت اور قومی اعزاز کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ایک ایسے نظام کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو عوامی رائے کے بے باکانہ اظہار کو فروغ دے گا۔

اِس طرح کے پراپیگنڈے نے ہی عوام کو اِس امر پر راغب کیا کہ وہ اپنی حکومتوں کو غربت، افلاس اور بھوک و ننگ کے باوجود جنگ جاری رکھنے پر رکاوٹ نہ ڈالیں اور اپنی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں۔ اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اور انہی حکمرانوں کو عوامی رائے کے استوار کرنے کی ضرورت باقی نہ رہ گئی تھی۔ تو اب کلیمنشو اور لائیڈ جارج مکمل فتح کی ضرورت پر زور دے رہے تھے۔

اسی سوچ نے موسولینی کی فسطائیت (فاشزم) اور جرمن نازی اشتراکیت (سوشلزم) کو جنم دیا۔ بولشویکی انقلاب کی بنیاد بھی یہی سوچ تھی اور بادشاہتوں کی بے دخلی کے عمل میں بھی اسی طرزِ فکر کا گہرا عمل دخل تھا۔ چند ممالک کے اصحابِ اقتدار عوامی امنگوں پر اپنی بساطِ سیاست بچھائے بظاہر نظاموں کی تبدیلی کا نعرہ لگا کر دراصل وہی فرسودہ اور پسماندہ سیاسی نظام معمولی

تبدیلیوں اور نئے ناموں سے متعارف کروا رہے تھے۔

اِن تمام نظاموں کا محور اور مرکز صرف اور صرف اپنی بالادستی، گروہ بندی اور دیرپا قیامِ اقتدار تھا۔ اپنے مفادات سے متصادم کسی بھی ملک کے خلاف جنگی اقدامات کرنے کے لیے کوئی خوبصورت عوامی منفعت کا نعرہ لگا کر یا نئے سیاسی نظام کی دِل ربا دلفریبیوں کا چھمہ دیتے ہوئے بھولے بھالے عوام کی قوت کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا جانا مقصود تھا۔ اور اِس گھناؤنے کھیل کو ہی نئے سیاسی نظاموں کی طرح متعارف کروایا جا رہا تھا۔

فوجی ترجیحات

جنگِ عظیم نے جہاں اقوامِ عالم کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی ترجیحات کا رخ بدل کر رکھ دیا تھا وہیں فوجی ترجیحات میں تبدیلی کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی۔ اِس عظیم جنگ سے قبل انسانی تاریخ میں کوئی بھی اتنی طویل اور بڑے پیمانے کی جنگ نہ لڑی گئی تھی۔ جس میں اس قدر افراد، اسلحہ، جنگی ساز و سامان صرف کیا گیا ہو۔

نہ ہی کوئی ایسی جنگ لڑی گئی جو اِس قدر محاذوں پر مشتمل ہو۔ جہاں ہر محاذ کی ایک اپنی نوعیت اور اہمیت ہو۔ ہر محاذ پر ایک الگ اندازِ جنگ، مختلف طریقِ دفاع و جارحیت، جداگانہ طرزِ حکمتِ عملی اور اسلحہ کا اچھوتے انداز سے استعمال وغیرہ دیکھنے کو ملا ہو۔ منصوبہ سازی، برق رفتاری اور ذرائع مواصلات و رسل و ترسیل کے جال بننے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ یہ جنگ اپنی وسعت، دائرہ کار، پھیلاؤ، جہات، اندازِ حرب و ضرب اور جدت و سرعت کے باعث فوجی ترجیحات کے رخ کا تعین کرنے میں اپنی مثال آپ رکھتی ہے۔ اس سے بعد کی جنگوں کی حکمتِ عملی، منصوبہ سازی اور اندازِ جنگ سب کے سب اسی جنگ کی فوجی ترجیحات کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں کا مرکب تھے۔

نئی فوجی جہات

جنگِ عظیم کی بابت عوام الناس کا یہی تاثر تھا کہ یہ موت، تباہی، بربادی اور خوف

وہراس، افلاس وغربت، معذوری اور آبادی میں تخفیف کے لیے لڑی گئی ہے۔ اگر اِس جنگ کی کوئی وجہ تھی تو وہ سعیِ لاحاصل تھی۔ جس کے لیے بہت زیادہ قربانیاں دی گئیں۔ تاہم ایک خاص طبقے کی رائے اِس سے بہت مختلف تھی۔

یہ طبقہ اِس جنگ کے مثبت پہلو تلاش کر رہا تھا۔ اُن کے نزدیک فوجی اقدار، اولوالعزمی، حربی جوش وخروش، نظم وضبط، قومی وقار اِس جنگ سے جڑی وہ ناقابلِ تردید حقیقتیں ہیں جو رہتی دنیا تک نہ صرف یاد رکھی جائیں گی بلکہ اِن کے طے کردہ معیار آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہوں گے۔ جدوجہد، طاقت اور ہیروازم زندگی کی اہم ترین خصوصیات کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں اور جنگِ عظیم جیسے مواقع ہی اِس طرح کی خصوصیات کے اظہار کے مواقع فراہم کرسکتے ہیں۔

اِن مختلف خیالات کے باوجود جنگِ عظیم کو فوجی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اِس جنگ میں نئی فوجی جہات کا تعین کیا گیا۔ انسانوں کے مشینوں پر انحصار کی مثال اِس جنگ سے قبل کہیں نہیں ملتی۔ جدید اسلحہ کی ضرورت وایجاد، صرف افواج کی تعداد ہی نہیں. بلکہ جدید اسلحہ کی ضرورت، جنگ کے لیے صنعتی، زرعی، معاشی واقتصادی ترقی، مستحکم سیاسی ومعاشرتی نظام، کامیاب سفارت کاری اور تجارتی رابطوں کی موجودگی، فعال ذرائع مواصلات ورسل وترسیل اور برق رفتاری ایسے عناصر وعوامل ہیں جو نئے فوجی نظام کے لیے انتہائی ضروری اور اہم قرار دیے گئے۔

ٹینکوں کی ایجاد اور استعمال میں بہتری، فضائیہ کا فعال اور مؤثر استعمال، بحری میدانوں میں لڑائی کے نئے نئے انداز وہتھیار، خندقوں میں دفاع اور جارحیت، گیس کے ہتھیار کا استعمال، نئے نئے اور تباہ کن گولوں اور بارود کی ایجاد، دور مار گنوں کا تعارف، گوریلا جنگ وغیرہ سب کی سب اسی جنگ کی فوجی جہات تھیں۔

دوسری جنگِ عظیم میں ایٹم بم کے سوا کوئی بھی ایسا اسلحہ، گولہ یا بم وغیرہ استعمال نہیں کیا گیا جو پہلی جنگِ عظیم میں استعمال نہ ہوا ہو۔ جبکہ ایٹم بم کی ایجاد کے پیچھے محرکات کا جائزہ لینے پر بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ وہ جنگِ عظیم سے متاثرہ سوچ نے ہی ایجاد و استعمال کیا تھا۔

لوازمِ جنگ کی ازسرِ نو تنظیم

فوجی جہات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ جنگِ عظیم نے حکام وقیادت کے منصب پر

فائز اصحاب کو یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا کہ جنگ لڑنے اور فتح یاب ہونے کے لیے قبل ازیں قائم شدہ لوازمِ جنگ کی از سرِ نو تنظیم کی جائے۔ کیونکہ جنگِ عظیم کے دوران گزشتہ جنگوں کے لیے طے شدہ ضروریات ولوازم بری طرح ناکام ہو چکے تھے۔

جنگِ عظیم جدید طرزِ جنگ کی طرف ایک اہم اور بنیادی قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس جنگ نے احساس دلایا کہ صرف بڑی فوج اور اسلحہ ہی جنگ میں فتح یاب ہونے کے لیے ضروری نہیں۔ اِس کے لیے معاشی استحکام، پائیدار زرعی نظام، مضبوط سیاسی صورتِ حال، جذبہ حب الوطنی، اولوالعزمی، قومی یکجہتی، نظریاتی اتفاقِ رائے، کامیاب سفارتی تعلقات، محفوظ اور مستحکم تجارتی جال، ذرائع رسل و ترسیل، پراپیگنڈا، زیرک منصوبہ سازی، جنگی تدابیر اور مواصلاتی نیٹ ورک اپنی اپنی جگہ انتہائی اہم اور فتح کے لیے ضروری عوامل ہیں۔

کسی بھی بڑی سے بڑی فوج کے لیے فتح کا حصول اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ مذکورہ بالا عوامل اور لوازمِ جنگ سے مسلح و مرجع نہ ہو۔ کیونکہ اب جنگ صرف ایک میدانِ جنگ میں نہیں لڑی جا رہی جہاں ایک شخص دوسرے کو ہلاک کر کے اُس کی جگہ اور سامان پر قابض ہو سکتا تھا بلکہ اب مختلف قومیں باہمی مفادات کے لیے مشترکہ دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو رہی تھیں۔

فکری ترجیحات

اقوامِ عالم کی سوچ اور فکر جنگِ عظیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ اسی اثر کے نتائج تھے کہ اقوامِ عالم نے جنگ کے فوراً بعد فکری ترجیحات قائم کیں اور اِس کے مطابق عمل درآمد شروع کر دیا۔ شریکِ جنگ اقوام میں جذبہ حب الوطنی اور نسلی تفاخر مزید جاگزیں ہو گیا اور وہ اپنے ملک و قوم کے لیے نئے فکری اور نظریاتی نظام رائج کرنے کے درپے ہو گئیں۔

جرمنی اپنی لٹی پھٹی حالتِ زار پر اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا اور اتحادی ممالک سے اپنے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا بدلہ لینے کے لیے ذہنی، اور جسمانی طور پر تیاری کرنے لگا تھا۔ اِس کا اظہار 1925ء کے بعد سے واضح انداز سے ہونے لگا تھا۔ دوسری جانب فرانس جرمنی کے ایک بار پھر اُٹھ کھڑے ہونے کے ڈر سے مسلسل اپنی فوج میں اضافہ اور قلعہ بندیوں کی مضبوطی میں

مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ جرمنی پر اپنا سیاسی، معاشی اور فوجی دباؤ بڑھائے چلا جا رہا تھا تاکہ گرا ہوا جرمنی پھر سے اپنے قدموں پر کھڑا ہی نہ ہو سکے۔

امریکہ اور برطانیہ نے کچھ مدت کے لیے اپنے اندرونی خلفشاروں کی جانب توجہ مبذول کر لی تھی اور وہ ابھی یورپ پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اٹلی فتح کے باوجود قرضوں کے بے تحاشا بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اور اتحادی بندر بانٹ سے قطعاً مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے وہاں موسولینی کی فکری اصلاحات کو بڑی پذیرائی ملی جن کو محور و مرکز ریاست تھی جس کی فلاح و بہبود کے لیے انسان، معیشت، سیاست، تعلیم اور دیگر تمام لوازمات تھے۔

روس بالشویکی نظام کے تحت باہمی امن و امن کے قیام کا بظاہر خواہاں نظر آ رہا تھا۔ تاہم یہ امر واقع ہے کہ روسی لینن کے دھمکی آمیز انداز ہمسایہ ممالک کے لیے ہر وقت خطرے کی گھنٹیاں بجاتے رہتے تھے۔ نازی ہٹلر کے سوشلسٹ افکار کو جرمنوں میں بڑی پذیرائی ملی۔ اور اُس کی پارٹی اکثریت سے کامیابیاں حاصل کرنے لگی۔

جمہوریت اور آزاد سرمایہ داری کے علم بردار بھی اپنی فکری اصلاحات کے نفاذ کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس دور میں امریکہ جمہوریتوں کے قیام اور آزاد سرمایہ داری کا سب سے بڑا حمایتی اور خواہاں تھا۔ یہ اپنی فکری ترجیحات کے قیام اور دوام کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کر رہا تھا۔

فکری بیداری

اقوامِ یورپ اور بیرونِ یورپ تیسری دنیا کے ممالک کی عوام میں فکری بیداری کا عمل بھی جنگِ عظیم کا سب سے اہم نتیجہ تھا۔ نو آبادیاتی علاقوں سے اتحادی مالی اور جانی ہر دو طرح کے تعاون کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جس کے جواب میں نو آبادیات سے ہر ممکن امداد و اعانت کی گئی مگر اِن قربانیوں کے جواب میں جب انہیں کچھ نہ ملا تو انہیں عالمی منظر پر خوبصورت لفاظی اور دلفریب نعروں کی کھوکھلی اور بے جان حیثیت کا علم ہو گیا۔ جس نے انہیں آزادی کے لیے کوششیں کرنے کی طرف راغب کیا۔

قومی خود مختاری اور جمہوریت کے وہ اصول جو اتحادیوں کی جانب سے ایک مسلسل جاپ کی طرح الاپے جا رہے تھے، خود انکے زیرِ تسلط نو آبادیاتی ممالک میں اس نعرے کی کھلی دھجیاں

بکھیری جارہی تھیں۔ جلیانوالہ باغ میں خود مختاری اور جمہوریت پسندوں پر انھی جمہوریت جمہوریت کا ورد کرتے نہ تھکنے والوں پر فائرنگ کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔

اتحادی ممالک کے سربراہان اپنے اپنے مفادات کو عملی جامہ پہنانے اور اپنے عیبوں کو خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر چھپانے کے لیے بین الاقوامی مجلسِ اقوام (لیگ آف نیشنز) کے سانچے کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے۔ اسی وقت افریقی ممالک کے مطالبات کے اظہار کے لیے پیرس میں کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ مصر میں فواد پارٹی قائم کی جارہی تھی۔ چین میں "مے فورتھ تحریک" فعال ہو چکی تھی۔

ہندوستان میں مسلم لیگ اور کانگریس آزادی کے حصول کے لیے کوشاں تھیں۔ انڈونیشیاء میں شرکت الاسلام پارٹی اپنی ممبرشپ 25 لاکھ تک بڑھا چکی تھی۔ تیونس میں دستور پارٹی ایک بار پھر منظم ہو رہی تھی۔ کچھ ہی عرصہ بعد چین میں بھی بیداری کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ جبکہ جاپان ایک عرصے سے مشرقی ایشیاء میں باہمی خوشحالی کے ایک خطے کی ضرورت پر زور دے رہا تھا۔

احساسِ عدمِ تحفظ

ان تمام فکری بیداریوں کی وجہ عالمی طور پر ایک احساسِ عدمِ تحفظ تھا۔ جنگ کے شعلوں نے شریکِ جنگ ممالک کو جہاں جھلسا دیا تھا وہیں بیرونی دنیا کو اِس کی تمازت اور اثرات سے مزین کر دیا تھا۔ انہیں بڑی طاقتوں کے منافقانہ رویے، خود غرضانہ سوچ اور مفادی سیاست کی سمجھ آنے لگی تھی۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی یہ بڑے ممالک اپنے مفادات، اغراض اور خواہشات کے حصول کے لیے تیسری دنیا کے عوام اور اُن کے استحقاق کو بے دریغ استعمال کرتے آئے ہیں اور دورانِ جنگ بلاوجہ اور بلا دریغ اُن کی جانی قربانیاں بھی جبراً لینے کا رواج عام رہا۔ جس نے تیسری دنیا کے نوآبادی ممالک میں احساسِ عدمِ تحفظ کو جنم دیا۔ یہی احساسِ عدمِ تحفظ یورپی اقوام سے بے زاری اور تنفر کا باعث بنا۔

احساسِ عدمِ تحفظ صرف تیسری دنیا کے عوام میں ہی نہیں محسوس کیا گیا۔ بلکہ جنگ کی بھٹی میں جھلسنے والے یورپی ممالک کی عوام بھی شدید ذہنی، اعصابی، جسمانی، روحانی اور نفسیاتی

احساسِ عدمِ تحفظ کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے اکثریت جنگ سے بیزار، حکمرانوں کی مخالفت سے نالاں اور سیاسی وفکری نظاموں سے اظہارِ ناپسندیدگی کرنے میں کسی تامل کا شکار نہ تھے۔

تلخیص

جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں نے عالمِ انسانیت پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ درماندہ انسانیت امن وامان اور تحفظِ آدمیت کی متلاشی تھی جبکہ حکمران اپنی ملک گیری اور اقتدار کی ہوس کے لیے انسانیت کا قتلِ عام کرنے میں لطف محسوس کر رہے تھے۔ اُن کی انسانی خون کی تشنگی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔

دوسری جانب عالمی ترجیحات میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ عوام الناس اپنے معاشی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی طرزِ زندگی سے تنگ آ چکے تھے اور اِن میں تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اسی تبدیلی کی سوچ نے بہت سے معاشی واقتصادی نظام جنم دیے۔ جن پر عمل پیرا ہو کر مستقبل کے عالمی منظرنامے میں تبدیلیاں اور اکھاڑ پچھاڑ دیکھنے کو ملی۔

معاشی ومعاشرتی ترجیحات میں عوامی رائے کی اہمیت محسوس کی گئی۔ اقتصادی ترقی اور صنعتی استحکام کے ساتھ ساتھ زرعی افزائش کو معاشی حکمتِ عملی میں بنیادی حیثیت دی جانے لگی۔ دنیا میں مختلف قسم کے معاشی نظام زیرِ عمل لائے گئے۔ کہیں پاؤنڈ کو ذریعہ مبادلہ تسلیم کیا گیا تو کہیں ڈالر کو بطور کرنسی استعمال کیا جانے لگا۔ کچھ ممالک نے طلائی نظامِ مبادلہ کو اختیار کر لیا تھا۔

غرض طرح طرح کے معاشی سیٹ اپ اور ان پر تجربات عمل میں لائے جا رہے تھے۔ اسی طرح معاشی حکمتِ عملی بھی مختلف ممالک میں مختلف تھی۔ جرمنی، رومانیہ اور سپین میں خودکفالتی حکمتِ عملی وضع کی جارہی تھی۔ امریکی اور برطانوی اثرورسوخ والے ممالک میں آزاد سرمایہ داری کا نظام رائج کر دیا گیا تھا۔ جبکہ روسی طرزِ معیشت سب سے منفرد اور انوکھا تھا

جنگ کے بعد کا دور ہی ترقی کی مثبت سمت میں رفتار کا تعین کر رہا تھا۔ جنگ سے درماندہ ممالک اپنی معاشی واقتصادی بحالی میں مصروفِ عمل نظر آ رہے تھے۔ امریکہ، فرانس اور برطانیہ وغیرہ کی نسبتاً بہتر معاشی وصنعتی حالت کی بدولت خستہ حال معیشت والے ممالک قرضوں کے مطالبے

کیے جا رہے تھے اور اِن کے عوض بھاری سود کی ادائیگی کے معاہدے عمل میں لائے جا رہے تھے۔

معاشرتی بیداری کا عمل بھی جنگ کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ انسانی اقدار اور وقار کی بحالی کے لیے کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ اور پوری دنیا میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ سیاسی نظام بھی عوامی رائے کو مقدم رکھتے ہوئے وضع کیے جانے لگے تھے۔ مگر اسی دوران ایک فطری ردِ عمل بھی سامنے آیا جس کے تحت ریاست اور ملکی اقتدار کو مرکزیت دیتے ہوئے انسانوں کو ان کے لیے قربان کر دینے کے رجحانات بھی چند جگہوں پر دیکھنے کو مل رہے تھے۔

فوجی لحاظ سے تو جنگِ عظیم ایک بنیادی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اِس جنگ نے فوجی طرزِ پالیسی، دفاع، جارحیت، اسلحہ، بارود اور توپ خانہ وغیرہ کی ازسرِ نو تنظیم بندی کرنے کے لیے مواقع پیدا کیے اور ماہرینِ جنگ کی تحقیق کے لیے نئی نئی راہیں فراہم کیں۔ فوجی جہات کا تعین ممکن ہوا۔ اور لوازمِ جنگ کی سابقہ فہرست میں مکمل طور پر تبدیلی کرتے ہوئے نئی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

فکری محاذ بھی جنگِ عظیم کے اثرات اور عوامل سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ پوری دنیا میں عوامی بیداری، آزادانہ زندگی گزارنے کے حق کی طلبی اور احساسِ عدمِ تحفظ کے باعث بے چینی اور بے کلی پائی جا رہی تھی۔ انہیں اثرات اور ترجیحات کا اثر تھا کہ برطانیہ کو اپنی نوآبادیات میں سخت ترین رویہ اختیار کرنا پڑا۔ جس کی سب سے بھیانک اور تکلیف دہ مثال جلیانوالہ باغ (1919ء) میں نہتے لوگوں پر اُن کی اندھا دھند فائرنگ بھی ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد پیدا ہونے والی فکری بیداری کا اثر تھا کہ ہندوستان میں آزادی کے حصول کے لیے کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ انڈونیشیا، تیونس اور چین میں بھی بیداری کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ مصر اور مشرقِ وسطیٰ میں برطانوی سامراج کے خلاف آواز بلند ہو گئی تھی۔ ترکی میں کمال اتاترک پاشا اپنے ملک کی جغرافیائی اور سیاسی سالمیت کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑا تھا۔ جبکہ جاپان ایک عرصے سے ”مشرقی ایشیاء میں باہمی خوشحالی کے ایک خطے“ کی ضرورت پر زور دے رہا تھا۔

حصہ پنجم

نئے عالمی افق

13

کثیر قطبی دنیا

جنگِ عظیم اوّل کے اختتام پر یورپ کی غیر منصفانہ اور غیر فطری تقسیم اور بندر بانٹ کے نتیجے میں یورپ کے مرکزی علاقوں میں مختلف الجہات قسم کی سوچ، فکر اور انتقامی جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ یورپی اقوام مختلف دھڑوں میں بٹ چکیں تھیں۔ جبکہ دیگر دنیا میں بھی ان دھڑوں کے وجود کا احساس ہو رہا تھا۔ معاشی، اقتصادی سیاسی اور فکری اثرات مختلف قوموں اور ممالک پر مختلف انداز سے منعکس ہونے کے باعث کثیر قطبی دنیا کا وجود ممکن ہو گیا تھا۔ جو باہمی عناد، رکابتوں اور منافرتوں کا سیلِ رواں بہانے کے لیے مناسب وقت اور فوجی قوت کا انتظار کر رہا تھا۔

اِس موقعہ پر ہم اِس کثیر قطبی دنیا کی کثیر الجہت حیثیت کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے جنگِ عظیم کے اثرات کے تحت نئے عالمی نظام پر اِس کے نتائج و عوامل کا مختصراً مطالعہ کریں گے تا کہ انسانی تاریخ کے دو عظیم ترین سیاہ دھبوں یعنی جنگِ عظیم اول اور اِس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات جو جنگِ عظیم دوئم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں:

جنگِ عظیم کے خاتمے پر اٹلی فتح یاب ہو جانے کے باوجود غیر مطمئن اور اقتصادی لحاظ سے شدید مشکلات میں گھر ہوا تھا۔ اِن حالات کی وجہ سے اٹلی کی عوام میں مجموعی بے چینی اور بے

اطمینانی کا عنصر غالب تھا۔اسی بے چینی اور بے اطمینانی کے باعث اٹلی میں فاشسٹ تحریک کا آغاز ہوا۔اِس تحریک کے سربراہ موسولینی اپنی سفارت کاری اور بے دھڑک خارجہ پالیسی کی وجہ سے صفِ اول کے ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔

اٹلی اپنی سفارت کاری اور سیاسی تبدیلی کے باعث بین الاقوامی سطح پر اہم ممالک کی فہرست میں شامل ضرور ہوگیا تھا مگر وہاں اقتصادی تنزلی اور معاشی ابتری اِس کی بین الاقوامی پوزیشن کو متاثر بھی کر رہی تھی۔سفارتی میدان میں موسولینی نے بالشیویکی تحریک کی شدید مخالفت کی وجہ سے امریکہ اور برطانیہ کا قرب حاصل کیا۔

اتحادی ممالک کی سرمایہ کاری کے باعث ابتدائی طور پر موسولینی کی قیادت میں اٹلی کے باشندوں نے بڑے جوش وخروش سے جدید کاری کے پروگرام وضع کیے اور ریلوے، بجلی اور الیکٹروکیمیکل کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔طیارہ سازی کا کارخانہ دنیا بھر میں اپنی تیز رفتاری، جدت اور کارکردگی کے لحاظ سے مشہور تھا۔

اِن تمام اقدامات کے باوجود مجموعی طور پر اقتصادی ترقی کی رفتار بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت سے بالکل عاری تھی۔فی کس آمدنی کی شرح برطانیہ اور فرانس کے مقابلے میں انتہائی کم تھی جبکہ شمالی اور جنوبی علاقوں کی فی کس آمدنی کا فرق روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔قومی مجموعی پیداوار میں زراعتی آمدنی 40 فیصد تھی۔

حکومت کی جانب سے زراعت کے فروغ کے لیے شہروں کی طرف نقل مکانی کا سدِ باب کیا گیا۔یہ حکمتِ عملی دیہی علاقوں میں بے روزگاری کی شرح میں اضافے کا موجب بنی۔پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ بھی نہ ہوسکا اور جہالت عام ہوتی چلی گئی۔دوسرا اہم منفی اثر یہ ہوا کہ دیہی علاقوں کے رہنے والوں میں محرومیوں کا احساس بڑھنے لگا۔

اٹلی کے لیے اپنی ساکھ بحال رکھنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔کہ وہ اشیائے خورد ونوش میں خودکفیل ہوتے ہوئے اپنی مسلح افواج کو اسلحہ کی وافر فراہمی یقینی بنائے۔اِس مقصد کے حصول کے لیے زراعت اور اسلحہ سازی ودفاعی بجٹ میں خطیر رقم خرچ کی جاتی تھی۔جس کے بعد دیگر سرمایہ کاری کے لیے کوئی بھی رقم باقی نہ بچتی تھی اور نہ ہی مجموعی بچت کا رجحان قائم ہوسکتا تھا۔

فسطائی نظام کی ہیبت اور جلال کے قیام کے لیے موسولینی اپنے بھرپور بیانات دے رہا

تھا۔ کبھی حبشہ، سپین، بحیرہ روم اور برنیر پر فوجی، فضائی اور بحری حملوں اور فوجی طاقت کے مظاہرے کا مقصد صرف اور صرف دنیا پر اپنی ہیبت اور جلال کا قائم کرنا اور اپنے دھڑے کو مضبوط اور منظم ظاہر کرنا تھا۔ تاکہ تیسری دنیا کے زیادہ سے زیادہ ممالک کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے وسیع تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔

☆☆☆

1920ء تا 1930ء کے عشرے میں جاپان ایک بڑی قوت کے روپ میں ابھر کر سامنے آیا تھا۔ جاپانی اقتصادی ترقی، بحری، فضائی اور فوجی پیش قدمی اور حیرت انگیز ترقی نے برطانیہ جیسے طاقتور ملک کو بھی اس کی مخالفت کے رویے سے گریز کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جاپان کی افواج لڑ مرنے کے جذبے سے سرشار اور جرأت مند تھیں۔ جدید فوجی جانباز جنگی تکنیک سے مرصع وواقف اور قدیم شجاعت سے لبریز تھے۔

لیگ آف نیشنز کے شائع کردہ "ورلڈ اکانومک سروے" کے مطابق جنگِ عظیم کے دوران جاپان کی صنعتی پیداوار پوری دنیا میں سب سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اِس کے قرضے ادا ہو چکے تھے۔ اور وہاں جہاز سازی، طیارہ سازی، کیمیا اور بجلی کی صنعت کو دوام حاصل ہو چکا تھا۔ حالانکہ جاپانی مصنوعات کی پیداواری لاگت پورے یورپ کے ممالک سے کہیں زیادہ تھی۔

زراعت میں جاپان کا انحصار چھوٹے چھوٹے کھیتوں پر تھا۔ جس کے باعث ملکی زرعی اجناس ضرورت پوری کرنے سے قاصر تھیں۔ اسے زرعی اجناس تائیوان اور کوریا سے بھاری قیمت پر درآمد کرنی پڑتی تھیں۔ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں جاپانی کی صنعت وتجارت نے خوب ترقی کی اور مشرقی ایشیاء کی منڈیوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا۔

جاپانی فوج کی کارکردگی نہایت اعلیٰ ہونے کے باوجود اس ملک میں باہمی منافرت، فوجی اور سول جھگڑوں، بری اور بحری رابطوں میں کمی اور چار (4) مختلف محاذوں پر جنگ کے خطرے نے جاپان کی طاقت کو کمزور کر کے رکھ دیا تھا۔ چین کے علاقے منچوریہ کی جنگ نے فوجی لحاظ سے بہت زیادہ مصروف کر دیا تھا۔ سمندروں میں برطانیہ اور امریکہ اُس کے مدِ مقابل تھے۔ جبکہ روس کے ساتھ اس کے تنازعات شدت اختیار کر رہے تھے۔

چین میں جاپانی اقدامات پر امریکہ سخت مخالفت کر رہا تھا۔ ادھر جاپان کے پاس غیر ملکی کرنسی ختم ہو چکی تھی اور پیٹرول کی خرید کے لیے سرمایہ موجود نہ ہونے کے باعث ملک بحران کا شکار ہو چکا تھا۔ تیل کے حصول کے لیے چین کی مہم میں تیزی پیدا کی گئی تاکہ جنوب مشرقی ایشیا، ولندیزی شرق الہند اور بورنیو کے تیل کے ذخائر تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ اِس مہم کے باعث امریکہ سے تضاد اور دشمنی کا سلسلہ پیدا ہو گیا۔

☆☆☆

جنگِ عظیم کے اختتام پر جرمنی کی صورتِ حال انتہائی ناگفتہ بہ اور ابتر ہو چکی تھی۔ اس کی سرحدیں سکڑ چکی تھیں۔ صنعتی علاقوں پر فرانس قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ تاوانِ جنگ کی بہت بڑی رقم کی ادائیگی الگ دردِ سر اور عذابِ جان بنی ہوئی تھی۔ اندرونِ ملک افراطِ زر، سیاسی عدمِ استحکام اور معاشرتی کشیدگی جرمنی کو اقتصادی، معاشی اور سیاسی دلدل میں کھینچ رہے تھے۔

جرمنی کو صلح نامہ ورسلز کے بعد اپنے خارجہ امور میں دیگر اہم ممالک کی طرح آزادی بھی میسر نہ تھی۔ جبکہ فرانس مسلسل جرمنی پر اپنی قوت و اثر و رسوخ کا اظہار کر رہا تھا اور مسلسل اپنی قوت میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں تاوانِ جنگ کا مسئلہ کسی قدر حل ہو گیا اور جرمنی نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔ 1929ء سے 1933ء تک کے سیاسی، مالیاتی اور تجارتی بحرانوں نے جرمنی کی ترقی کی رفتار میں بہت کمی کی۔

ہٹلر کے اقدامات نے تھوڑے ہی عرصے میں جرمنی کی صورتِ حال تبدیل کر کے رکھ دی۔ یہ حقیقت تاریخی ہے کہ ہر جرمن تبدیلی کا خواہاں تھا۔ اسی لیے نازی خارجہ پالیسی دراصل جرمن قوم پرست اور کچلے ہوئے فوجیوں کے جذبات کی عکاسی کرتی تھی۔ اس کے مطابق بڑی طاقتوں کی پرواہ کیے بغیر ملک میں اقتصادی نظام کو ملکی مفادات اور توسیع کے لیے متحرک کرنے کا جذبہ اور جرمنی کو ایک سوشلسٹ ملک کی حیثیت سے منظم کرنا شامل تھا۔

جرمنی میں ایک ایسا رجحان نمو پا رہا تھا جو سراسر جنگ و جدل اور نصرت و کامیابی کا خواہاں اور دلدادہ تھا۔ 1938ء میں سرکاری اخراجات کا 52 فیصد اور مجموعی قومی پیداوار کا 17 فیصد اسلحہ سازی کے لیے وقف تھا۔ یہ اسلحہ سازی کا عمل قومی اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن

گیا اور ملک معاشی لحاظ سے کمزور ہو گیا۔

فوجی لحاظ سے بھی جرمنی نے معاہدہ ورسلز کے خلاف اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کر لیا تھا۔ جبری بھرتی پھر سے متعارف کرائی تھی۔ اور بحریہ اور فضائیہ کو جدید سطحوں پر استوار کیا جانے لگا تھا۔ دفاعی اور پیداواری اخراجات کے تناسب میں واضح فرق نے ملکی معیشت کو سخت دھچکا پہنچایا تھا۔ ہٹلر کے پروگرام کے مطابق ملک بھر میں سڑکیں تعمیر کی جا رہی تھیں، بجلی ہر گھر اور شہر میں دستیاب تھی۔ اور ملک بھر میں صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جا رہا تھا۔

مگر یہ تمام تر اقدامات اسلحے کی بھاری مقدار میں خریداری کے باعث اقتصادی و معاشی استحکام کے حصول میں ناکام رہے تھے۔ پھر ہر دفاعی شعبے کے بڑھتے ہوئے مطالبات، زیادہ سے زیادہ افرادی قوت، فولات، پٹرولیم اور دیگر فوجی ساز و سامان کے حصول کی کوششیں ملکی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی تھیں۔

ہٹلر کی جہاندیدہ نگاہ اپنے ملکی معاشی و اقتصادی مسائل کا حل علاقائی توسیع کے ذریعے حل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ آسٹریا پر قبضہ کرنے سے اسے اس قسم کی معاشی و اقتصادی کمک کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ پولینڈ پر قبضہ کر کے خام مال، کرنسی، زرِ مبادلہ اور وہاں کی افرادی قوت وصنعت پر قابض ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ اس معمولی اور چھوٹی جھڑپ پر اتحادی اِس قدر برآنگیختگی کا اظہار ہرگز نہ کریں گے۔

☆☆☆

فرانس جنگِ عظیم کے بعد اپنے اتحادیوں سے کسی قدر دور ضرور ہو گیا تھا مگر برطانیہ، امریکہ اور فرانس بہر حال جرمنی کے منطقی انجام کے حوالے سے ایک دوسرے سے متفق اور متحد تھے۔ تاہم اِن ممالک کی اپنی اپنی جغرافیائی، دفاعی اور سیاسی ضروریات جرمنی کے معاملے میں جزئیات پر اختلافِ رائے کا سبب بنی تھیں۔

فرانس جنگِ عظیم کی عظیم تباہی کے باوجود براعظم یورپ کا روس کے بعد دوسرا بڑی فوج ، فضائیہ رکھنے والا ملک تھا جبکہ سونے کے وسیع ترین ذخائر کے باعث معاشی استحکام میں برطانیہ کا ہم عصر تھا۔ اِس کی کرنسی ملکی معیشت سے متاثر ہو کر اپنی قدر کم ہی کھوتی تھی۔ کیونکہ اِس کی بنیاد سونے کے محفوظ ذخائر تھے۔

فرانس امریکہ اور برطانیہ کی طرح جمہوریت اور آزاد سرمایہ داری کا علم بردار تھا۔ فرانس کی عوام جنگ سے شدید بے زار اور حکومت کے خارجی معاملات میں دلچسپی لینے کی بجائے داخلی اور ملکی معاملات کے حل کے خواہاں تھے۔ بین الاقوامی مجلسِ اقوام (لیگ آف نیشنز) کے قیام کے بعد یورپ کے اندر برطانیہ اور امریکہ کی وقتی عدم دلچسپی کے باعث فرانس ہی سفارتی اور بین الاقوامی معاملات کے اُفق پر کچھ عرصہ چھایا رہا۔

ملک میں صنعتی ترقی کے لیے بھرپور کوششیں کی گئیں۔ جن کے نتیجے میں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے آخر تک فرانس یورپ کی صفِ اول کی اقتصادی و معاشی قوت بن گیا۔ تاہم اس کے بعد اہم ممالک میں طلائی بحران کے سبب فرانس پر بھی اِس کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اور اس کے سونے کے ذخائر میں کمی ہونے لگی۔

1936ء تک تو فرانسیسی فرینک کی قدر میں بہت زیادہ تخفیف ہو چکی تھی اور ملکی محفوظ سونے کے ذخائر کی اچھی خاصی مقدار ملک سے نکل چکی تھی۔ اِس صورتِ حال نے فرانس کی بہتر اقتصادی حالت کو تشویش ناک حد تک کمزور کر دیا تھا۔ اور ملک معاشی ابتری کا شکار ہو گیا۔ یہی معاشی بدحالی ملک کی فوجی قوت اور دفاعی و فوجی زبوں حالی کا سبب بنی۔

اِس طرح اگلی جنگِ عظیم کے پس منظر کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات پتہ چلتی ہے کہ فرانس جنگِ عظیم کی زبوں حالی، اقتصادی بحران، افراطِ زر، تخفیفِ کرنسی، شکست خوردگی، مسلسل جنگ کے باعث عوامی بے چینی، فوجی اور سول آفیسران کے تضادات اور ایک بار پھر جنگ کے خدشات و بڑھتے ہوئے دفاعی اخراجات کے باعث نہایت کمزور، نحیف اور لاغر ملک کی حیثیت کو پہنچ چکا تھا۔ اب اُس کی وہ شان، ملی یکجہتی اور قومی جذبہ حب الوطنی سب کچھ ہی بہت کم ہو چکا تھا۔

اب اس نئی صورتِ حال میں فرانس کے پاس ایک ہی راستہ بچتا تھا۔ جنگِ عظیم کی طرح کہ جس میں وہ عظیم جرمنی کے خلاف روس کو کھڑا کر کے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں تھا بالکل اسی طرح اب کی بار جرمنی سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں اُس کی تمام تر امید برطانیہ اور امریکہ سے وابستہ تھی۔ وہ انہی ممالک کی امداد اور اعانت کے حصول کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے کے لیے تیار تھا۔

☆☆☆

برطانیہ جنگِ عظیم کے بعد بھی عالمی قوت کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس کی حالت دو عشرے قبل جیسی ہرگز نہ رہ گئی تھی۔ ملکی صنعت و تجارت میں فروغ اور جدید اسلحہ سے لیس فوج و بحریہ کے باوجود برطانوی عوام جنگِ عظیم کے اثرات سے نکل نہ پائے تھے۔ اور وہ جنگ سے بری طرح خائف تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ نے داخلی محاذ پر بھرپور توجہ مبذول کر دی تھی۔ دوسری جانب جرمنی سے تاوانِ جنگ اور صلح نامے کے معاہدے پر عمل درآمد کے سلسلے میں برطانیہ اور فرانس میں سخت سیاسی کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ اور جنگ کے خاتمے کے 5 سال بعد اہلِ برطانیہ فرانس اور جرمنی کے معاملات سے بہت حد تک بے نیاز بھی ہو چکے تھے۔

مگر برطانیہ بہرحال دنیا بھر میں اپنے مفادات پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اِس کے اہلِ دانش ہمیشہ کی طرح ''لڑاؤ اور فتح کرو'' کے کلیے پر عمل پیرا تھے۔ وہ براعظم میں جہاں جرمنی کا فروغ اور استحکام اپنی سیاسی، خارجی اور سفارتی بالادستی میں رکاوٹ کی طرح محسوس کرتے تھے ویسے ہی فرانس کو بھی اِس قابل نہیں دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ ایک طاقت ور ملک کی حیثیت سے ابھر کر مزاحم ہو جائے اور برطانوی مفادات کے لیے خطرہ بن جائے۔

اِس سوچ کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ فرانس اور برطانیہ کے بیشتر معاملات میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے اور دونوں ممالک ایک دوسرے پر بھرپور تنقید کرنے لگے تھے۔ یہ وہی وقت تھا جب اِس کثیر قطبی دنیا میں ایک طرف اٹلی میں فسطائیت اپنے قدم گاڑھ رہی تھی، روس میں سوشلزم اور بالشویکی نظریات کے نتیجے میں بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی اور اب روس براعظم کی بڑی قوت کی حیثیت سے نظر آ رہا تھا۔ جاپان اپنے سیاسی رجحانات اور اقتصادی بہتری کے سفر میں بہت بہتر حالت میں تھا اور جرمنی میں ہٹلر گرتے ہوئے جرمنی کو ''عظیم جرمنی'' بنانے کے لیے اقدامات کر رہا تھا۔

جمہوریت اور آزاد سرمایہ دارانہ نظام پسند کرنے والے ممالک کے لیے یہ لمحات بہت فکر اور پریشانی کے تھے۔ ایک طرف تو برطانیہ فرانس کے سیاسی زعما سے نالاں تھا۔ مگر دوسری جانب حالات انہیں مشترکہ فکری و نظریاتی نظام اور مفادات کے لیے متحد کر رہے تھے۔ لٰہذا برطانیہ اور فرانس ایک دوسرے سے سیاسی تناؤ اور کشیدگی کے باوجود فوجی اتحاد کرنے پر مجبور تھے۔

30 کے عشرے کے آخر میں برطانیہ اقتصادی، معاشی اور سیاسی بحرانوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اسے ایک طرف تو روس کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ڈر تھا، جاپان کے بحریہ سے الجھ جانے کا خوف، ہٹلر کے بڑھتے ہوئے فضائی، بحری اور بری اثر ورسوخ، اٹلی کی فسطائیت کے چیلنجز سب ہی انتہائی مصالحانہ، مغافقانہ اور محتاط روی پر مجبور کر رہے تھے۔ اب برطانوی جرنیل جنگِ عظیم اول کے بعد سے انتہائی محتاط اور کس قدر ڈرپوک بھی ہو چکے تھے۔ جبکہ زیرِ اثر چند ریاستوں نے خارجی خود مختاری حاصل کر لی تھی اور وہ یورپ کے اندرونی معاملات میں مداخلت پسند نہیں کرتی تھیں۔

☆☆☆

جنگِ عظیم نے روس پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ پہلے ملکی معیشت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ پھر ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اور شکست کے نتیجے میں بہت سے علاقے اور آبادی چھن گئی۔ جنگ کے دوران نظامِ رسل وترسیل وذرائع نقل وحمل ورسد وکمک بری طرح تباہ وبرباد ہو چکے تھے۔ بس یہیں موقوف نہیں بلکہ بعد از جنگ خانہ جنگی، انقلاب اور قتل وغارت گری سب ہی کچھ تو مجموعی طور پر اس ملک کی تباہ حالی کا موجب تھا۔

تاہم 20 کی دھائی کے دوسرے نصف میں سوویت یونین کی حکومت نے معاشی و اقتصادی ترقی کے لیے ضروری اقدامات کیے جس سے ملکی معیشت میں بہتری کے آثار نظر آنے لگے۔ تاہم معاشی ترقی کی رفتا بہت سست تھی۔ اِس سستی کی وجہ یہ تھی ملک صنعتی ترقی کی جانب تو گامزن تھا مسلسل زرعی تنزلی کا شکار ہو رہا تھا۔ کیونکہ زمین داری کے خاتمے اور اجتماعی کھیتی باڑی کے نظام کے خلاف زمینداروں نے بھرپور احتجاج کیا تھا۔ اسی زرعی قلت کے باعث 1933ء میں روس میں قحط سالی کے باعث لاکھوں افراد لقمۂ اجل بنے۔

دوسری جانب ملک میں اقتصادی اور فوجی لحاظ سے ترقی کا سفر شروع ہو گیا۔ روسی حکومت نے اپنے حکومتی اخراجات میں شدید کمی کر دی اور صنعتی ترقی، تعلیم وصحت اور دیگر ضروری امور پر اخراجات کرنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ چھوٹے چھوٹے صنعتی یونٹوں سے بڑے بڑے فوجی ہتھیار بنانے کا کام لیا جانے لگا۔ اور معاشی ترقی کے لیے ہر ممکن وسائل کو بروئے کار لایا جانے لگا تھا۔

1928ء سے 1937ء تک کے عرصے میں روس کی معاشی ترقی، فی کس آمدنی اور

مجموعی قومی آمدنی میں دوگنا اضافہ ہوگیا تھا۔ اِس ملک کی اِس دور کی ترقی کی اپنی نظیر آپ تھی۔ روسی حکومت کے یہ تمام اقدامات جمہوریت اور آزادانہ سرمایہ داری پسند عناصر کی آنکھوں میں مسلسل کھٹک رہے تھے۔ اور وہ اِس ملک کی ترقی سے سخت خائف تھے۔

آج بھی یورپی اور امریکی مصنفوں کی تحریروں کے مطالعے سے تعصب، تنگ نظری اور حقائق سے چشم پوشی کا رجحان واضح نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ فسطائیت، جرمن نازی سوشلزم سے کہیں زیادہ خطرناک روسی کمیونزم اور سوشلسٹ اصلاحات کو سمجھتے تھے۔ اور اسی وجہ سے چاہتے تھے کہ ہٹلر روسی استعمار سے ٹکرا جائے اور از خود دونوں دشمن تباہ و برباد ہو جائیں۔

☆☆☆

جنگِ عظیم کے دوران جاپان کے بعد امریکہ ہی ایسا ملک تھا جس نے بھرپور فائدہ اُٹھایا تھا۔ ہمہ قسم کی مصنوعات کی پیداوار وہاں ہو رہی تھی۔ پوری دنیا میں معاشی اور اقتصادی لحاظ سے امریکہ سب سے بہترین مقام پر فائز تھا۔ پھر بیرونی سرمایہ کاری کے باعث سود در سود قرضوں نے بھی ملکی دولت اور بیرونی سرمایہ کاری کو فروغ دیا تھا۔

مگر یہ امرِ واقع ہے کہ امریکہ جنگِ عظیم کے بعد فوجی نقطۂ نظر سے کسی بڑی قوت کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ طاقت ور نہیں رہ گیا تھا۔ اِس کی باقاعدہ فوج کی تعداد جنگ کے فوراً بعد گھٹا کر 1,40,000 کر دی گئی تھی۔ تاہم امریکی حکام نے اپنی جغرافیائی پوزیشن کے تحت بری فوج کی بجائے فضائی اور بحری فوجی ترقی، اسلحہ کی جدت، ائیر کرافٹ کیریئر پر بھرپور توجہ مبذول کر دی تھی اور اِن شعبوں کو مثالی بنانے کے لیے عملی اقدامات کیے تھے۔

امریکی حکام آزاد منڈیوں کے علمبردار تھے۔ وہ جمہوریت پسند اور آزادنہ سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے کوشاں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یورپ اور ایشیائی ممالک میں ہونے والی سیاسی، نظریاتی اور معاشی تبدیلیوں کا بڑی باریکی سے جائزہ لیتے ہوئے ان کے خلاف سخت مزاحمت کھڑی کرنے اور انہیں اپنے آزاد منڈیوں کے نظام میں جکڑ کر اپنے مفادات کے حصول کے لیے پابند کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کر رہے تھے۔

روسی بالشویکی انقلاب نے روس کو خطرناک بنا دیا تھا۔ وسطی یورپ میں ہٹلر جرمن قوم کو لے کر ایک بار پھر دنیا کی تسخیر کے لیے پر تول رہا تھا۔ فاشزم کے علمبردار موسولینی نے دنیا بھر میں

فاشزم کے پرچار اور پھیلاؤ کے عزم کا اعادہ کر رکھا تھا۔ جاپانی اپنی اقتصادی ترقی، فضائی اور بحری قوت سے سمندروں میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مفادات کے لیے خطرے کا باعث بن رہا تھا۔ یہ تمام خطرات صرف وقتی مفادات کو نقصان نہ پہنچا سکتے تھے بلکہ آزاد منڈیوں کی سوچ کے منافی اقدار کو فروغ دینے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

ایسی صورتِ حال میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ اِن تمام قوتوں کو آپس میں لڑا کر ادھ موا کر دیں اور پھر خود ان نیم بسمل ممالک کی معاشی، اقتصادی، سیاسی اور فکری بیخ کنی میں مصروف ہو جائیں۔ اِس سلسلے میں برطانیہ اور امریکہ کی خفیہ گٹھ جوڑ بھی ہو چکی تھی جس میں جاپان اور جرمنی سے روس کی کمر توڑنے کا کام لیے جانے کے بعد اِن سے انتہائی سخت رویہ روا رکھنے کے فیصلے کیے گئے تھے۔

ان ممالک کے سربراہوں نے اپنے تقاریر میں اِس عزم کا اعادہ بھی کیا کہ وہ آمرانہ ریاستوں کے ساتھ امتیازی رویہ روا رکھیں گے۔ اِس کے بعد دونوں جموریت اور آزاد سرمایہ داری پسند ممالک نے اپنے دفاعی اور فوجی اخراجات میں بے تحاشا اضافہ کر دیا اور دھڑا دھڑ اسلحہ سازی اور جدت کے مراحل طے ہونے لگے۔ اب دنیا ایک اور جنگ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور افق پر انسانی خون کی ایک اور ہولناک ہولی کھیلے جانے کے آثار نمایاں تھے۔

14

آزادی کی تحریکیں اور آزادی

جنگِ عظیم نے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے برطانوی، فرانسیسی، اطالوی، بیلجیائی اور امریکی نوآبادیات اور راجدھانیوں میں غلامانہ زندگی کے خلاف آوازیں بلند کرنے کے لیے مناسب حالات پیدا کردیے تھے۔ ان ممالک کی اقتصادی، معاشی، سیاسی اور فوجی کمزوریوں نے اُن کی ظالمانہ اور منافقانہ پالیسیوں کے خلاف عوامی آواز کو مؤثر بنانے میں مدد دی۔

اِس طرح مقبوضہ ممالک کے عوام میں بیداری، حقِ خوداختیاری و اظہارِ رائے کا شعور بیدار ہوا جبکہ غلامی کے طوق کو گلے سے نکال پھینکنے کے لیے پرعزم و پرہمت جدوجہد و کاوشوں کا وسیع پیمانے پر سلسلہ شروع ہوا۔ برصغیر پاک وہند پر بھی عالمی جنگِ عظیم کے اثرات مرتب ہوئے۔

خصوصاً اِس جنگ کے خاتمے پر یہاں کے باشندوں کی دو اہم سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگریس میں اتحاد اور اتفاق کی فضاء قائم ہوئی اور دونوں سیاسی جماعتوں نے باہمی مفاہمت و مشاورت اور مشترکہ کاوشوں کے ذریعے برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی سب سے پہلی کرن 1916ء میں معاہدہ لکھنؤ کی صورت میں منظرِ عام پر آئی۔

بعدازاں اپریل 1919ء کو جلیانوالہ باغ کے عظیم سانحے نے ہندوستان بھر کے عوام کو برطانوی ظلم وتشدد سے بھرپور استعمار کے خلاف بڑی تعداد میں صف آراء کردیا۔ اِس کے بعد تحریکِ خلافت برطانوی غلامی کے خلاف نفرت وتنفر کے جذبات بو رہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے قیام کے لیے بھی کوششیں اپنے عروج پر تھیں۔ اور تجاویزِ دہلی اِس سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

تاہم ہندو مسلم اتحاد ایک ناممکن تصور کی حیثیت سے ابھر کر اکابرین کے سامنے آتا رہا۔ مگر ایک بات پر سب ہی متفق تھے اور وہ یہ تھی کہ انگریز کی غلامی سے ہر ممکن طریقے سے جان چھڑائی جائے۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے اپنی اپنی سطح پر تمام سیاسی جماعتیں کوشاں رہیں۔ گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ بھی دراصل انگریز کی پرانی چالبازانہ پالیسی اور منافقانہ حکمتِ عملی کا حصہ تھا۔ جس کے تحت لاحاصل، طویل اور بنیادی مطالبوں سے چشم پوشی کا رویہ اختیار کیا گیا۔

بڑھتے ہوئے عوامی مطالبے اور آئے روز کی سول نافرمانیوں نے انگریز حکام کو یہ باور کروادیا تھا کہ یہاں کے عوام انہیں برصغیر پاک وہند سے نکال کر ہی دم لیں گے۔ اِس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انہوں نے متعدد بار ہندو مسلم فسادات کروانے کے لیے جال بنے اور حکومت سازی میں کانگریس کو شریک کر کے اُسے کے ذریعے مسلمانوں کا بری طرح استحصال کیا۔ اِن تمام اقدامات کا مقصد برصغیر پاک وہند کے عوام کو ایک دوسرے سے متنفر کر کے آزادی کی منازل سے دُور کرنا تھا۔

مگر چالباز انگریز یہ نہ سمجھ سکا تھا کہ "مومن ایک ہی بل سے دوبار ڈسا نہیں جاسکتا" اُس کی چالیں اور منافقانہ پالیسیاں بہر حال متعدد بار کارگر ہوجانے کے باوجود آخر کار انجام بر شکستِ فاش ہوئیں اور اُسے ہندوستان کے عوام کو ان کی مرضی کے مطابق اپنے اپنے آزاد اور خودمختار ریاستوں کی شکل میں وجود کے قیام کا مطالبہ تسلیم کرتے ہی بنی۔

اسی طرح کی صورتِ حال انڈونیشیا، تیونس، مراکش، مشرقِ وسطیٰ، الجزائر اور ترکی کے مقبوضہ علاقوں کی تھی۔ جہاں فرانس، اٹلی، برطانیہ اور یونانی استعمار کے خلاف عوام الناس نے اپنی بھرپور جدوجہد کا آغاز کردیا اور ان ممالک کی حکومتوں کو مجبور کردیا کہ وہ اپنی توسیع پسندانہ، ظالمانہ، حاکمانہ اور آمرانہ حکمتِ عملی کے برخلاف عوامی بیداری کے حضور اپنا سر، نگوں کرتے ہوئے اُن

کے مطالبات کو تسلیم کریں۔

اِس طرح جنگِ عظیم نے عالمی منظر نامے پر بہت سے اہم امور انجام دیے جن میں عوامی بیداری اور آزادی و خود مختاری کی تحاریک کا مؤثر اور بامقصد ہوتے ہوئے اک نئی روح و جذبے کے تحت انگریزوں کو اپنے اپنے ممالک سے نکال باہر کرنے کے عزم و حوصلے کی بیداری، عوام و خواص کے آزادی کی نعمت سے آشنائی اور اِس کی اہمیت کے لیے جان کی بازی تک لگا دینے کی ہمت و جرأت کی نمو جیسے امور شامل ہیں۔
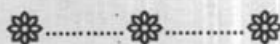
15

جنگِ عظیم اوّل اور حالاتِ حاضرہ

جس طرح موسموں میں تغیر اور موجوں میں سکون و تلاطم ہے، ایک شخص کی پیدائش سے نوجوانی، جوانی، ادھیڑ عمری، بڑھاپا، خوشی اور غمی، قوت اور کمزوری، بہار اور خزاں۔ غرض سب ہی رنگ مل کر زندگی بناتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دنیا میں ازل سے قوموں اور طبقوں کی حرکت ایک طرح سے دوری گردش کا شکار ہے۔ جس کی تاریخ عالم گواہ ہے۔ اِس گردش میں تمام قومیں، ممالک اور طبقے آتے ہیں۔ اور اپنے اپنے دور کے مطابق گردشِ ایام سے گزرتے ہوئے اپنے انجامِ کار کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

کبھی ایک قوم عروج کے منصب پُر وقار پر فائز ہوتی ہے تو دوسری ذلت و غلامی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ کہیں شادیانے بجتے ہیں اور کہیں صفِ ماتم بچھتی ہے۔ مگر ہمیشہ ایک ہی قوم غالب، فائق اور مقامِ تفوق پر براجماں نہیں رہتی۔ اگلے ہی دور میں اُس کی قوت، زور، پھیلاؤ، بہار، حسن و رعنائی اور ترقی کے پایہ ثبات میں لغزش آتی ہے۔ ضعف اور ناتوانی، کمزوری و کم مائیگی اُس پر چھانے لگتے ہیں اور وہ مرجھانے لگتی ہے۔ اُس کی ترقی و ایجادات، تحقیق و ذرائع ہی اُس

کے زوال کے اسباب پیدا کر دیتے ہیں۔ اور آخر کار اُس کا بحیثیت عالمی قوت و طاقت مقام ختم ہو جاتا ہے۔ وہ قوم یا تو صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا پھر ناتواں اور نحیف اقوامِ عالم کی طرح پردہ عمل سے غائب ہو جاتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب بھی ایک ایسے ہی صفحۂ تاریخ کے حالات و واقعات کے بارے میں ایسے وقت میں تحریر کی گئی ہے جبکہ تاریخ عالم میں ایک بار پھر ایک تبدیلیِ امامت اور گردشِ دوراں کے عروج سے زوال کی جانب سفر کے باب کا آغاز ہو چکا ہے۔ عالمی منظر نامے میں تبدیلی کے واضح آثار تاریخ کے طلباء کے مطالعے اور مشاہدے کے لیے اپنے تمام تر جواہر و مظاہر کے ساتھ عالمِ شہود و وجود پر جلوہ گر ہو چکے ہیں۔ کاتبِ تقدیر کا قلم اپنے فیصلے محفوظ کر چکا ہے۔ اور اب گردشِ دوراں کے چکر کی تبدیلی اپنا فیصلہ سنانے والی ہے۔

جنگِ عظیم اوّل کو ایک صدی ہونے کو ہے۔ اِس دوران دنیا کے جغرافیائی، نظریاتی، سیاسی اور معاشی نقشوں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ جنگِ عظیم اوّل و دوئم کی نسبت خطرناک ترین ہتھیار بھی معرضِ وجود میں آ چکے ہیں۔ ایٹم بم کی ایجاد، ہائیڈروجن بم کی ایجاد کے لیے تحقیق اور بین البرِ اعظمی مار کرنے والے طاقتور اور وسیع پیمانے پر گولہ بارود لے جانے والے میزائلوں کی ایجاد نے جنگ کے اندازِ حرب و ضرب میں یکسر تبدیلی رونما کر دی ہے۔

بڑے بڑے ایئر کرافٹ کیریئرز اور سمندروں کی سطح پر چلتے پھرتے بڑے بڑے شہروں کی مانند بحری بیڑے پوری دنیا کے کسی بھی سمندری اور خشکی کے حصے میں رسائی اختیار کر سکتے ہیں۔ اب جنگ لڑنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ متحارب ممالک کی سرحدیں باہم ملتی ہوں۔ بلکہ سات سمندر پار سے اپنے بحری بیڑوں، طاقتور اور دور مار میزائلوں اور کمپیوٹرائزڈ ریموٹ کنٹرول جہازوں و بموں کے ذریعے دنیا بھر کے کسی بھی ملک پر کسی بھی مقام سے حملہ آور ہونا پہلے کی نسبت بہت زیادہ آسان اور سہل اِس سے قبل کبھی بھی نہیں تھا۔ صرف متذکرہ بالا ذرائع کی موجودگی بہرحال شرط ہے۔

دوسری طرف طرزِ جنگ میں بھی جدت آ گئی ہے۔ بڑی بڑی افواج کی بجائے نئی طرز

کے زرہ بکتر پہنے، اپنے ہیڈ کوارٹر سے مسلسل مربوط، جدید تباہ کن گنز، لیزر و دیگر خطرناک تکنیکی ہتھیاروں سے آراستہ مختصر مگر انتہائی مضبوط و طاقت ور چھوٹے چھوٹے فوجی دستے جو لمحہ بہ لمحہ کمپیوٹرائزڈ سسٹم کے تحت ایک ایک انچ اور ایک ایک زاویے سے مکمل واقفیت رکھتے ہوئے اعلیٰ حکام سے مسلسل ہدایات حاصل کرتے ہوئے دشمن کو نیست و نابود کر دینا اور اِس مقصد کے لیے فضائی، میزائلی اور سمندری ہتھیاروں اور مشینوں کا وسیع پیمانے پر استعمال کرنا شامل ہیں۔

پھر جنگ صرف افواج و اسلحہ کی نہیں رہ گئی۔ بڑی بڑی قوتیں اِس امر سے بھی بخوبی واقفیت رکھتی ہیں کہ اب کوئی بھی جنگ انسانی تباہی کے اُس خطرناک درجے تک لرزہ خیز ہو سکتی ہے جس کے بعد شاید صفحۂ ہستی کی یہ بساط ہی بالکل الٹ جائے اور عالمِ وجود میں انسانوں کا وجود ماضی کی تاریخ بن کر رہ جائے۔ اسی لیے اب حربی لڑائی کی جگہ معاشی، معاشرتی اور سیاسی جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور آزاد تجارت کے قیام کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہے کہ اب زیرِ دست قوموں کو اسلحے کی بجائے معاشی دباؤ کے ذریعے دبا کر رکھا جا سکے۔ اُن کی سیاسی انارکی اور انتشار سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہیں ہمیشہ زیرِ دست رہنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اور ایسی ایسی سیاسی و معاشرتی تبدیلیاں اور حکمتِ عملیاں وضع کی جائیں جو عالمی امامت کے منصب پر فائز ممالک کی قیادت و امامت کے قیام و دوام کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

اسی سلسلے کی کڑیاں ہمارے اردگرد مختلف پالیسیوں کا شور و غوغا اکثر و بیشتر بپا رہتا ہے۔ کبھی ''ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن'' (WTO) کے پلیٹ فارم سے نئی ہدایات موصول ہوتی ہیں، کبھی ''نیو ورلڈ آرڈر'' اور کبھی اقوامِ متحدہ کی اصلاحات و پابندیوں کی صورت میں دراصل عالمی قیادت کے گرتے ہوئے نظام کو سہارا دینے کی کوششیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔

تیسری دنیا کے ممالک پر پابندیاں، چھوٹے ممالک کو آئے دِن بڑی طاقتوں کی جانب سے موصول ہونے والی دھمکیاں، معاشی دباؤ، اقتصادی اصلاحات اور بزور مسلط کیے گئے سیاسی نظام بھی دراصل کسی اصلاحی اور فلاحی مقصد کے حصول کے لیے نہیں بلکہ ازمنۂ قدیم سے چلنے

والے عالمی قوتوں کو اعانت فراہم کرنے کے فرسودہ ہتھکنڈوں کی جدید شکل ہیں۔

یہی دورِ حاضر کے متاثر کن ہتھیار اور تباہ کن لوازمِ جنگ ہیں جو بلا شبہ موجودہ عالمی قوتوں کے قائم کردہ ہونے کے باعث صرف اور صرف انہی کے مفادات کے تحفظ کے لیے عمل پیرا ہیں۔ کمزور ممالک اِن لوازمِ جنگ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے بالکل عاری اور عاجز ہونے کے باعث عالمی طاقتوں کی بلیک میلنگ برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ جبکہ عالمی قوتیں معاشی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے آئے روز مضبوط تر ہوتی چلی جارہی ہیں جس کا لازمی اثر اُن کی فوجی حیثیت اور حربی قوت پر بھی پڑتا ہے۔

ثقافتوں کی جنگ، مذہبوں کی جنگ، معیشت کی جنگ، فکری جنگ، سیاسی جنگ اور معاشرتی جنگ؛ اِن سب محاذوں کے لیے انٹرنیٹ، موبائل فون، بڑھتے ہوئے ٹیلی کمیونیکیشن کے ذرائع اور میڈیا دورِ حاضر کی جنگ کے اہم ہتھیار بن چکے ہیں۔ جن کے بغیر کسی جنگ کے مثبت نتائج حاصل کرنے کی توقع کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذرائع بھی موجودہ عالمی قوتوں کے پیدا کردہ اور انہیں کے ہاتھوں کنٹرول ہو رہے ہیں۔

یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عالمی طاقتوں کا عدمِ توازن ہی جنگ اور تباہی کا سب سے بڑا موجب ہوتا ہے۔ بڑی طاقتیں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے اور چھوٹی طاقتیں قیامِ توازن ممکن بنانے کے لیے کوشاں ہوتی ہیں۔ یہی رویہ دونوں گروہوں کو ایک دوسرے کے مخالف کھڑا کر دیتا ہے۔ اور کمزور ممالک خود پر جبر کرتے ہوئے بڑی طاقتوں کے آگے اُس وقت تک خاموشی سادھے رہتے ہیں جب تک معاملات اُن کے صبر واستقامت سے تجاوز نہیں کر جاتے۔ بعد ازاں ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق، نتائج سے کسی قدر بے پرواہ ہو کر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر ہم ایک بار پھر پورے عالم کو اسی کیفیت میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ ایک طرف عالمی قوتیں اپنے جائز وناجائز مطالبات واحکامات منوانے پر تلی ہوئی ہیں۔ جبکہ

دوسری جانب کمزور اور چھوٹے ممالک اپنے کمزور اور ناگفتہ بہ حالات اور عدمِ ترقی، معاشی استحکام کے فقدان اور سیاسی انارکی اور اقتدار کی دوڑ کے باعث بلاچون وچرا تسلیم ورضا کے مراحل طے کرتے اور مزید گڑھے میں گرتے ہی چلے جارہے ہیں۔

یہ صورتِ حال کمزور، چھوٹے اور زیرِ عتاب ممالک کی عوام میں عالمی طاقتوں سے نفرت اور بے زاری کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔ بے زاری بڑھ کر نفرت اور احساسِ عدمِ تحفظ کو پہنچ جانے کے باعث ہر دو طبقوں میں ایک بہت بڑے خلا کا سبب بن چکی ہے۔ جس میں آئے روز کی عالمی طاقتوں کی نئی نئی خواہشوں کی تکمیل مزید دُوری اور فاصلے میں اضافے کا موجب بن رہی ہے۔

اور یہ صورتِ حال کسی نئے قضیے کے شروع ہونے کا باعث و وجہ بن سکتے ہیں۔ جو کسی طور بھی جنگِ عظیم اوّل و دوئم کی تباہ کاریوں اور انسانی قتلِ عام سے کم نہ ہوگا۔ گویا نئی صدی کے آغاز پر ہم ایک بار پھر تباہی کے اسی دہانے پر کھڑے ہیں جہاں ایک صدی قبل یورپی اقوام کھڑی تھیں۔ یہ حالات بہت زیادہ دانشمندی اور صبر و تحمل کے متقاضی ہیں۔ جس کے بغیر عالمی نظام کے قرار و وجود کی بقا قدرے مشکل اور بعض حالات میں ناممکن نظر آتی ہے۔

یہ حالات عالمِ انسانیت کے انتہائی غیر محفوظ اور بے بس ہونے کی طرف شدت سے اشارہ کرتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں کہ جب ان تمام ذرائع کے حامل ممالک کے حکمران طبقے میں جنگ و جدل کا جنون کی حد تک شوق اور وجدان کی حد تک لگن اور طلب کا رویہ بدرجہ اُتم موجود ہو۔ وہ حکمران اپنے خطابات میں ''کروسیڈ'' (صلیبی جنگ) کے آغاز کا کھلے عام اظہار بھی کر چکے ہوں۔ اور اِس کے سلسلے کو آئے روز بڑھاتے بھی جارہے ہوں۔

اِن حالات میں ایک نگاہِ مضطرب کے لیے یہ مناظر لمحۂ فکریہ سے کہیں زیادہ آگے کے مراحل ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ صلیبی جنگ کا نشانہ بننے والی پوری دنیا میں کونسی قوم ہوگی۔ اور صلیبی جنگ کے سلسلہ میں کون کون سے ممالک آئیں گے۔ جن سے آج کی عالمی قوت ہونے کے دعویدار ملک اور اُس کے پرانے اتحادیوں نے مرحلہ بمرحلہ ایک ایک کر کے

نمٹنے کا پروگرام مرتب کر رکھا ہے۔

دورِ حاضر کی واحد سپر پاور کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول سے روکنے کے لیے اقوامِ عالم کا ذمہ دار ادارہ ''اقوامِ متحدہ'' بھی بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ اور موجودہ صورتِ حال میں اُس کی حیثیت ایک غیر فعال، فرسودہ اور بے بس تنظیم کی سی رہ گئی ہے۔ جس کا مقصد بڑی قوتوں کے احکام کی بجا آوری اور اُن کی مرضی کے خلاف کسی قسم کی آواز کو دبانے کے لیے ایک ہتھیار کی طرح استعمال ہوتے رہنا بن گیا ہے۔ آخر کار اس ادارے کو چلانے کے لیے درکار ''فنڈز'' کی فراہمی کا مکمل انحصار انہی ممالک پر ہے جو اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اور سیانے کہتے ہیں کہ ''جس کا کھائیے اسی کے گیت گائیے!''

اکیسویں صدی کی جدید طرزِ جنگ سے قارئین کسی قدر واقفیت یقیناً حاصل کر چکے ہیں۔ افغانستان، عراق اور لبنان کی جنگ اِسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ایک نیا نقشہ چشمِ متحیر کو مزید متحیر کرتا ہے کہ کم و بیش وہی اتحادی ممالک؛ امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، کنیڈا اور دیگر یورپی ممالک کی افواج ایک بار پھر ''اتحادی افواج'' کا عنوان و نام اختیار کیے صرف ''نظریہ سرکوبی ممکنہ خطرہ'' کے تحت کسی بھی ملک کی آزادی و خود مختاری کو سلب کرنے کا خود ساختہ اختیار استعمال کرنے کے درپے ہیں۔ بھلے ہی معتوب ملک کسی بھی ممکنہ خطرے کی قابلیت و گمان ہرگز ہرگز نہ رکھتا ہو۔

بہر حال مستقبل میں ممکنہ صورتِ حال ہماری کتاب کا موضوع نہیں۔ مگر گزشتہ صدی کی جنگِ عظیم اوّل کے آغاز کی سی صورتِ حال بہر حال ہمارے اردگرد موجود ہے۔ اِس بار میدانِ جنگ مختلف، متحارب گروہوں میں سے ایک وہی پرانا گروہ ہے مگر اِس کے مدِ مقابل دوسرا گروہ چاروناچار کھڑا کر دیا گیا ہے۔ یقیناً اِس بار کے نتائج بھی گزشتہ نتائج سے مختلف ہوں گے۔ جنگ ہائے عظیم کی ریت بہت ہی انوکھی رہی ہے جس کے مطابق پہلے پہل فتوحات حاصل کر لینے والے ممالک آخر میں شکست و ریخت سے ہمکنار ہوتے رہے ہیں۔

جنگ کی طوالت، مدِ مقابل کی ثابت قدمی، مستقل مزاجی اور صبر و قربانی آخر کار جارحیت پسند عناصر کو گھٹنے ٹیکنے اور شکست سے ہمکنار کرنے کا باعث بنتے رہے ہیں۔ کیونکہ ہر

جارح یہی سمجھ کر میدانِ عمل میں اترتا ہے کہ اُس کے مدِ مقابل نہایت نحیف ولاغر ہیں جنہیں ایک ہی وار سے تہہِ تیغ کر دینا اُس کی قوت وترقی، فوج اور اسلحے کے لیے ایک حقیری کوشش ہوگی۔

موجودہ مشکل ترین صورتِ حال اور بدلتے ہوئے عالمی منظرنامے میں ملکی وقومی سالمیت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے اردگرد کے حالات کا بغور مشاہدہ کرتے ہوئے انتہائی دانشمندی و حسنِ تدبیر سے اپنے اردگرد بپا ہوئے میدانِ جنگ سے نہ صرف خود کو بلکہ پوری امت کو بچا کر ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے ہر ممکن اقدامات بسطح انفرادی، قومی وملکی وملی بروئے کار لائیں۔اور اِس نازک صورتِ حال سے بخیر وخوبی وسرخروئی عالمِ شہود وجود میں اپنی حیثیت واہمیت برقرار رکھنے کے جملہ انتظامات کریں۔

کتابیات و حوالہ جات

زیرِ نظر کتاب کے لیے مختلف انٹرنیٹ ویب سائٹس اور کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جو قارئین کی دلچسپی اور مزید معلومات کے لیے درج کی جا رہی ہیں:

نمبر شمار	ویب سائٹ ایڈریس / کتب
1۔	http://en.wikipedia.org/wiki/Allies_of_World_War_I
2۔	http://www.spartacus.schoolnet.co.uk/FWWarmies1914.htm
3۔	http://www.spartacus.schoolnet.co.uk/FWWinAustria.htm
4۔	http://www.bbc.co.uk/history/worldwars /wwone/launch_ani_western_front.shtml
5۔	http://www.bbc.co.uk/history/worldwars/wwone/
6۔	http://en.wikipedia.org/wiki/Central_Powers
7۔	http://www.spartacus.schoolnet.co.uk/FWWbattles.htm
8۔	http://www.spartacus.schoolnet.co.uk/FWWoutbreak.htm
9۔	http://www.firstworldwar.com/source/1914.htm
10۔	http://www.britannica.com/eb/article-58197/Germany
11۔	http://en.wikipedia.org/wiki/History_of_Independent_Bulgaria
12۔	http://www.timesearch.info/timesearch/default.asp
13۔	http://www.enotes.com/1910-business-economy-american-decades/important-events-business-economy

http://en.wikipedia.org/wiki/Kingdom_of_Greece	-14
http://en.wikipedia.org/wiki/Kingdom_of_Montenegro	-15
http://en.wikipedia.org/wiki/Kingdom_of_Romania	-16
http://wwi.lib.byu.edu/index.php/Main_Page	-17
http://en.wikipedia.org/wiki/Ottoman_Empire	-18
http://en.wikipedia.org/wiki/Portugal_in_the_Great_War	-19
http://www.fylde.demon.co.uk/welcome.htm	-20
http://en.wikipedia.org/wiki/World_War_I_timeline	-21
http://www.zum.de/whkmla/region/germany/ger19141918.html	-22
http://www.worldwar1.nl/	-23
http://www.worldwar1.co.uk/	-24
http://www.worldwar1.co.uk/pictures.html	-25
http://www.worldwar1.com/	-26
A Concise History of World War I	-27
The Rise and fall of the Great Powers by Paul Kennedy	-28
History of Modern Europe	-29
The Twenty Year's Crises	-30
A New Histroy Of Indo-Pakistan	-31
The Struggle for Pakistan	-32

اشاریہ

﴿ا﴾

﴿ب﴾

﴿پ﴾

〈ت〉

〈ٹ〉

﴿ر﴾

﴿س﴾

﴿ش﴾

﴿غ﴾

﴿ف﴾

﴿ک﴾

﴿گ﴾

﴿ن﴾

﴿و﴾

ہولی گولینڈ

169

ہیٹی

232

ہیگ

138، 3-211، 4-240، 264، 272، 276، 283، 289

فہرست نقشہ جات، جدول و تصاویر

www.KitaboSunnat.com

دارُالشعُور کی دیگر کُتب

37-مزنگ روڈ، بک سٹریٹ، لاہور، پاکستان
فون:042-7239138-8460196